ہمسفر
طاہر جاوید مغل

اللہ سب سے بڑا ہے

نام کتاب ــــ ہمسفر

مصنف ــــ طاہر جاوید مغل

ناشر ــــ علم دوست پبلی کیشنز

مطبع ــــ اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز

قیمت ــــ 160 روپے

ڈسٹری بیوٹرز: دعا پبلی کیشنز

25 سی لوئر مال لاہور

فون 7325418

فہرست

بے خبری

فون کی گھنٹی بجی اور ناخنوں پر پالش لگاتے لگاتے وہ بری طرح چونک گئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور ایک دم اس کے ذہن میں پلنے والے تمام خدشات جوان ہو گئے۔ دوسری طرف ایاز ہی تھا۔

''ہیلو عینی!'' وہ گمبھیر آواز میں بولا ''فون بند مت کرنا کیونکہ اس کا فائدہ کوئی نہیں۔ جب تک میں اپنی بات مکمل نہیں کرلوں گا، فون کرتا رہوں گا اور تم بار بار ڈسٹرب ہوتی رہوگی۔''

''تم اپنی بات مکمل کر چکے ہو اور میں تمہیں فیصلہ کن جواب بھی دے چکی ہوں۔'' عینی جھنجلا کر بولی۔

''تم پرسوں والی بات کا ذکر کر رہی ہو۔ میں آج کی بات کر رہا ہوں۔ آج کی بات مختلف ہے۔''

''کیا آج تمہارے اندر انسانیت بیدار ہوگئی ہے۔ تم نے ماضی کی پاداش میں مجھے بلیک میل کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے؟''

''نہیں، ایسا تو نہیں ہے لیکن میں نے ایڈجسٹمنٹ کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں اس ایڈجسٹمنٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ تم ایک کروڑ پتی صنعت کار کی بیوی ہو۔ 50 لاکھ روپیہ تمہارے لئے معمولی بات تھی۔ بہر حال تمہاری باتوں پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی میں تمہیں رعایت دینے کے لئے آمادہ ہوں۔ اگر تم واقعی چاہتی ہو کہ تمہارا ماضی تمہارے شوہر کی نظروں سے اوجھل رہے تو کل صبح گیارہ بجے تک 35 لاکھ روپے کا انتظام کرلو۔ میں دہرا دیتا ہوں۔ کل صبح گیارہ بجے تک 35 لاکھ روپیہ۔ اس کے ساتھ میں اپنا وعدہ بھی دہرا رہا ہوں۔

جیسے ہی میرے مالی حالات سنبھل گئے، میں تم سے لی ہوئی یہ رقم یکمشت یا قسطوں میں واپس کر دوں گا۔''

عینی تلخ لہجے میں بولی''آخر تم یہ کیوں سمجھے بیٹھے ہو کہ میں تمہارے سامنے گھٹنے ٹیک دوں گی۔ میں نے۔۔۔۔ میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے جس کے لئے مجھے شرمندگی اٹھانا پڑے۔ میرا کردار۔۔۔ میرا کردار صاف ہے''۔

''تمہاری آواز کا کھوکھلا پن خود تمہیں بھی محسوس ہو رہا ہوگا عینی ڈیئر! اپنے کردار کے اچھے یا برے ہونے کے بارے میں کوئی شخص بھی خود فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس کا فیصلہ دنیا کرتی ہے۔ یا وہ لوگ کرتے ہیں جن کی اس حوالے سے اہمیت ہوتی ہے مثلاً تمہارا شوہر اختر زمانی۔۔۔ ہاں اختر زمانی فیصلہ کر سکتا ہے کہ تمہارا کردار صاف تھا یا نہیں! اور مجھے یقین ہے کہ اس کا فیصلہ تمہارے لئے خوشگوار نہیں ہوگا۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ تم میرے ساتھ تفریح گاہوں میں گھومتی رہی ہو، دو دو گھنٹے میرے ساتھ ہوٹل کے فیملی کیبن میں بیٹھی رہی ہو، مجھے محبت نامے لکھتی رہی ہو اور وہ سب کچھ کرتی رہی ہو جو معاملات دل میں اور ایسے حالات میں کیا جاتا ہے تو اس کا ردعمل کچھ اچھا نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اندر سے آگ بگولا ہو جائے گا۔ پھر جونہی تم اسے نظر آؤ گی، وہ شعلہ بن کر تمہاری طرف لپکے گا اور ممکن ہے کہ تمہیں اس قدر دوڑائے کہ تم اس کی زندگی سے نکلنے میں ہی عافیت سمجھو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بڑی عمر کے شوہر جتنے مہربان ہوتے ہیں اتنے ہی سخت دل بھی ہوتے ہیں۔ انہیں شریک حیات کی وفاداری پر شبہ ہو جائے تو زبردست قسم کا انتقام لینے پر تل جاتے ہیں۔''

ایاز کی مسلسل بکواس کو آج ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ عینی اس وقت بری طرح جھنجلا گئی۔ تڑخ کر بولی''مجھے دھمکانے کی کوشش مت کرو ایاز۔۔۔ میں تمہیں ایک پھوٹی کوڑی نہیں دینے والی۔ تم سے جو ہوتا ہے کر لو۔ زیادہ سے زیادہ کیا کرو گے تم؟ میرے چھ سات برس پہلے کے لکھے ہوئے ایک دو خط میرے شوہر کو دکھا دو گے۔۔۔؟ دکھا دو۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ ہاں اور وہ خط بھی دکھا دو جس کا تم مجھے اٹھتے بیٹھتے ڈراوا دیتے ہو۔''

''اچھی طرح سوچ لو عینی! تمہارا ماضی بے نقاب ہو جائے گا۔''

''میرے ماضی میں ایسا کچھ نہیں ہے۔'' وہ حلق کے بل چیخی۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی، پھر ایاز کی ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی''او کے جان! اگر تم ایسا چاہتی ہو تو ایسا ہی سہی۔'' اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

عینی کچھ دیر ریسیور ہاتھ میں تھامے بیٹھی رہی اور کانپتی رہی۔ غم و غصے سے اس کی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ پھر ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔۔۔۔ غصے کی تند و تیز لہر کے بعد اس کے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ بے نام سے اندیشے اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہے تھے اور مستقبل قریب کی شکل اسے بگڑی بگڑی نظر آنے لگی تھی۔ وہ سوچنے لگی اگر واقعی ایاز فون بند کرنے کے بعد اختر زمانی کے پاس اس کے آفس پہنچ گیا تو کیا ہوگا۔ اختر زمانی اس سے بہت محبت کرتا تھا لیکن وہ ایک شوہر کی محبت تھی۔ اس محبت بھرے رشتے کی بنیاد کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ہوتی ہے۔ اس ٹکڑے کو پھاڑ دیا جائے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ وہ اختر زمانی کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔

وہ بے قراری سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی اور دبیز قالین پر ٹہل رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔ پھر اس نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ اس نے الماری سے اپنی چیک بک نکالی اور واپس فون سیٹ کے پاس آ بیٹھی۔ اس کے پاس ایاز کا نمبر موجود تھا۔ اس نے ایاز کو رنگ کیا مگر وہی ہوا جس کا اسے اندیشہ تھا۔ ایاز کے بجائے فون اس کے کسی ملازم نے اٹھایا۔ ملازم نے بتایا کہ صاحب ابھی ابھی گاڑی پر بیٹھ کر نکلے ہیں۔

عینی کے سینے میں دل برف کا گولہ سا بن کر رہ گیا۔ اس کی چھٹی حس پکار پکار کر اعلان کرنے لگی کہ ایاز گاڑی لے کر اس کے شوہر کی طرف گیا ہے۔ یہ بڑی نازک صورت حال تھی۔ اگر عینی کے اندیشے درست تھے تو پھر اس کی ازدواجی زندگی تباہی کے کنارے پر تھی۔ ایک دم جیسے اس کے اندر سے لہری اٹھی۔ اس نے چیک بک اپنے پرس میں ڈالی، پرس کے اندر سے گاڑی کی چابی نکالی اور گیراج کی طرف دوڑی۔

چند ہی لمحے بعد وہ اپنی شیراڈ کار پر تیزی سے اختر زمانی کے آفس کی طرف جا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایاز کو اپنے شوہر تک پہنچنے سے پہلے روک لے۔ جتنی تیز رفتاری سے گاڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی اس سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ عینی کا ذہن سوچ کی شاہراہ پر بھاگ رہا تھا۔ یہ معکوس سفر تھا۔ اس کے ذہن کا رخ ماضی کی طرف تھا۔ چار پانچ سال پہلے کے واقعات اس

کے ذہن میں تازہ ہو رہے تھے۔ عینی اور ایاز ایک دوسرے کو کالج کے زمانے سے چاہتے تھے۔ دونوں خوش حال اور آزاد خیال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ملنے جلنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ گھنٹوں ایک دوسرے کی رفاقت میں رہتے تھے بلکہ ایک مرتبہ تو وہ حیلے بہانے سے ایک اسٹیشن پر بھی اکٹھے وقت گزار چکے تھے۔ ان کے تعلقات دو تین سال تک بخوبی چلتے رہے تھے، پھر بتدریج عینی میں تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی۔۔۔۔ اس کی زندگی میں اختر زمانی داخل ہو گیا۔ اختر زمانی، عینی کے والد مرحوم کے ایک دوست کا بہت لائق فائق اور ذہین بیٹا تھا۔ وہ عینی سے کم از کم چودہ پندرہ سال بڑا تھا اور اس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ عینی اس وقت اسکول گرل تھی جب اختر زمانی اپنی بیوی کے ساتھ امریکا چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے ملازمت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔۔۔۔ ٹیکسٹائل کے کئی اعلیٰ کورسز کیے اور اس شعبے میں نام کمایا۔ امریکا میں قیام کے دوران میں ہی گھریلو جھگڑوں کے سبب اختر زمانی کی اپنی بیوی سے علیٰحدگی ہو گئی تھی۔ بعد ازاں یہ علیٰحدگی طلاق میں بدل گئی۔ اختر زمانی کی صرف ایک ہی بچی تھی جو اس کی بیوی کے پاس ہی رہی۔ اختر زمانی امریکا چھوڑ کر واپس پاکستان آ گیا۔ یہاں اس نے ٹیکسٹائل کا اپنا کام شروع کیا، جو بڑی تیزی سے پھلا پھولا اور دو تین سال کے اندر ہی اختر زمانی کا شمار ملک کے اہم صنعت کاروں میں ہونے لگا۔ کچھ تقریبات میں عینی کی ملاقات اختر زمانی سے ہوئی۔ وہ اب ایک 45 سالہ شخص تھا، پیشانی سے بال اڑ چکے تھے۔ وہ پڑھنے کے لئے عینک لگاتا تھا۔ پھر بھی اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کشش تھی جو عینی کو غیر محسوس طور پر اپنی طرف کھینچنے لگی۔ وہ اس کشش کو کوئی واضح نام نہیں دے سکی۔ کبھی اسے لگتا کہ اختر زمانی سے اس کا تعلق دوستی کے زمرے میں آتا ہے، کبھی وہ محسوس کرتی کہ ایاز چونکہ اب اسے پہلے والی محبت اور توجہ نہیں دیتا لہٰذا وہ بھی اس سے دور ہوتی چلی جا رہی ہے، اور یہ دوری اسے اختر زمانی کے قریب لا رہی ہے۔ بہر حال یہی وقت تھا جب وہ قدم بہ قدم اختر زمانی کے قریب ہوتی چلی گئی اور ایاز سے اس کی چار پانچ سالہ رفاقت دھندلا کر معدوم ہو گئی۔ اختر زمانی نرم خو اور دھیمے مزاج کا شخص تھا۔ اس کی محبت ایک پرسکون ندی جیسی تھی۔ اس کے برعکس ایاز کا پیار اسے تند و تیز کوہی نالے جیسا لگتا تھا۔ کوہی نالا جو ڈھلوانوں سے اترتا ہے تو اچھلتا کودتا اور شور مچاتا لیکن موسم بدلتا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے خشک بھی ہو جاتا ہے۔ بے شک اختر زمانی عمر میں عینی سے کافی بڑا تھا،

مگر اس کی یہ کمی اس کی غیر معمولی خوش حالی پوری کرتی تھی۔ وہ نہایت شاندار زندگی گزار رہا تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ امریکا اور یورپ کے ٹوریوں لگاتا تھا جیسے لاہور میں جنرل اسٹور چلانے والے اکبری منڈی یا شاہ عالمی جاتے ہیں۔

جلد ہی عینی اور اختر زمانی شادی کے بندھن میں بندھ گئے تھے۔ شروع شروع میں عینی کو اندیشہ تھا کہ ایاز کسی شدید ردعمل کا اظہار کرے گا مگر شادی کے بعد جوں جوں دن ہفتے اور مہینے گزرتے گئے، عینی کے اندیشے کم ہوتے گئے۔ قریباً ایک برس گزر گیا اور انہی دنوں عینی سے وہ غلطی ہوئی جو۔۔۔۔ ہرگز نہیں ہونی چاہیے تھی۔ نجانے اس روز عینی کے دل کا موسم کیسا تھا کہ اس نے اپنے پرانے محبوب ایاز کو ایک طویل خط لکھ مارا۔ اس میں پرانی یادوں کو تازہ کیا گیا تھا۔ ان محبت بھرے جذبات کا ذکر تھا جو وہ اب بھی ایاز کے لئے دل میں رکھتی تھی۔ اس خط میں عینی نے بہت سے شکوے بھی کیے تھے۔ ظاہر ہے ان میں سب سے بڑا شکوہ یہی تھا کہ ایاز نے دیگر ''مصروفیات'' میں گم ہو کر عینی کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ بھی اختر زمانی کی طرف مائل ہو گئی وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں اس نے ایاز کو لکھا تھا کہ اب ان دونوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہہ دیں اور ماضی کی یادوں کو ایک قیمتی اثاثے کی طرح اپنے پاس محفوظ کر لیں۔

ایاز کے نام عینی کے اس آخری خط کو اب قریباً دو سال ہو چکے تھے۔ عینی ان معاملات کو اب قریباً قریباً فراموش کر چکی تھی۔۔۔۔ انسان حالات کو فراموش کر دیتا ہے لیکن حالات اکثر انسان کو فراموش نہیں کرتے۔ عینی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اب شادی کے تین سال بعد اچانک ایاز نے عینی سے رابطہ کیا تھا اور اسے بلیک میل کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اس نے بزنس کے سلسلے میں گاہے گاہے عینی کے شوہر اختر زمانی سے بھی ملنا شروع کر دیا تھا اور کبھی کبھی ان کے گھر بھی آنے لگا تھا۔ اس نے پہلے ڈھکے چھپے الفاظ میں عینی کو بتایا تھا کہ وہ دبئی میں اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس سلسلے میں اسے بطور قرض کچھ رقم درکار ہے۔ پھر وہ لگی لپٹی کے بغیر اپنا مطالبہ سامنے لے آیا تھا۔ اس نے عینی سے کہا تھا کہ وہ کسی بھی طرح اس کے لئے پچاس لاکھ روپے کا انتظام کرے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکی تو اس کی ازدواجی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ وہ عینی کے تمام خطوط اختر زمانی کے حوالے کر دے گا

جو عینی نے اسے شادی سے پہلے لکھے تھے اور وہ خط بھی جو شادی کے بعد لکھا تھا۔

۔۔۔یہ تمام خیالات پانچ دس منٹ کے اندر عینی کے ذہن سے گزر گئے۔ اس دوران میں اس کی کار بھی چیئرنگ کراس سے گزر کر فاطمہ جناح روڈ پر آ چکی تھی۔ اس کے شوہر اختر زمانی کا آفس اب صرف ڈیڑھ دو کلومیٹر کی مسافت پر تھا۔ عینی نے خاصی تیز ڈرائیونگ کی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ ایاز سے پہلے اختر زمانی کے آفس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گی ۔۔۔لیکن جونہی وہ جیل روڈ جانے کے لئے پلازا سینما والے چوراہے سے بائیں جانب مڑی، ٹریفک جام کے سبب اسے رکنا پڑا۔ کوئی چھوٹا موٹا ایکسیڈنٹ ہوا تھا لیکن ٹریفک دور تک رکی ہوئی تھی۔ عینی کی جھنجلاہٹ اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ وہ ہارن پر ہارن دیتی رہی لیکن نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ اس ''ٹریفک جام'' سے نکل سکی۔ جس وقت وہ اپنے شوہر کے آفس پہنچی، اسے گھر سے نکلے ہوئے قریباً ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ آفس سے باہر پارکنگ میں ایاز کی سرخ سوزوکی کار دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ غم و غصے کی ایک بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی اور اس کا دل چاہا کہ وہ اندر جا کر ایاز پر ٹوٹ پڑے۔ اس کی جان لے لے یا اپنی جان دیدے۔ مگر یہ صرف ارادہ تھا، اسے عملی جامہ پہنانا اتنا آسان نہیں تھا۔

وہ کار سے اتری اور اپنے آپ میں کھولتی ہوئی آفس کی طرف گئی۔ ابھی وہ دروازے سے آٹھ دس قدم دور ہی تھی کہ آفس کا دروازہ کھلا اور اس نے ایاز کو دیکھا۔ وہ اختر زمانی سے رخصت ہو کر باہر نکل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والی مدھم مسکراہٹ عینی کو دنیا کی کریہہ ترین مسکراہٹ محسوس ہوئی۔ ایاز نے عینی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ عام سے انداز میں ایک ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ پیش آنے والے لمحات کا پورا نقشہ اس کے ذہن میں کھنچ گیا تھا اور یہ نقشہ اتنا بھیانک تھا کہ عینی کی پیشانی پر ابھی سے پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔۔۔۔۔۔

اختر زمانی ٹیکسٹائل کا کام کرتا تھا اور ایاز کا کام ایڈورٹائزنگ کا تھا۔ عینی جانتی تھی کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں کبھی کبھار اختر زمانی سے ملتا رہتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خوش خیالی جنم لینے لگی کہ شاید۔۔۔شاید وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں ہی اختر زمانی سے ملنے آیا ہو۔ لیکن

اس خوش خیالی کی عمر سیکنڈ سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ تو کبوتر کی طرح بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرنے والی بات تھی۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو اب ہونا ہی تھا۔ عینی نے اپنے ڈولتے ہوئے دل و دماغ کو سنبھالا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آفس کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔ اس کا شوہر اپنی وسیع و عریض میز کے پیچھے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں ایک کھلی ہوئی فائل پر تھیں لیکن چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کا ذہن کہیں بہت دور ہے۔

عینی کو دیکھ کر وہ چونکا۔ کچھ دیر ساکت نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر گمبھیر آواز میں بولا ''عینی! تم یہاں''؟

عینی نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے شوہر کے سامنے بیٹھ گئی اور پرس اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس خاموشی کے پیچھے ایک طوفان ہے، جو کسی بھی وقت بپھر کر سامنے آ سکتا ہے۔ لمحے صدیوں پر بھاری تھے۔ اختر زمانی کی نگاہیں بیوی کے حسین چہرے پر تھیں۔ وہ نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ جسم کے ہر مسام سے پسینہ ابل پڑا تھا۔ اختر زمانی نے ایک بار پھر گمبھیر آواز میں اسے مخاطب کیا ''عینی! کیا بات ہے۔ تم کچھ۔۔۔پریشان لگ رہی ہو۔''

اس نے شوہر کی آنکھوں میں جھانکا اور بے ساختہ اس کے ہونٹوں سے نکلا ''زمانی! آپ چھپانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟ ایاز نے آپ سے کیا بات کی ہے؟''

اختر زمانی نے حیرت سے کہا ''کیسی بات؟''

''وہی بات، جو ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ دونوں کے درمیان ہوئی ہے۔''

اختر زمانی کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں ''بھئی! میں تمہاری بات سمجھ نہیں پا رہا۔ ایاز کام کے سلسلے میں ہی میرے پاس آیا تھا۔ وہ دبئی میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے، اس بارے میں بات کر رہا تھا۔ مجھ سے اسائنمنٹ وغیرہ کی توقع کر رہا ہے۔''

عینی کی آنکھیں شوہر کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھوں کے راستے اس کے دل تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اپنے چہرے کو نارمل رکھے ہوئے تھی لیکن اس کے دل و دماغ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ کیا واقعی ایسا ہو چکا تھا۔ کیا واقعی ایاز نے اختر زمانی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ کیا یہ محض ایک اتفاق تھا کہ وہ عینی کو دھمکی آمیز فون کرنے کے فوراً بعد اختر زمانی کے آفس چلا آیا تھا اور اس سے تنہائی میں ملاقات کی تھی۔ عقل یہ بات ماننے کو تیار نہیں

تھی لیکن صورت حال اسی سمت میں اشارہ کر رہی تھی۔

اختر زمانی نے تھرماس میں سے ٹھنڈا پانی نکالا اور گلاس عینی کے سامنے رکھا ''تم بے حد اپ سیٹ نظر آ رہی ہو ڈارلنگ۔۔۔۔ کیا ایاز کے ساتھ کوئی بات ہوئی ہے۔ مم۔۔۔میرا مطلب ہے کہ تم دونوں تو ایک دوسرے کو ٹھیک سے جانتے بھی نہیں ہو۔ پھر کیا مسئلہ ہو گیا ہے تمہارے بیچ؟''

عینی نے بڑی کوشش سے خود کو سنبھالا۔ ایک گہری سانس لے کر بولی ''نہیں۔۔۔۔ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''مگر تم نے ابھی کہا ہے کہ ایاز نے مجھے کوئی خاص بات بتائی ہے اور میں اسے چھپانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

وہ ٹپٹا گئی ''پتا نہیں۔۔۔میرے دماغ میں خوامخواہ کیا وہم آ گیا تھا۔''

''چلو وہم ہی سہی ڈارلنگ۔۔۔۔ مگر بتاؤ تو۔''

عینی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ وہ کراہتے ہوئے بولی ''میں آپ کو بتاؤں گی زمانی۔۔۔لیکن پلیز۔۔۔ابھی مجھے مجبور مت کریں۔۔۔۔''

''تم مجھے الجھن میں ڈال رہی ہو۔''

''اوہ کم آن زمانی۔۔۔۔ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ پلیز ٹیک اٹ ایزی۔'' اس نے شوہر کے ہاتھ اپنے ملائم ہاتھوں میں تھام لئے اور موضوع بدلنے کی بھرپور کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

گھر آ کر عینی مسلسل یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈولتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایاز نے اس کے شوہر سے ہنگامی ملاقات کرنے کے باوجود اپنی دھمکی کو عملی جامہ کیوں نہیں پہنایا۔ کیا ایاز خود بھی تذبذب کا شکار تھا۔ یا پھر کاری وار کرنے کے لئے وہ کسی بہتر موقع کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ عینی جانتی تھی کہ ایاز کے ہر کام میں زبردست پلاننگ ہوتی ہے اور وہ قدم اٹھانے سے پہلے سینکڑوں مرتبہ سوچتا ہے۔۔۔ اس کے علاوہ ایک اور امکان بھی ہو سکتا تھا اور وہ یہ کہ عینی کو دھمکی آمیز فون کرنے کے بعد ایاز غصے میں بھرا ہوا اختر زمانی کے پاس آیا ہو لیکن یہاں حسب معمول اختر زمانی نے کوئی ایسی کاروباری بات کہہ دی ہو جس میں ایاز کو فائدہ

ہی فائدہ نظر آیا ہو۔ لہٰذا اس نے فی الوقت اپنی دھمکی پر عمل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔ ایسے ہی مختلف امکانات موجود تھے۔

شام کو اختر زمانی گھر آیا تو بالکل ہلکے پھلکے موڈ میں تھا۔ عینی اسے کھوجتی والی نظروں سے دیکھتی رہی مگر اس کے رویے میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ اختر زمانی ہلکے پھلکے موڈ میں ہوتا تھا تو میوزک سنتا تھا۔ اپنی طرح اسے میوزک بھی ''سوبر'' قسم کا ہی پسند تھا۔ پختہ گائیکی کے نچ والے گانے، اساتذہ کی غزلیں یا پھر کبھی کبھار کلاسیکل پرانے فلمی نغمے۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر آن کیا تو ایک کلاسیکل پاکستانی نغمہ بجنے لگا۔ بھولی ہوئی ہوں داستان، گزرا ہوا خیال ہوں۔ ایسے نغموں سے عینی کو چڑ تھی۔۔۔۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے اختر زمانی کا دھیان اپنے بریف کیس کی طرف چلا گیا۔ وہ بریف کیس کھولتے ہوئے بولا ''میں بھول ہی گیا۔ ہماری شادی کی سالگرہ پر ایاز یہ کارڈ دے گیا تھا ہمارے لئے۔''

عینی نے لرزتے ہاتھوں سے کارڈ تھام لیا۔ یہ ایک خوبصورت ''ویڈنگ ڈے'' کارڈ تھا۔ نیچے ایاز کے دستخط تھے۔ کارڈ دیکھ کر عینی کے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ اس معاملے کو ایک بالکل دوسرے رنگ میں دیکھ رہی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس کارڈ کے ذریعے ایاز نے اسے دھمکی آمیز پیغام پہنچایا ہو۔ اس نے عینی کو بتایا ہو کہ دیکھو آج دوپہر تمہیں فون کرنے کے بعد میں تمہارے شوہر کے پاس گیا تھا، اس سے باتیں بھی کی تھیں، لیکن وہ بات نہیں کی جو تمہاری ازدواجی زندگی کو تباہ و برباد کر سکتی ہے۔ لہٰذا ابھی بھی وقت ہے، سنبھل جاؤ۔

اگلے روز بھی عینی کا دل انجانے خدشے کے تحت دھڑکتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ ایاز کا فون پھر آئے گا، لیکن شام تک خیریت گزری، فون نہیں آیا۔ شام کو اختر زمانی۔۔۔۔ گھر آیا۔۔۔۔ تو خاموش خاموش تھا۔ عینی نے اس کے لئے چائے بنوائی، ہلکی پھلکی باتیں کیں اور پھر دونوں ٹہلنے کے لئے لان میں چلے گئے ''تم نے مجھے کل سے الجھن میں ڈال رکھا ہے۔'' اختر زمانی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا ''یا تو آدمی کو بات کرنی نہیں چاہیے یا پوری کرنی چاہیے''۔

''کیسی بات؟'' وہ جانتے بوجھتے انجان بن گئی۔

''وہی بات جو کل آفس میں ہوئی تھی۔ میرا نہیں خیال کہ تم اتنی جلدی بھول گئی ہو۔'' اختر زمانی کے لہجے میں خفگی تھی۔

عینی نے ایک سیکنڈ کے لئے اختر زمانی کو گہری نظروں سے دیکھا، پھر ایک دم اس کے تاثرات بدلے اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ اس کی شوخ چلبلی ہنسی کسی فوارے کی پھوار کی طرح لان میں بکھرتی اور پھیلتی چلی گئی۔ اختر زمانی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ عینی نے ایک انداز دلربائی سے شوہر کا بازو تھاما اور اپنا رخسار اس کے کندھے سے لگا دیا۔ ''کبھی کبھی تو آپ بھی میری طرح خبطی ہو جاتے ہیں چھوٹی سی بات کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔''

''چھوٹی سی بات تھی تو پھر تم بھاگی ہوئی میرے دفتر کیوں چلی آئی تھیں؟''

''ڈارلنگ، میں نے کہا ہے ناں کہ میں تو خبطی ہوں۔ لیکن پلیز آپ تو ایسے نہ بنیں۔''

''مگر ہوا کیا تھا؟'' اختر زمانی نے سٹپٹائے لہجے میں پوچھا۔

وہ پھر دلنشیں انداز میں ہنس دی'' جان! بات تو کچھ زیادہ اہم نہیں تھی لیکن پتا نہیں کیوں مجھے آپ سے ڈر لگنے لگا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ آپ خفا ہوں گے لہٰذا پاگلوں کی طرح بھاگی ہوئی آپ کے پاس چلی آئی۔''

''بھئی بات بھی تو بتاؤ ناں کہ کیا تھی؟''

''ناراض تو نہیں ہوں گے؟''

''ٹھیک ہے، نہیں ہوں گا۔''

''میں نائیلہ کے گھر گئی تھی۔''

''اچھا وہی تمہاری گلبرگ کالونی والی سہیلی۔''

''جی ہاں۔ ایاز نے مجھے اس کی کوٹھی سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی سوزوکی کار میں تھا اور کار کا رخ تھا جناب عالی! آپ کے آفس کی طرف۔ مجھے لگا کہ یہ شخص جاتے ہی آپ کو اس بارے میں بتائے گا اور آپ آگ بگولا ہو جائیں گے۔۔۔ پورے کے پورے ۔۔۔سر سے پاؤں تک۔۔۔ جیسے پچھلی دفعہ ہوئے تھے۔''

''پچھلی دفعہ کب؟''

''ہاں آپ کو کب یاد ہوگا۔ روتی تو میں رہی تھی رات بھر۔۔۔ سالگرہ تھی نائیلہ کی۔ آپ سے ڈرتے ہوئے آپ کو بتایا بھی نہیں تھا۔ صرف آدھے گھنٹے کے لئے چلی گئی تھی۔ ''ایاز صاحب'' نے دیکھ لیا تھا اور آپ سے ذکر کر دیا تھا۔ آپ نے گرج گرج کر آسمان سر پر اٹھا لیا

تھا۔''

اختر زمانی بولا۔۔۔ ''گرجنے برسنے کو تو اب بھی دل چاہ رہا ہے لیکن تم سے خفا نہ ہونے کا وعدہ کیا ہے لہٰذا چپ رہنے پر مجبور ہوں۔ باقی یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ مجھے اس لڑکی سے چڑ ہے۔۔۔ اور اس جیسی جو اور دو تین تمہاری سہیلیاں کہلاتی ہیں، ان سے بھی چڑ ہے۔ اور یہ کوئی ذاتی عناد نہیں ہے، اصولی اختلاف ہے۔۔۔ عینی! عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہے اور شرم و حجاب اس کا زیور ہے۔ نت نئے فیشن کرنے اور اور پھرنے والی لڑکیوں کو میں تو سر آنکھوں پر بٹھانے کے حق میں نہیں ہوں۔۔۔ میں مانتا ہوں کہ تم نائیلہ اور اس جیسی دوسری لڑکیوں سے مختلف ہو۔ لیکن یہ انفرادیت تادیر برقرار نہیں رہتی۔ انسان جن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے ان کا رنگ اس پر چڑھتا ضرور ہے۔''

''ڈارلنگ! وہ بھی تو میرے پاس اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا رنگ ان پر چڑھ جائے۔''

''یہ عمل یک طرفہ نہیں ہوتا۔ انسان اپنے ملنے جلنے والوں سے کچھ لیتا ہے تو دیتا بھی ہے۔ اور دیتا ہے تو لیتا بھی ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ ان لڑکیوں کا رنگ ڈھنگ تمہارے اندر نظر آنے لگے۔ اب تمہارے دو تین لباس ایسے بھی ہیں جو مجھے بالکل پسند نہیں اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ لباس اپنانے میں تم نے شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی ان سہیلیوں کو FOLLOW کیا ہے۔ پلیز ناؤ اسٹاپ اٹ۔ بہت ہو چکی ہے اب۔۔۔ مجھ پر اور میری محبت پر رحم کرو۔''

آخری الفاظ اختر زمانی نے تقریباً مسکراتے ہوئے کہے تھے، لہٰذا عینی کی چڑھی ہوئی تیوریاں اتر گئیں۔ ویسے بھی وہ اندر سے تو خوش ہی تھی کہ اس کا ایک بدترین اندیشہ باطل ثابت ہو گیا تھا۔

اس کے بعد آنے والے ہر دن میں عینی کی بے چینی کم ہوتی گئی۔ اختر زمانی نے اسے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی دوسری طرف ایاز کی طرف سے بھی [illegible] گیا تھا۔ عینی دل ہی دل میں دعا گو رہنے لگی کہ حالات جوں کے توں رہیں اور ایاز اپنے پروگرام کے مطابق ذہنی شفٹ ہو جائے۔ انگریزی کا یہ مقولہ ان دنوں عینی کو بہت اچھا لگ رہا

تھا کہ کسی خبر کا نہ ہونا ایک اچھی خبر ہے۔

اور پھر ایک روز سچ مچ عینی کی سنی گئی۔ اپنی سہیلی نائیلہ ہی کی زبانی عینی کو پتا چلا تھا کہ ایاز دو ہفتے پیشتر دبئی جا چکا ہے اور وہاں ایڈورٹائزنگ ایجنسی کی داغ بیل ڈال رہا ہے۔ اس اطلاع کے بعد عینی نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اس کی یہ امید بندھ گئی تھی کہ اب شاید ایاز کی پریشان کن آواز اس کے کانوں میں کبھی نہ پڑے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ اختر زمانی کے ساتھ ازدواجی بندھن میں بندھے ہوئے عینی کو اب پانچ چھ سال ہونے کو آئے تھے، تاہم ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ شاید ایک وجہ عینی کا لاابالی پن اور آزاد خیالی تھی۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی میں موو کرتی تھی جسے اختر زمانی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ راست گو اور کسی حد تک مذہبی بھی تھا۔ وہ عورت کے چراغ خانہ ہونے پر یقین رکھتا تھا اس کا شمع محفل ہونا اسے ہرگز قبول نہیں تھا۔ عینی کے خیالات برعکس تھے، بہر حال اس سلسلے میں حدود و قیود کو وہ بھی اہمیت دیتی تھی۔ میاں بیوی دونوں نے تھوڑا تھوڑا ایڈجسٹ کیا تھا اور تھوڑے تھوڑے تناؤ کی کیفیت میں ان کی ازدواجی زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طور پر گھسٹتی ہی جا رہی تھی۔ کسی وقت جب عینی تنہا ہوتی تو اس کے پردۂ تصور پر ایاز کی شبیہہ ابھر آتی اور وہ واقعات تازہ ہو جاتے جو تین برس پہلے اس حوالے سے رونما ہوئے تھے۔ وہ یہ سوچ کر کانپ جاتی کہ اگر اس روز ایاز جوشِ غضب میں سچ مچ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیتا تو کیا ہوتا۔ وہ اختر زمانی کو اب بہت اچھی طرح جاننے لگی تھی۔ وہ اس سے شدید محبت کرتا تھا لیکن یہ محبت اس کے اصولوں سے مشروط تھی۔ اگر اسے وہ سب کچھ معلوم ہو جاتا جو ایاز بتانے جا رہا تھا تو اس کا ردِ عمل یقیناً شدید اور نتیجہ خیز ہوتا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ میاں بیوی کے راستے جدا ہو جاتے۔ حالانکہ اس حوالے سے عینی نے اپنی پوزیشن بڑی ذہانت سے صاف کر لی تھی۔ اور اپنی طرف سے شوہر کو پوری طرح مطمئن کر دیا تھا۔ پھر بھی کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا تھا کہ اختر زمانی کے دل کی گہرائی میں کہیں شک کا موہوم سایہ موجود ہے۔ ممکن تھا کہ اس شک کی وجہ۔۔۔ وہ سوال ہو جو اس روز اچانک عینی کے منہ سے نکل گیا تھا جب وہ بھاگم بھاگ آفس پہنچی تھی تو اس نے ایاز کو اپنے شوہر کے آفس سے نکلتے ہوئے پایا تھا۔ عینی نے بے ساختہ شوہر سے پوچھ لیا تھا کہ ایاز اس سے کیا بات کر کے گیا ہے۔ عینی نے کئی بار سوچا تھا کہ اگر اس روز یہ سوال اس کے منہ سے نہ نکلتا تو اچھا تھا۔ بے شک بعد میں عینی نے اپنے اس سوال کی بھی وضاحت کر دی تھی مگر کہیں کوئی کمی ضرور رہ گئی تھی۔

اختر زمانی پہلے ہی عینی سے عمر میں بڑا تھا۔ کاروباری مصروفیات، ذہنی پریشانیوں اور تفریح کی کمی نے اس کے بال کچھ سفید کر دیے اور میاں بیوی کی عمر میں موجود فرق زیادہ نمایاں نظر آنے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اختر زمانی کی اصول پسندی میں اضافہ ہو گیا تھا جبکہ عینی نے اپنے آپ کو بدلنے کی مطلق کوشش نہیں کی تھی بلکہ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے سیلانی پن اور آزاد خیالی میں کچھ اور آگے نکل گئی ہے۔ میاں بیوی کے باہمی روابط بہت کمزور ہو چکے تھے اور کبھی کبھی تو وہ ہفتوں ناشتے کی میز پر بھی نہیں ملتے تھے۔ گھریلو فضا مکدر ہونے کی وجہ سے اختر زمانی کے مزاج میں ہلکا سا چڑچڑا پن آ گیا تھا اور اس چڑچڑے پن کی وجہ سے عینی گھر اور شوہر سے کچھ اور بھی لاتعلق ہو گئی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی کو متاثر کرنے میں اولاد کی کمی بھی اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔ انہوں نے کافی علاج معالجہ کرایا تھا۔ طبی نقطۂ نظر سے میاں بیوی ٹھیک ہی تھے پھر بھی ابھی تک اولاد کی نعمت سے سرفراز نہیں ہو سکے تھے۔ کسی ویران رات کو جب میاں بیوی ایک ہی کمرے میں ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے سینکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے پر ہوتے تو عینی ایک دم بہت اداس ہو جاتی۔ اسے لگتا جیسے وہ اپنے شوہر کے ساتھ نہیں کسی کلاسیکل غزل کے ساتھ لیٹی ہوئی ہے۔ دھیمے سُروں میں گائی ہوئی ایک ایسی شاعری جس میں بہت کم اتار چڑھاؤ ہیں۔ ایسے میں ایاز کا چہرہ پوری آب و تاب سے اس کے تصور میں دمکنے لگتا۔ اس کی محبت اسے یاد آتی۔ کوہی نالے جیسی پُر شور، پُر جوش اور دل و دماغ میں تہلکہ مچاتی ہوئی۔۔۔۔۔ وہ راز و نیاز وہ نرم گرم شوخیاں، وہ جسارتیں۔۔۔ اسے اندازہ ہوتا کہ ایاز کو کھو کر اس نے بہت کچھ کھویا ہے۔ امنگ ترنگ سے بھرے ہوئے ایک دریا کے کنارے سے اٹھ کر وہ ایک ٹھہرے ہوئے پانی کے پاس آ بیٹھی تھی اور زندگی کے چھ سات سال گزار دیے تھے۔ یہ پانی ایک شفاف ساکن جھیل جیسا ضرور تھا مگر اب وہ یہ شفاف ساکن منظر دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکی تھی۔ یہ منظر اب اس کی نگاہوں میں گدلا ہونے لگا تھا۔

ہر شخص میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ اختر زمانی میں بھی کئی خامیاں تھیں۔ اب یہ خامیاں عینی کی نگاہ میں بری طرح کھٹکتی تھیں۔ ان میں سے ایک خامی یہ تھی کہ وہ

ماحول سے مطابقت پیدا نہیں کر پاتا تھا۔ اس کی مزاحمت بے شک دھیمی اور شائستہ رہتی تھی لیکن یہ مزاحمت جاری رہتی تھی۔ اب عینی کی دوستوں والا معاملہ ہی دیکھا جاتا تو اس میں اختر زمانی بدستور مزاحمت پیش کر رہا تھا اور اس میں کبھی بھی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے اچھے یا برے اصولوں کو سینے سے لگا کر رکھنے والے شخص کے طور پر سامنے آیا تھا۔ عینی جب ایاز کے بارے میں سوچتی تو ایک بالکل مختلف صورت حال اس کے سامنے آتی۔ ایاز نے عینی کی خاطر ماحول سے کتنی زبردست مطابقت پیدا کی تھی اور اپنے اوپر جبر کر کے خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ یہ ایک اٹل حقیقت تھی کہ اس کے پاس عینی کو بلیک میل کرنے کے لئے کافی مواد موجود تھا۔ وہ تھوڑی سی کوشش کرتا تو عینی سے خطیر رقم بٹور سکتا تھا اور نہ بٹور سکتا تو اس کی زندگی کو تہ و بالا کر سکتا تھا لیکن قدرت رکھنے کے باوجود وہ اس انتہا تک نہیں گیا تھا اور خاموشی سے پسپائی اختیار کر لی تھی۔ وہ محبت کو رسوا کرنے کے فعل سے باز رہا تھا اور عینی کو اس کے حال پر چھوڑ کر دبئی چلا گیا تھا۔

کئی ہفتوں بلکہ مہینوں کے لئے عینی کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کی سوچیں اپنے شوہر اور اپنے سابقہ محبوب کے درمیان تقسیم ہو کر رہ گئی ہیں۔ وہ دھیرے دھیرے مگر مسلسل اپنے شوہر کی محبت و توجہ سے محروم ہوتی جا رہی تھی یا شاید اسے لگ رہا تھا کہ وہ محروم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس بارے میں جتنا سوچتی تھی۔ اتنا ہی اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اور اختر زمانی کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا ہے۔۔۔۔ ٹھہری ہوئی جھیل کے ٹھہراؤ اور گہرائی سے اسے اب کراہت محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے اچھلتا کودتا، گنگناتا پانی درکار تھا۔ اور پھر ایک موقع آیا کہ ان دونوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔۔۔۔ ضروری کارروائی کے بعد ان دونوں میں طلاق ہو گئی۔ ایک مکان، اسلام آباد میں ایک پلاٹ اور تیس لاکھ کی گاڑی عینی کے نام تھی۔ اس کے علاوہ زیورات وغیرہ بھی تھے۔ وہ خود کو مالی طور پر محفوظ تصور کرتی تھی۔ اختر زمانی ایک نرم مزاج۔۔۔۔ محبت کرنے والا اور خیال رکھنے والا شوہر تھا اس سے جدا ہو کر عینی کو قلق تو ہوا لیکن یہ زیادہ دیرپا نہیں تھا۔ بہت جلد اس نے خود کو ایڈجسٹ کرنا شروع کر دیا۔۔۔۔ زندگی ایک تند و تیز موڑ کاٹ کر پھر ہموار سیدھے راستے پر چلنے لگی تھی۔

یہ طلاق سے نو دس ماہ بعد کا واقعہ ہے، ایک روز عینی دبئی ائرپورٹ پر اتری۔ عینی کو ریسیو کرنے کے لئے اس کی ایک دیرینہ سہیلی نادوا ائرپورٹ پر موجود تھی۔ نادوا اپنے بنگلہ دیشی بینک کار شوہر کے ساتھ دبئی میں ہی رہتی تھی۔ عینی کا یہ دورہ تفریحی نوعیت کا تھا اس کے علاوہ وہ دبئی میں کچھ شاپنگ بھی کرنا چاہتی تھی لیکن پس پردہ اس دورے کا ایک اور مقصد بھی تھا۔ وہ ایاز سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے دیکھنا چاہتی تھی اور یہ جاننا چاہتی تھی کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اب وہ اس کے بارے میں کس انداز سے سوچتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی شادی ہو چکی ہوگی، اس کے بال بچے ہوں گے۔ وہ اس کی زندگی کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بس ایک جھونکے کی طرح اس کے پاس سے گزرنا چاہتی تھی اور اس کی خوشبو لینا چاہتی تھی۔ ایاز دبئی میں ایڈورٹائزنگ کا کام کر رہا تھا، اس کا کھوج لگانا زیادہ دشوار نہیں تھا۔ دبئی پہنچنے کے بعد عینی نے اس سلسلے میں کوشش کی اور جلد ہی کامیاب ہو گئی۔ ایاز ایک مقامی شخص کے ساتھ مل کر کام کر رہا تھا۔ اس نے بہت زیادہ ترقی تو نہیں کی تھی بہر حال ایک خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔ عینی یہ جان کر حیران ہوئی کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔

ایاز کا دفتر ایک کم آبادی والے علاقے میں تھا۔ ایک دو روز میں عینی کو اس کا مکمل ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ بھی معلوم ہو گیا۔ عینی اس سے یوں ملنا چاہتی تھی کہ یہ ملاقات سرپرائز کی شکل اختیار کر جائے۔ ایک عجیب سی امنگ ترنگ اس میں جاگی ہوئی تھی۔ وہ خود کو پھر سے ایک نوجوان لڑکی محسوس کر رہی تھی۔ وہ لڑکی جو کالج جاتی تھی۔ شاعری پڑھتی تھی اور ایاز نام کے ایک خوب صورت نوجوان کو دیکھ کر جس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگتی تھیں۔ اپنی اس کیفیت کو وہ خود بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اس نے بازار سے جدید تراش کا ایک سیاہ برقعہ لیا اور ایک دوپہر خراماں خراماں ''ایاز ایڈورٹائزنگ'' کے آفس پہنچ گئی۔ ایاز سے اس کی ملاقات ایک سجے سجائے دفتر میں ہوئی۔ وہ ایک کلائنٹ کی حیثیت سے اس کے سامنے بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ ایاز کی کنپٹیوں پر چند سفید بال نظر آنے لگے تھے، بہر حال وہ پہلے ہی کی طرح صحت مند اور تر و تازہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی مونچھیں پہلے سے گھنی ہو گئی تھیں اور آواز بھی کچھ بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے عینی نے چہرے پر سے نقاب ہٹا دیا۔ آنکھوں کی طرح اس کا پورا چہرہ ایاز پر عیاں

ایاز کا منہ کھلا رہ گیا اور چہرے پر دنیا جہاں کی حیرتیں سمٹ آئیں۔

''تم عینی؟'' وہ کانپتی آواز میں بولا۔

''کیوں تمہارا کیا خیال تھا کہ میں اب اس دنیا میں نہیں ہوں۔''

''نہیں ــــــ نہیں ــــــ لیکن میں ــــــ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ـــــ یوں''۔

''سوچ تو میں بھی بہت کچھ نہیں سکتی تھی لیکن وہ سب کچھ ہوا اور میرے سامنے ہوا۔''

ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کو کہاں سے اور کیسے شروع کریں۔ ایاز نے کافی منگوائی۔ وہ کافی کی پیالیوں پر جھک گئے اور ماضی کو کھنگالنے لگے۔ ماضی جو ان کی نظروں کے سامنے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ ماضی دو مہیب ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک ٹکڑا عینی کے پاس تھا اور دوسرا ایاز کے پاس ــــــ وہ ان ٹکڑوں کو جوڑنے میں مصروف ہو گئے۔

☆☆☆

ایاز سے عینی کی دوسری ملاقات ایاز کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ رہائش گاہ اس کے آفس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ وہ ایک صاف ستھرا اور کشادہ ولا تھا۔ دبئی جیسے شہر میں ایسے مکان کا مل جانا خوش قسمتی کی بات تھی۔ ان دونوں نے سرسبز لان میں بیٹھ کر شام کی چائے پی اور پھر ٹی وی لاؤنج میں صوفوں پر براجمان ہو کر مصری فلم دیکھتے رہے۔ عینی جلد لوٹنا چاہتی تھی لیکن ایاز نے بڑی خوب صورتی سے اسے باتوں میں الجھائے رکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عینی رات کا کھانا کھا کر جائے۔ وہ اپنے لبنانی خانساماں کی تعریفوں کے پُل باندھ رہا تھا اور اپنی اس قصیدہ خوانی کا ثبوت بھی فراہم کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فروزن ٹراؤٹ مچھلی پکانے میں اس کے خانساماں کا ثانی دور دور نہیں ہے۔ گفتگو کے دوران میں عینی نے دو تین بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایاز نے کسی نہ کسی بہانے سے اسے روک لیا۔ وہ بات سے بات نکالنے کا فن جانتا تھا اور عینی تو ہمیشہ سے اس کی باتوں میں یوں گم ہوتی تھی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی کھو دیتی تھی۔ دبیز قالینوں اور خوب صورت پردوں والے اس ائرکنڈیشنڈ گھر میں بیٹھ کر مسلسل گفتگو کرنے کے لئے ان کے پاس بہت سا مواد تھا۔ سات آٹھ برس کی باتیں تھیں جو ایک جگہ جمع ہو چکی تھیں۔ عینی اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی اور خاص طور سے ان واقعات کے بارے میں

جو پانچ برس پہلے ایاز کی دھمکی آمیز ٹیلی فون کالز شروع ہوئے تھے اور اچانک ختم ہو گئے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے ایاز کو ان موضوعات کی طرف لا رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے عینی کو دفعتاً اندازہ ہوا کہ ایاز کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ آ گئی ہے۔ وہ نشے میں محسوس ہو رہا تھا۔ باتوں کے دوران میں وہ دو تین دفعہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا تھا، یقیناً اس نے ڈرنکس لیے تھے۔

''تم ڈرنک کر رہے ہو؟'' عینی نے پوچھا۔

''ہاں ــــــ کبھی کبھی کر لیتا ہوں۔ شاید یہ بھی تمہارا ہی دیا ہوا روگ ہے۔''

''کیوں ــــــ میں نے کیا کیا ہے؟''

''تم نے کیا نہیں کیا؟'' وہ نشیلے انداز میں مسکرایا۔ ''تم نے سب کچھ کیا ہے۔''

اس کا ہاتھ بے تکلفی سے عینی کے ہاتھ پر آ گیا۔ عینی لرز کر رہ گئی۔ ایاز کی پیش قدمی کا یہ انداز عینی کے لئے تشویش ناک تھا۔ اس نے بارہا ایاز کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان کے اندر جھانکا تھا۔ لیکن ان آنکھوں کی تہ میں جو کچھ آج نظر آ رہا تھا وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ ان آنکھوں میں ایک بھوکے شخص کا عکس تھا۔ ایک ایسا شخص جس کے منہ سے طلب کی شدت سے رال بہہ رہی تھی۔ اور جو بڑی ہی ''ضرورت مند'' نظروں سے اس کے آر پار دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد عینی بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایاز نے جرات رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بھاری ہاتھ عینی کے شانے پر رکھ دیا۔ پھر ایک تند جھٹکے سے وہ اسے اپنے قریب لے آیا۔ الکحل کا بھبکا عینی کے نتھنوں سے ٹکرایا۔

''پلیز ایاز ــــــ یہ کیا کر رہے ہو؟''

''تم جانتی ہو کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ تم سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ تم سے زیادہ تو شاید میں بھی نہیں جان سکتا۔''

وہ اس پر جھکتا چلا گیا۔ عینی نے مزاحمت پیش کی لیکن وہ ایک ایسے بپھرے ہوئے مرد کی گرفت میں تھی جو نشے میں بھی تھا۔ وہ ٹی وی لاؤنج کی نیم تیرگی میں بے بس ہو کر رہ گئی۔ اس نے چلانا چاہا لیکن ایک طاقت ور ہاتھ کی سخت ہتھیلی نے اس کے ہونٹ ڈھانپ لیے۔ پھر اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ کوئی نالے کا شور اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

اس کے حواس دوبارہ بحال ہوئے تو وہ ایک نیم تاریک کمرے میں تھی۔ یہ کمرا اسی وسیع مکان کا حصہ تھا جہاں ایاز کے ہاتھوں اس پر قیامت ٹوٹی تھی۔ وہ دروازے کی طرف لپکی۔ حسب توقع وہ باہر سے بند تھا۔ وہ دروازہ پیٹنے لگی۔ ایک غنڈا صورت نوجوان کھڑکی میں نظر آیا۔ یقیناً وہ ایاز کا کوئی پاکستانی دوست تھا۔ اس نے اپنا چہرہ کھڑکی کی آہنی گرل سے لگایا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی مسکراہٹ بھری ہوئی تھی۔ اپنے ہونٹ سکوڑ کر اس نے عینی کو ایک نازیبا اشارہ کیا اور گنگنانے لگا۔ عینی نے کھڑکی ایک دھاکے سے بند کر دی اور بستر پر گر کر رونے لگی۔ اس کے دل و دماغ میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ؟ اس سے اندازے کی اتنی بڑی غلطی کیونکر ہوئی۔ وہ کیوں تن تنہا آ گئی ایاز کے ساتھ اس چار دیواری میں۔

اسے اپنے تئیں مردم شناسی کا دعویٰ تھا، لیکن آج یہ دعویٰ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ وہ اس شخص کو ہی نہیں سمجھ سکی تھی جو اس کی زندگی میں سب سے اہم تھا۔ اتنی بڑی غلطی۔ اس کا دل اپنا سر پیٹنے کو چاہ رہا تھا۔ وہ صبح تک بھوکی پیاسی اس کمرے میں بند رہی۔ اپنے اندرونی ہیجان سے گھبرا کر وہ کئی بار بلند آواز میں چیخی لیکن یہ مکان اتنا بڑا تھا کہ اس کی چیخ پکار باہر تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ پھر وہ یہاں آتے ہوئے کسی کو بتا کر بھی نہیں آئی تھی۔ اس کی سہیلی نادو سمیت کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ اسے یقین تھا وہ ایک ناقابلِ شکست جال میں پھنس چکی ہے۔ نجانے ایاز اسے چھوڑ کر کہاں غائب ہو گیا تھا اور وہ کن لوگوں کے رحم و کرم پر تھی۔ دوپہر دو بجے کے لگ بھگ کھڑکی پر دستک ہوئی، اس نے کھڑکی کھولی۔ دوسری طرف پھر وہی منحوس چہرہ نظر آیا جس نے رات اسے فحش اشارے کیے تھے۔ وہ پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ بال گھونگھریالے، رنگ سانولا اور آنکھوں میں کمینگی کی جھلک تھی۔ اس نے عینی کو دیکھ کر لفنگے انداز میں آنکھ میچی اور اپنے بے ڈھنگے دانتوں کی نمائش کرنے لگا ''کیوں رانی! کچھ ہوش ٹھکانے آئے یا نہیں؟'' وہ بولا۔

عینی نے ایک بار پھر کھڑکی جھٹکے سے بند کرنا چاہی لیکن اس نے گرل میں ہاتھ گزار کر اسے پٹ بند کرنے سے روک دیا۔ بازاری لہجے میں بولا ''شہزادی! ہمارے قبضے میں ہو اور ہم سے چھپ رہی ہو۔ یہ مکان ہمارا ہے اور یہ کمرا بھی ہمارا ہے۔ یہ تمہیں کب تک پناہ دے سکتا

ہے۔ ہم سے دور رہو گی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔ دو تین دن تک پیٹ میں روٹی نہ گئی تو یہ چاند سا مکھڑا مرجھا کر پیپل کے پتے جیسا ہو جائے گا۔''

''وہ کتا کہاں ہے؟'' عینی نے زہرناک لہجے میں پوچھا۔

''شاید تم ایاز کو یاد کر رہی ہو، لیکن یاد کرنے کا یہ انداز تو بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ ایک طرف اتنا پیار کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے لئے یہاں چلی آئی ہو اور ایک طرف اتنی ناراضگی کہ اسے انسان کہنا بھی گوارا نہیں۔''

''ہاں ہاں وہ انسان نہیں اور تم سب بھی جانور ہو۔ میں تھوکتی ہوں تمہارے منہ پر۔''

وہ غور سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک تاؤ دلانے والی چمک تھی۔ اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے بولا ''آخر تم چیز کیا ہو رانی۔ جلیبی کے مافق تمہارے آگے پیچھے کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ جب تمہیں پتا تھا کہ ایاز تمہارے حق میں ٹھیک نہیں ہے۔ وہ پہلے بھی تمہیں بلیک میل کر چکا ہے۔ تمہارے خاوند کو تمہارے پریم پتر دکھا کر اس سے لمبی رقم بٹور چکا ہے۔ تو پھر تم کیوں اس کے پیچھے بھاگی چلی آئیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی ناں کہ آ بیل مجھے مار۔''

عینی کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ وہ یک ٹک غنڈا صورت نوجوان کو دیکھ رہی تھی پھر اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا ''کیا کہہ رہے ہو تم۔ کس رقم کی بات کر رہے ہو؟''

''وہی جو تیرے عاشق شوہر نے اپنی اور تیری عزت بچانے کے لئے ایاز کے حوالے کی تھی۔ مبلغ 35 لاکھ نصف جن کے ساڑھے سترہ لاکھ ہوتے ہیں۔'' ایک لحہ توقف کر کے اس نے عینی کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔ تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے کچھ پتا ہی نہیں۔ تم عورتیں واقعی جلیبی کی طرح چکر دار ہوتی ہو۔ تمہارے چکر کھولنے کی کوشش میں بندے کا اپنا دماغ چکر بن جاتا ہے۔''

عینی کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ جیسے کسی برق رفتار ہنڈولے میں بیٹھی تھی اور گھومتی چلی جا رہی تھی۔ پانچ سالہ ماضی ایک گٹھڑی کی طرح اس کے سامنے کھلتا چلا جا رہا تھا۔ اس گٹھڑی میں سے جو چیز بھی برآمد ہو رہی تھی وہ عینی کے لئے بالکل نئی تھی۔ آج یہ حقیقت اس پر پوری طرح منکشف ہو گئی تھی کہ پانچ سال پہلے اس دھواں دھواں دوپہر کو ایاز اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے سے باز نہیں رہا تھا۔ اپنے سابقہ [illegible]۔ اختر زمانی کا چہرہ اس کی نگاہوں سے

سامنے تھا۔ خاموش ہونٹ، بردبار پیشانی اور بہت گہری آنکھیں، جن میں سمندر ڈوب جائیں اور نشاں تک نہ ملے۔ وہ حیرت زدگی کے عالم میں یہ سوچتی رہی کہ اس شخص نے پانچ برس تک اتنا اہم راز اس سے چھپائے رکھا۔ اپنے کسی فعل سے، اپنی کسی بات سے، کسی اشارے کنائے سے عینی کو بھنک تک نہیں پڑنے دی کہ وہ اس کے حوالے سے کتنے بڑے راز کا امین ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ عینی کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو، وہ اپنی نگاہوں میں گر نہ جائے۔ اس نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی پانچ برس تک بے خبری کا لبادہ اوڑھے رکھا۔ بے شک وہ عینی کے سلسلے میں بڑی حد تک حساس تھا مگر وہ اتنا بڑا رنج اپنے سینے میں چھپا گیا۔

یک لخت عینی کو خود پر بے حد ندامت ہونے لگی۔ پچھتاوے کی آگ نے پلک جھپکتے میں اس کے تن بدن کو لپیٹ میں لے لیا۔ آہ۔۔۔۔ وہ اختر کی محبت کو سمجھ نہ سکی۔ اس دل کو ہمیشہ کے لئے ٹھکرا کر چلی آئی جس میں اس کے لئے پیار ہی پیار تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔ یہ ایک ایسے ''پچھتاوے'' کے آنسو تھے جس کا کوئی مداوا نہیں تھا۔

خبر نہیں کہ اس قید خانے میں عینی کے ساتھ کیا کچھ ہو جاتا اور کب تک ہوتا رہتا لیکن قدرت نے اس کی تھوڑی سزا کو زیادہ جانا۔ رات کسی پہر مکان میں ہلچل محسوس ہوئی۔ پھر کہیں قریب سے عینی نے ایاز اور اس کے دو دوستوں کی گھبرائی ہوئی آوازیں سنیں۔ ان آوازوں سے عینی کو اندازہ ہوا کہ شہر کا یہ علاقہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے۔ بنگلہ دیشی، انڈین اور کورین کال گرلز یہاں عام پائی جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں آئے دن چھاپے وغیرہ پڑتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی کسی ایسے ہی چھاپے کی کارروائی ہو رہی تھی۔ ایاز کی منحوس آواز عینی کے کانوں میں پڑی، وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا ''چھوڑ یار! خواہ مخواہ کی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ نکالو اس حرام زادی کو یہاں سے۔ لیکن اچھی طرح سمجھا دینا، اگر کہیں شکایت کرے گی تو دبئی میں جہاں بھی ہوگی ڈھونڈ نکالیں گے۔ اور حشر کر دیں گے۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات۔

''اوکے ڈیئر۔'' ساتھی کی آواز آئی۔

اس کے ساتھ ہی کوئی تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ یقیناً یہ ایاز ہی تھا۔

☆☆☆

قریباً چوبیس گھنٹے پہلے وہ ایاز کے ہمراہ جس چار دیواری میں بہت خوش داخل ہوئی تھی وہاں سے مٹی کا ڈھیر بن کر نکلی۔ وہ لٹی پٹی ہوئی تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور جسم و جاں پر جلتی ہوئی خراشیں تھیں۔ ایک لمبی سنسان سڑک پر وہ ڈگمگاتی ہوئی چلتی رہی۔ یہ سڑک اس کی زندگی ہی کی طرح بے سمت تھی۔ کسی نامعلوم مقام سے شروع ہو کر نامعلوم مقام تک پہنچتی تھی۔ عینی کے اردگرد دبئی کی روشنیاں تھیں مگر اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اس کے تصور میں لاہور شہر کے در و دیوار تھے۔ ایک خوب صورت علاقے کا ایک خوب صورت مکان تھا۔ اس خوب صورت مکان کا ایک سجا سجایا کمرہ تھا۔ اس سجے سجائے کمرے میں بیٹھا ہوا ایک اداس صورت شخص تھا۔ اس اداس صورت شخص کے سرہانے ایک ٹیپ ریکارڈر تھا۔ اس ٹیپ ریکارڈر پر کوئی تنہا تنہا اداس غزل چل رہی تھی۔ شاید اختر کی وہی پسندیدہ غزل۔

خبرِ تحیرِ عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

☆

شک گزیدہ

رخشندہ ٹی وی پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ ردھم کے ساتھ اس کا ایک پاؤں ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ اس کی پسندیدہ گلوکارہ اس کی پسندیدہ غزل گا رہی تھی۔۔۔۔۔ ''وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا''۔ اچانک رخشندہ کو محسوس ہوا کہ عارف بڑے غور سے اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ نئی نویلی دلہن تھی اور عارف نیا نویلا دلہا۔ صرف دو ہفتے ہوئے تھے ان کی شادی کو۔۔۔۔۔ ایسے میں عارف کا اسے یوں دیکھنا انوکھی بات نہیں تھی لیکن نجانے کیوں رخشندہ کو یہ بات انوکھی محسوس ہوئی۔ شاید اس کی وجہ وہ خاص قسم کی دھندلاہٹ تھی جو عارف کی آنکھوں میں نظر آ رہی تھی۔ رخشندہ نے یہ دھندلاہٹ پہلی دفعہ دیکھی تھی لہٰذا اسے کوئی خاص معنی نہ پہنا سکی۔ بس اسے یوں لگا جیسے عارف کی نگاہ کے شیشے میں چمک ہو گئی ہے۔

''بڑی اچھی غزل ہے''۔ وہ زیرِ لب مسکرا کر بولا۔

''ہاں مجھے پسند ہے۔''

''چلو تمہاری ایک اور پسند کا پتا چل گیا۔ آہستہ آہستہ ساری پسند و ناپسند معلوم ہو جائے گی''۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

رخشندہ کو عارف کا یہ انداز کچھ اچھا نہیں لگا۔

ان دونوں کی شادی ماں باپ کی پسند کی تھی۔ شادی خاندان سے باہر ہوئی تھی اور سہاگ رات سے پہلے رخشندہ نے عارف کی صرف تصویر دیکھی تھی۔ عارف قبول صورت تھا۔ عمر اٹھائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ رخشندہ نسبتاً کم عمر تھی۔ وہ اکیسویں سال میں قدم رکھ رہی تھی۔ تاہم تعلیم دونوں کی برابر تھی۔ وہ دونوں ایف ایس سی تھے۔ میکے کی طرح رخشندہ کی سسرال بھی

لاہور ہی میں تھی۔ عارف بجلی کی مصنوعات بنانے والی ایک چھوٹی سی فیکٹری چلاتا تھا۔ اس فیکٹری سے اتنی آمدن ضرور ہو جاتی تھی کہ پانچ افراد پر مشتمل یہ مختصر سا کنبہ سہولت کی زندگی گزار رہا تھا۔

شادی کے آغاز سے ہی رخشندہ کو اس بے پناہ محبت کا احساس ہوا تھا جو عارف کے دل میں اس کے لئے پیدا ہو چکی تھی۔ وہ ایک پل کے لئے بھی رخشندہ سے جدا ہونا گوارا نہیں کر رہا تھا۔ اس نے کئی بار کہا تھا۔ ''رخشی! میرا دل چاہتا ہے' اپنی جان نکال کر تمہارے جسم میں ڈال دوں اور ہم دونوں یک جان ہو جائیں۔ تم اب تک کہاں تھیں۔۔۔۔۔ خدا کی قسم، جو زندگی تمہارے بغیر گزری، رائیگاں گزری ہے۔''

رخشندہ کو معلوم تھا، شادی کے اولین دنوں میں مرد ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔ عارف کے میٹھے رسیلے بول سن کر اس کے دل میں گدگدی تو بہت ہوتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ خود کو یہ بھی یاد دلاتی تھی کہ یہ صورتِ حال مستقل رہنے والی نہیں۔۔۔۔۔ آج عارف نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا انہوں نے ایک دم رخشندہ کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ سہانا خواب ٹوٹنا شروع ہو گیا ہے جو پندرہ بیس روز سے دیکھ رہی تھی۔ عارف نے کوئی بات نہیں کہی تھی، نہ ہی کوئی اشارہ دیا تھا مگر رخشندہ کے اندر بیٹھی ہوئی حساس عورت نے نجانے کیوں اسے سرخ جھنڈی دکھائی تھی۔

اگلے آٹھ دس روز میں یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ سرخ جھنڈی وہم نہیں تھی۔ عارف کے اندر سے بتدریج ایک نیا عارف برآمد ہونے لگا تھا۔ وہ اسے عجیب و غریب سوالات کرنے لگا تھا۔ ان سوالات کا تعلق عموماً رخشندہ کے ماضی سے ہوتا۔ مثلاً وہ کالج کیسے جاتی تھی؟ واپس کیسے آتی تھی؟ ان کے پڑوس میں کون لوگ رہتے تھے؟ اس کے کزن کون کون تھے؟ ان میں سے کون سا کزن ان کے گھر زیادہ آتا جاتا تھا۔ رخشندہ بچی نہیں تھی۔ وہ ان سوالات کے رخ سے بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی کہ عارف کس نہج پر سوچ رہا ہے۔ وہ اس کا ماضی کھنگالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے سوال زیادہ واضح اور اس کی پوچھ گچھ زیادہ سخت ہوتی چلی گئی۔

ایک رات جب وہ کھانا کھا کر کالونی کی پُرسکون سڑک پر گشت کرنے کے لئے نکلے ہوئے تھے، عارف فلسفیانہ انداز میں بولا۔

''لڑکی بارہ سال کے بعد بالغوں کی طرح سوچنا شروع کر دیتی ہے پھر وہ تین سال کے اندر اندر اس کی سوچوں میں کوئی نہ کوئی خوابوں کا شہزادہ گھس آتا ہے۔ ایک آدھ شہزادہ تو تمہارے خوابوں میں بھی گھسا ہوگا؟''

رخشندہ اس سوال پر سن ہو کر رہ گئی تھی پھر اس نے جلدی سے سنبھالا لیا اور ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔ ''یہی بات لڑکوں کے بارے میں بھی تو کہی جا سکتی ہے۔ وہ بھی تو تیرہ چودہ سال کے بعد بالغوں کی طرح سوچنے لگتے ہیں۔''

''یعنی تم اعتراف کر رہی ہو؟''

ہرگز نہیں۔ میں تو آپ کی بات کا جواب دے رہی ہوں۔

ہیرا پھیری والی بات مت کرو۔ وہ ایک دم تیز لہجے میں بولا۔ مجھے میرے سوال کا جواب دو۔

وہ خوفزدہ نظروں سے عارف کا غضب ناک چہرہ دیکھنے لگی۔

عا۔۔۔۔رف! کیا ہوا ہے آپ کو، کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟

اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنے اندرونی غضب کو دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحے بعد وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''آئی ایم سوری رخشی! پتا نہیں میرے منہ سے کیا نکل گیا۔ دراصل کسی وقت میں اچانک غصے میں بول جاتا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''کئی لوگ کہتے ہیں کہ غصے میں کہی ہوئی بات ہی دل کی بات ہوتی ہے۔''

دراصل رخشی۔۔۔۔ میں بہت چاہتا ہوں تمہیں۔۔۔۔ ہر وقت تمہارے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہوں۔ خبر نہیں تم نے کیا کر دیا ہے مجھے۔

اس نے لاڈ سے رخشندہ کو اپنی بانہوں میں لے لیا تھا اور کچھ کہنے سے پہلے اس کے ہونٹوں کو بند کر دیا تھا۔

لیکن صرف ایک روز بعد وہ پھر اسی طرح تلخی سے بولا تھا۔ رخشندہ ایک رسالہ دیکھ رہی تھی۔ عارف فیکٹری سے آیا تھا اور خاموشی سے اس کے عقب میں کھڑا ہو گیا تھا۔ رخشندہ افسانہ پڑھ رہی تھی۔ یکایک عارف کی طنز بھری آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی۔ بڑی دلچسپی سے ہماری بیگم دردناک افسانوں میں۔

''اوہ آپ؟'' وہ چونک کر بولی۔

''کیوں؟ میں نے آ کر سارا طلسم توڑ دیا؟''

''اور نہیں تو کیا''۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

''تو جناب واپس چلے جاتے ہیں ہم۔۔۔۔۔ آپ کھوئی رہیں اپنے رومانی خیالات میں اور۔۔۔۔۔''

''اور کیا؟''

''اور بھولی بسری یادوں کو ٹٹولتی رہیں۔''

''عارف''۔۔۔۔۔ وہ قدرے سنجیدگی سے بولی تھی ''آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں مجھ سے۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے؟''

''اپنی بیوی سمجھتا ہوں۔ ایک شوہر پرست بیوی۔۔۔۔ شوہر کی خوشی کو ہر چیز سے مقدم سمجھنے والی۔۔۔۔ اس کے لئے جینے، مرنے والی۔۔۔ اس کی خاطر ہر غم چپ چاپ سہہ جانے والی''۔۔۔۔ وہ بدستور طنزیہ لہجے میں بولا۔

''میں یہاں کوئی غم نہیں سہہ رہی ہوں''۔ وہ روہانسی آواز میں بولی تھی۔

''شوہر پرست بیویاں ایسے ہی کہا کرتی ہیں لیکن میں جانتا ہوں تم دکھ سہہ رہی ہو۔ کوئی نہ کوئی ہے جس کی یاد تم اپنے ساتھ لائی ہو۔ میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ ایک لڑکی اکیس سال کی عمر تک اپنے آس پاس سے بالکل بے خبر رہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی تمہاری زندگی میں نہ آیا ہو لیکن سوچوں میں تو ضرور آیا ہوگا۔ کسی کو تو پسند کیا ہوگا تم نے۔ کسی کے لئے آہیں بھری ہوں گی۔ بولو۔۔۔ میں غلط کہہ رہا ہوں۔ بولو جواب دو۔''

اس نے رخشندہ کے ریشمی بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے تھے اور جھٹکے سے اس کا چہرہ اوپر اٹھا دیا تھا۔

ان لمحوں میں رخشندہ نے محسوس کیا کہ فرطِ غضب سے عارف کے نقوش بگڑے ہوئے تھے۔ وہ اسے ایک بالکل اجنبی شخص محسوس ہوا۔ خوف کی پھریری رخشندہ کے تن بدن میں دوڑ گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن ایک گولا سا اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ عارف کچھ دیر اسے زہریلی نظروں سے دیکھتا رہا پھر زور سے جھٹک کر باہر نکل گیا۔ وہ صوفے پر گر گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اسی دوران میں رخشندہ کی اکلوتی نند روبی نشست گاہ کی طرف چلی آئی۔ اس

کی آہٹ سن کر رخشندہ نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''ارے بھابی! کیا ہوا آپ کو؟'' وہ چونک کر بولی تھی۔

''کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔بس یونہی۔۔۔۔''

''یونہی کیا؟''

''چوٹ لگ گئی تھی''۔ وہ اپنا پاؤں مسلتے ہوئے بولی۔ ''صوفہ ٹھیک کر رہی تھی۔''

''چوٹ تو کہیں نظر نہیں آتی''۔ روبی غور سے پاؤں دیکھ کر شوخ لہجے میں بولی۔ ''لگ... ہے بھائی جان سے لڑائی ہوئی ہے۔''

رخشندہ منہ پھیر کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

رخشندہ کے ساتھ عارف کا رویہ بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ رخشـ... سے محبت نہیں کرتا تھا۔ وہ بہت محبت کرتا تھا مگر جتنی محبت کرتا تھا اتنا ہی شک بھی کرتا تھا۔ وہ ا... واشگاف الفاظ میں اس سے پوچھتا تھا کہ شادی سے پہلے اس کی نجی زندگی کیسی رہی ہے۔ خا... طور سے اسے رخشندہ کے دو چچازاد بھائیوں پر شک تھا۔ ایک کا نام انیس اور دوسرے کا شا... تھا۔ یہ دونوں کزن لاہور میں ہی رہتے تھے اور رخشندہ کے گھر ان کا آنا جانا بھی تھا۔ عارف ا... دونوں کے حوالے سے سوالات پوچھتا اور بعض اوقات اس کے سوالات رخشندہ کے لئے بڑ... کربناک ثابت ہوتے۔ مثلاً وہ یہ پوچھتا کہ انیس اور شاہد میں سے اس کے نزدیک زیا... خوبصورت کون ہے۔ کس کا قد کاٹھ اچھا ہے، ہنسی مذاق کی باتیں کون زیادہ کرتا ہے۔ ا... دونوں میں سے کس کے ساتھ وہ تنہائی میں زیادہ مرتبہ ملی تھی۔ کبھی کبھی اور زیادہ گہرائی میں جاتا۔ مثلاً ایک موقع پر فرخندہ کے منہ سے نکل گیا کہ پچھلے برس گرمیوں میں اسے انیس... ساتھ اکیلے مری جانا پڑا تھا۔ اہل خانہ چند روز پہلے مری جا چکے تھے۔ وہ اپنی ایک عزیز سہیلی بیماری کی وجہ سے رک گئی تھی۔ بعد میں انیس اسے اپنے ساتھ کار میں لے گیا تھا۔ ا... ''اعتراف'' کے بعد عارف کے ہاتھ ایک زبردست موضوع آ گیا۔ وہ کرید کرید کر رخشـ... سے سوالات پوچھنے لگا، وہ اس کے ساتھ کس سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ کہاں کہاں رکے تھے؟ اگر... میں ڈیک تھا تو انہوں نے کون سے گانے سنے تھے؟ اور اس قسم کے اور بہت سے سوالات۔

رخشندہ کا دوسرا کزن شاہد ڈاکٹر تھا۔ اس کی ڈاکٹری بھی عارف کے دل میں بہت کھٹکتی تھی۔ ایک روز وہ پوچھنے لگا۔ ''کیا شاہد نے کبھی تمہارا علاج کیا؟''

اس سوال نے رخشندہ کو ٹپٹا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اب سوالات کا پنڈورا باکس کھل جائے گا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ وہ بیمار ہوئی تھی اور شاہد روزانہ گھر آ کر اسے دیکھتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے جھوٹ بولا تو عارف کسی نہ کسی طور پر تصدیق کر لے گا۔ لہٰذا اس نے سچ بولنے میں ہی عافیت سمجھی اور اقرار کیا کہ ایک دفعہ ایسا ہوا تھا۔ عارف ایک دم چوکنا ہو گیا اور اس کی آنکھیں دہکنے لگیں۔ بچکانا سوالات شروع ہو گئے۔

''وہ تمہارے جسم کو چھوتا تھا؟''

''جیسے ایک ڈاکٹر چھوتا ہے ویسے ہی چھوتا تھا۔''

''اسٹیتھو اسکوپ لگاتا تھا؟''

''ہاں''

''کہاں رکھتا تھا؟''

''جہاں رکھتے ہیں۔''

''انجکشن کہاں لگاتا تھا؟''

''کبھی بازو پر، کبھی کولہے پر۔''

''سب کے سامنے لگاتا تھا یا اکیلے میں؟''

''سب کے سامنے لگاتا تھا''۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔

''تم نے کسی اچھے ڈاکٹر کو کیوں نہ دکھایا۔ کیوں ایک نوجوان کزن کے سامنے خود کو بے پردہ کیا؟''

''عارف، بس کرو۔ خدا کے لئے بس کرو''۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''مجھے لگتا ہے تم مجھے پاگل کر دو گے اور خود بھی ہو جاؤ گے۔''

وہ دانت پیستا ہوا اور اپنے آپ میں کھولتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ وہ ساری رات خواب گاہ میں اکیلی سسکتی رہی تھی۔

پھر ایک روز تو قیامت ہی آ گئی۔ لاہور ہی میں رخشندہ کے رشتے داروں میں ایک شادی

تھی۔ مہندی کے روز رخشندہ کو وہاں جانا تھا۔ اپنی مصروفیت کے سبب عارف نہیں جا سکا اس نے بمشکل رخشندہ کو اکیلے جانے کی اجازت دے دی۔ شرط یہ تھی کہ رات دس بجے ہر صورت واپس آ جائے گی۔ رخشندہ اپنے چھوٹے بھائی اسد کے ساتھ چلی گئی۔ شومیٔ اسے واپسی میں دیر ہو گئی۔ وہ بہت ڈر رہی تھی کہ عارف ناراض ہوگا اور دل میں دعائیں تھی کہ تقریب جلد ختم ہو جائے۔ جب بارہ بج گئے تو رخشندہ کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ تقر ادھوری چھوڑ کر اپنے بھائی اسد کے ساتھ واپس آ گئی۔ وہ ایک طوفانی رات تھی۔ لاہور کو جل تھل تھے۔ بادل گرج رہے تھے اور ہر گرج کے ساتھ رخشندہ کا دل سہم جا حسب موقع عارف جاگ رہا تھا اور پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ رخشندہ نے اسے بے چینی سے نشست گا ٹہلتے دیکھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی رخشندہ سمجھ گئی کہ آج خیر نہیں۔ جب تک اسد گھ رہا۔ عارف نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ جونہی وہ رخصت ہوا، عارف آ گ ہو گیا۔ اتفاق سے گھر میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ عارف کو کھل کھلا کر غضب ہونے کا موقع مل گیا تھا۔

''اتنی دیر کہاں رہی تم؟'' وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

رخشندہ نے لرزتے کانپتے لہجے میں صفائی پیش کی۔

وہ چنگھاڑ کر بولا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا تم نے وعدہ کیا تھا کہ دس بجے تک ہر صورت آ ؤں گی۔ کون یار تھا تمہارا، جس کے پاس اب تک بیٹھی رہی ہو؟''

رخشندہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ بے رحمی سے بولا۔ ''مجھے رو کر دکھاؤ۔ مجھے بتاؤ، کون کون آیا تھا وہاں؟''

اس کے غضب نے جیسے رخشندہ کو بیمار تر کر رکھا تھا۔ وہ مجبول سی نظر آ رہی تھی۔ ہراساں لہجے میں نام گنوانے لگی کہ کون کون وہاں موجود تھا۔ انیس کا نام سن کر عارف آنکھوں سے نکلنے والے شعلے بلند تر ہو گئے۔ وہ پھنکار کر بولا۔ ''تبھی تو میں سوچتا تھا، اتنی د کیوں ہو رہی ہے وہاں جانے کے لئے۔۔۔ حرامزادی، میری عزت نیلام کرتی پھر رہی ہے۔

ایک زوردار طمانچہ رخشندہ کے گال پر پڑا، اور وہ الٹ کر صوفے پر جا گری۔ فرطِ غضب عارف کے نقوش بگڑ گئے تھے، وہ ایک دم حیوان نظر آنے لگا تھا۔ اس نے رخشندہ پر تھپڑوں اور مکو

بارش کر دی۔ رخشندہ سہارا لینے کی کوشش کرتے ہوئے زمین پر گر پڑی۔ عارف نے اسے بالوں سے پکڑا اور کھینچتا ہوا ایک اندرونی کمرے میں لے آیا۔ یہاں اس بات کا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ رخشندہ کی چیخ پکار کوئی سن لے گا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے وہ ایک بار پھر رخشندہ پر پل پڑا۔ وہ رو رہی تھی۔ دہائی دے رہی تھی، منت سماجت کر رہی تھی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

جب وہ مار مار کر ہانپ گیا تو ایک طرف بیٹھ گیا۔ رخشندہ وہیں فرش پر پڑی اپنی چوٹیں سہلاتی رہی اور ناک سے بہنے والا لہو پونچھتی رہی۔۔۔۔۔ دو گلاس ٹھنڈا پانی پی کر عارف کی آگ قدرے سرد پڑی۔ اس نے رخشندہ کو فرش سے اٹھا کر پلنگ پر بٹھایا۔ اسے ''کاٹن'' دی تا کہ ناک سے بہنے والا خون بند کر سکے پھر اسے پینے کے لئے پانی دیا۔

پانچ دس منٹ میں رخشندہ کی طبیعت قدرے بحال ہوئی تو وہ ایک بار پھر سوال و جواب کرنے لگا۔ ''چلو میں آج مان لیتا ہوں کہ انیس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ بھی مان لیتا ہوں کہ شاید بھی تمہارے سگے بھائیوں کی طرح تھا لیکن یہ بات کسی صورت نہیں مانوں گا کہ تم نے آج تک کسی سے پیار نہیں کیا ہے۔ یہ بات مانی جانے والی ہے ہی نہیں''۔

رخشندہ نے دل میں سوچا۔ ''اگر یہ بات تمہارے نزدیک ''مانی جانے والی'' نہیں تھی تو تم نے شادی ہی کیوں کی تھی''۔

لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اگر کوئی ایسی بات زبان پر لائی تو وہ ایک بار پھر حیوان بن جائے گا اور اسے اٹھا اٹھا کر دیواروں سے پٹخنے لگے گا۔ وہ اس کے قریب سمٹ آیا۔ اس کی ٹھوڑی انگلی سے اٹھا کر بڑے دھیمے لہجے میں بولا۔ دیکھو رخشی! مجھ پر اور خود پر رحم کرو۔ آج مجھے اس کا نام بتا دو، جو مجھ سے پہلے تمہاری زندگی میں موجود تھا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم سچ سچ بتا دو گی تو میں اس معاملے کو بالکل بھول جاؤں گا۔۔۔۔ ہمیشہ کے لئے۔۔۔۔ کبھی ذکر نہیں کروں گا تمہارے سامنے۔

''میں کیا بتاؤں؟'' وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ ''جو چیز تھی ہی نہیں، اس کے وجود کا کیسے اقرار کر لوں۔ پلیز عارف، مجھے میرے عورت ہونے کی ایسی کڑی سزا مت دو۔ پلیز معاف کر دو مجھے۔''

عارف کی آنکھیں ایک بار پھر شعلے اگلنے لگیں۔ وہ چند لمحے خونخوار نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر تیزی سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں موٹر سائیکل کا ایک چین

تھا۔ یہ چین اس نے کسی کوڑے کی طرح ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر اس کے سر پر آن کھڑا ہوا، بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا
"دیکھ رخشی! میں ایک بار کہتا ہوں۔ مجھے سب کچھ صاف صاف کہہ دے۔ تجھ سے بڑھ کر عزیز مجھے دنیا میں اور کوئی نہیں اور میں تیری ہی قسم کھاتا ہوں کہ اس معاملے کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤں گا۔" یہاں تک کہہ کر اس نے ایک ایک لمحے توقف کیا پھر بدلے ہوئے لہجے میں بولا
"لیکن اگر تُو نے آج بھی ہٹ دھرمی دکھائی تو پھر یہ تیری گوری چمڑی سلامت نہیں رہے گی میں مار مار کر حشر کردوں گا تیرا۔ کسی کو صورت دکھانے کے قابل نہیں رہے گی تُو۔" آخری الفاظ کہتے کہتے اس کا لہجہ بے حد خوفناک ہوگیا تھا۔

رخشندہ سسکی اور عاجز لہجے میں بولی۔ "عارف! میں۔۔۔۔ کیا بتاؤں تمہیں۔۔۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں بتانے کو۔"

عارف کا داہنا ہاتھ حرکت میں آیا۔ رخشندہ نے لہراتے ہوئے آہنی چین کی ایک جھلک دیکھی تو پھر اس کی کمر پر کندھوں کے قریب آگ سی لگ گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے آہنی سریا دہکا کر اس کی پسلیوں میں اتار دیا ہے۔ اس کے حلق سے دردناک چیخ نکلی اور طوفان بادوباراں کے شور میں دب گئی۔ چین کی دوسری ضرب رخشندہ کے بازو پر لگی۔ ایک بار پھر دہکتے ہوئے انگارے اس کے جسم میں اتر گئے۔ درد کی شدت سے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ گئی۔ چین کی تیسری ضرب شاید رخشندہ کے چہرے پر لگتی لیکن اس نے یہ وار اپنی دونوں کلائیوں پر روکا۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا، بے رحم چین نے اس کی کلائیوں کا گوشت ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگلی ضرب لگانے کے لئے عارف نے ہاتھ بلند کیا لیکن ضرب لگائی نہیں۔ وہ جیسے رخشندہ کو چند لمحوں کی مہلت دینا چاہ رہا تھا، بے انتہا سرد آواز میں بولا۔ بول بتائے گی یا نہیں۔۔۔۔ بول۔۔۔۔

رخشندہ نے بے انتہا سہمی ہوئی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر اس کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔ اس کا سر اثبات میں ہلتے دیکھ کر عارف کی شعلہ فشاں نگاہوں میں فاتحانہ چمک ابھری اور اس کا چین والا ہاتھ دھیرے دھیرے نیچے آ گیا۔

دوسری طرف رخشندہ ایک کڑی آزمائش سے دوچار تھی۔ جان لیوا اذیت سے بچنے کے

لئے اس نے اپنا سر اثبات میں تو ہلا دیا تھا لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔ وہ حیران تھی کہ وہ عارف کو کیا بتائے۔۔۔۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ اس کا ماضی آئینے کی طرح شفاف تھا۔۔۔ ماں باپ کی عزت کا پاس کرنے والی ایک مشرقی لڑکی کی طرح اس نے اب تک بے داغ زندگی گزاری تھی۔ اس کی ذات کے ساتھ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا اسکینڈل وابستہ نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے۔۔۔۔ بلوغت سے شادی تک اس نے خود اپنی ذات پر سینکڑوں پہرے بٹھا رکھے تھے۔ ان پہروں نے کسی کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔۔۔۔ سکندر کو بھی نہیں۔۔۔ سکندر جوان کا پڑوسی تھا۔۔۔۔ وجیہہ، اونچا لمبا اور چوڑے شانوں والا۔۔۔۔ اس بے چارے کو تو چار برس میں یہ خبر بھی نہیں ہوئی تھی کہ رخشندہ اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ رخشندہ کو اس بات کا اعتراف تھا کہ سکندر اس کے دل کو بھایا تھا۔ سکندر کے لئے اس کے دل میں خوشگوار دھڑکنیں جاگی تھیں لیکن یہ احساس ہمیشہ ایک احساس ہی رہا تھا۔ دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ اس احساس کے نتیجے میں رخشندہ گردن زدنی کیسے ہوسکتی تھی؟ یہی وجہ تھی کہ اس نے ابھی تک عارف کو سکندر کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ یہ کوئی بتانے والی بات ہی نہیں تھی۔ یہ کوئی چار سال پہلے کی بات تھی جب رخشندہ کے پڑوس میں نئے کرائے دار آئے تھے۔ خوش اخلاق و خوش لباس لوگ تھے۔ خاندان کا سربراہ "کارڈیلنگ" کا کام کرتا تھا۔ سکندر اس کے منجھلے بیٹے کا نام تھا۔ ایک مرتبہ رخشندہ کے بڑے بھائی رضوان کی چند دودھ فروشوں سے لڑائی ہوگئی تھی۔ ان کا ریڑھا رضوان کی موٹر سائیکل سے ٹکرا گیا تھا اور وہ سب رضوان پر پل پڑے تھے۔ اسی دوران میں سکندر بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے رضوان کے ساتھ مل کر بڑی دلیری سے "دودھ فروش حضرات" کا مقابلہ کیا اور انہیں پسپا ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح رخشندہ نے بھی یہ لڑائی اپنے گھر کی چھت سے دیکھی تھی۔ اس دن کے بعد سے اس کے دل میں سکندر کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن یہ نرم گوشہ آنے والے دنوں میں نہ کبھی سکڑا اور نہ وسیع ہوا۔ بس جوں کا توں موجود رہا۔ وہ چپکے چپکے سکندر کو دیکھا کرتی اور اس کے لئے دل میں جاگنے والی خوشگوار دھڑکنوں کو محسوس کیا کرتی۔

آج وہ عارف کے ہاتھوں انتہا درجہ مجبور ہوچکی تھی۔ کسی ایسے حوالاتی کی طرح جو تھانے دار کے تشدد سے مجبور ہوکر اپنے چھوٹے سے چھوٹے جرم کا بھی اقرار کرلیتا ہے۔ وہ عارف کو

سکندر کے بارے میں بتانے پر آمادہ ہوگئی۔ شاید اسی بہانے اس کی جان عارف کے غضب سے بچ جاتی۔ وہ وعدہ کر رہا تھا کہ اگر ایک بار وہ سچ بتا دے گی تو وہ اس معاملے پر ہمیشہ کے لئے مٹی ڈال دے گا۔۔۔۔۔

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے عارف کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ میں آہنی چیئر لیے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اوڑھنی سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے وہ بولی۔ عارف! تم جو قسم کہو میں کھانے کو تیار ہوں۔ تمہارے سوا میری زندگی میں اور کوئی نہیں آیا۔''

''پھر وہی بکواس''۔ وہ اتنے زور سے چیخا کہ رخشندہ سرتاپا دہل گئی۔

وہ جلدی سے بولی۔''صرف ایک لڑکا۔۔۔۔سکندر تھا۔ وہ میرے بڑے بھائی جان کا دوست تھا۔ میں تمہارے سامنے۔۔۔۔۔۔ اپنے اس گناہ کا اعتراف کرتی ہوں کہ وہ۔۔۔۔۔شروع شروع میں مجھے اچھا لگتا تھا لیکن خدا گواہ ہے، میں نے کبھی اس سے بات کی نہ کبھی نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک دو دفعہ وہ بھائی جان کے ساتھ ہمارے گھر بھی آیا تھا لیکن میں اس کے سامنے نہیں آئی۔ اس کو آج تک یہ معلوم نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ سوچتی تھی۔ پھر جب تمہارے ساتھ میرے رشتے کی بات چل نکلی تو میرے دل میں اس کا خیال تک نکل گیا۔ اور اب۔۔۔۔۔ اب تو میں اس کے بارے میں سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میرا سب کچھ اب تم ہو عارف! میرے دل و دماغ میں اب تمہارے سوا کوئی داخل ہو نہیں سکتا۔ سر سے پاؤں تک تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔ وہ جذباتی انداز میں اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اپنا سر اس کے گھٹنوں سے ٹکا دیا۔

وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ وہ روتی رہی اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

☆☆☆

رخشندہ کو امید تھی کہ عارف اپنے وعدے کا پاس کرے گا اور رخشندہ کے ماضی کے بارے میں اس کا خطرناک خبط کم ہو جائے گا۔ اسے ہرگز توقع نہ تھی کہ حالات ایک بالکل نیا رخ اختیار کر جائیں گے۔ وہ آغاز بہار کی ایک خوشگوار دوپہر تھی۔ عارف اپنے کام کے سلسلے میں راولپنڈی گیا ہوا تھا اور اسے دو تین روز وہاں رہنا تھا۔ باقی اہل خانہ کو ایک شادی میں شرکت کرنا تھی اور وہ دو ہفتے کے لئے سرگودھا چلے گئے تھے۔ رخشندہ کے بھائی اسد کی بیسویں سالگرہ

آنے والی تھی۔ رخشندہ کئی ماہ سے سوچ رہی تھی کہ بھائی کو کوئی اچھا سا تحفہ دے گی۔ اس نے عارف کو ایک دو بار بازار لے جانے کو کہا تھا لیکن اس نے مصروفیت کا بہانہ بنا دیا تھا۔ اب عارف کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے بازار جانے کی ٹھانی۔ باہر جاتے ہوئے وہ برقع پہنتی تھی۔ ساتھ میں اس نے اس دس بارہ سالہ لڑکی کو لے لیا جو گھر کا کام کرتی تھی۔ بذریعہ رکشا وہ لوگ انارکلی پہنچے اور خریداروں کے ہجوم کا حصہ بن گئے۔ دس پندرہ منٹ بعد اچانک ایک آواز نے رخشندہ کو چونکا دیا۔''اسلام علیکم جی!''

رخشندہ نے دیکھا، اس کے سامنے سکندر کھڑا تھا۔ وہ بھونچکی رہ گئی۔ سکندر ایک دم یوں اس کے سامنے آن کھڑا ہوگا، وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ سکندر پتلون اور بوشرٹ میں تھا۔ آدھی آستینوں میں سے اس کے بھرے بھرے بازو نمایاں نظر آ رہے تھے۔ وہ صورت سے ہتھ چھٹ اور ہنگامہ پسند نظر آ رہا تھا لیکن اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی شائستگی اور دھیما پن تھا۔

رخشندہ نے سکندر کے سلام کا جواب زیر لب بڑبڑا کر دیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اپنائیت سے بولا'' پلیز رخشندہ صاحبہ! میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے صرف چار پانچ منٹ کا وقت دیں۔''

کیا بات کرنی ہے آپ کو؟ رخشندہ ٹھٹکتے ہوئے لہجے میں بولی''مم۔۔۔۔۔۔ میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔''

''کہا ہے نا کہ بہت ضروری بات ہے اور اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے۔ وہ سامنے اسنیک بار ہے۔ آیئے دو منٹ وہاں بیٹھ جاتے ہیں۔ یقین کیجئے، یہ دو منٹ آپ کو بہت فائدہ پہنچائیں گے''۔

''لیکن یہ ٹھیک نہیں، آپ کو جو کہنا ہے امی سے۔۔۔۔۔''

''یہ امی والی بات نہیں ہے۔ کیا آپ دو منٹ کے لئے مجھ پر بھروسا نہیں کر سکتیں۔''

رخشندہ تذبذب میں کھڑی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں انجانے خدشے جاگ اٹھے تھے۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ راہ گیر مڑ مڑ کر انہیں دیکھ رہے ہیں۔ اسنیک بار سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ شیشے کے دروازے سے پار اکا دکا لوگ بیٹھے تھے۔ غیر ارادی طور پر رخشندہ کے قدم دروازے کی طرف اٹھ گئے۔ ملازمہ لڑکی بھی رخشندہ کے ساتھ تھی۔ وہ ایک گوشے میں

الگ تھلگ میز پر جا بیٹھے۔ سکندر نے کچھ منگوانا چاہا لیکن رخشندہ نے صاف انکار کرد
صرف وہ بات جاننا چاہ رہی تھی جس کے لئے سکندر اسے یہاں لایا تھا۔ سکندر نے ملازمہ لڑکی سے
وہ دوسری میز پر بیٹھ جائے۔ رخشندہ کی آنکھوں میں رضامندی دیکھ کر لڑکی کچھ فاصلے پر جا بیٹھی۔

چھوٹی سی تمہید کے بعد سکندر بولا ''عارف صاحب آپ کے شوہر ہیں۔ کوئی بھی عور
پسند نہیں کرتی کہ کوئی اجنبی اس کے شوہر کے خلاف کوئی بات کرے لیکن میں جس نتیجے پ
ہوں وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے شوہر اچھے آدمی نہیں ہیں۔''

رخشندہ کے سینے میں ناگواری کی ایک لہر بلند ہوئی۔ وہ بے حد بیزار لہجے میں

''معاف کیجئے۔ میں نے آپ سے اپنے میاں کے بارے میں رائے طلب نہیں کی۔''

سکندر نے کہا ''مجھے معلوم تھا، آپ کو ناگوار گزرے گا لیکن تفصیل جاننے کے بعد آ
اتنا غصہ نہیں کریں گی۔''

''کیسی تفصیل؟''

سکندر نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے شوہر کو آپ کی شادی پر چ
قبل دیکھا تھا۔ پندرہ بیس دن پہلے ان سے دوسری ملاقات ہوئی ہے۔ وہ ہماری دکان پر آ
تھے۔ مجھے اپنے ساتھ جناح گارڈن لے گئے۔ کہتے تھے، کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔
''ضروری باتیں'' انہوں نے کیں وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھیں۔ سب سے پہلے تو
کی زبان سے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ آپ مجھ سے محبت کرتی تھیں اور چپکے چپکے میرے بار
میں سوچا کرتی تھیں۔ اس کے بعد عارف صاحب نے مجھ سے عجیب و غریب سوالات شرو
کر دیے۔ وہ اس بات کی تہ تک پہنچنا چاہتے تھے کہ میرے اور آپ کے تعلقات کب
شروع ہوئے، کب تک قائم رہے اور یہ تعلقات کہاں تک گہرے تھے۔ میرے ہر انکار او
صفائی کو عارف صاحب نے رد کیا اور اپنی باتوں پر ڈٹے رہے۔ انہوں نے مجھے دھمکایا بھی ا
کئی طرح کا لالچ بھی دیا لیکن جو کچھ میں نے کیا ہی نہیں تھا اس کا اقرار کیسے کر لیتا۔ عارف
صاحب سے میری دوبارہ ملاقات دو روز بعد مال روڈ کے چائنیز ریسٹورنٹ میں ہوئی۔
ملاقات بھی عارف صاحب کی پُر زور خواہش پر ہی تھی۔ وہ ہر صورت میں مجھ سے اقرار کرو
چاہتے تھے ان کا کہنا تھا کہ جب میری بیوی اقرار کر چکی ہے تو تم کیوں اقرار نہیں کر لیتے ہو

انہوں نے اپنے طویل انٹرویو میں بعض ایسے شرمناک سوال بھی کیے جو کوئی بھی نارمل شخص اپنی
بیوی کے حوالے سے نہیں کر سکتا۔ اس طویل انٹرویو کا ہر سوال اس بات کا گواہ ہے کہ عارف
صاحب بے انتہا شکی مزاج اور ناقابلِ اعتبار شخص ہیں بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ عارف صاحب
جیسا شخص ہرگز ہرگز آپ کے قابل نہیں تھا۔

رخشندہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لال پیلی چنگاریاں اڑ
رہی تھیں۔ کبھی تو اس کے دل میں آتا کہ اپنے سامنے کھڑے سکندر کے منہ پر ایک زوردار
طمانچہ رسید کر دے، کبھی دل چاہتا کہ اپنی بدبختی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور روتے روتے
یہیں گر کر مر جائے۔ لیکن وہ ان دونوں کاموں میں سے کوئی کام بھی نہ کر سکی اور اپنی جگہ ساکت
کھڑی رہی۔ ایک میکانکی حرکت کے تحت سکندر کا ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے ایک سفید لفافہ
رخشندہ کی انگلیوں میں تھما دیا ''میں نے اس میں کچھ لکھا ہے۔ یہ آپ اطمینان سے گھر جا کر
پڑھ لیں'' اس کے ساتھ ہی وہ واپس جانے کے لئے مڑ گیا تھا۔

☆☆☆

رخشندہ اپنے بیڈروم میں تھی۔ کھڑکیاں دروازے اندر سے بند تھے۔ اس کے سامنے وہ
دو نیلگوں کاغذ تھے جن پر سکندر کی تحریر تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

''رخشندہ صاحبہ! یہ بات ایک لمحے کے لئے بھی ذہن میں نہ لائیے کہ میری اس تحریر کی
وجہ وہ دو ملاقاتیں ہیں جو آپ کے شوہر نے مجھ سے کی ہیں۔ سچ پوچھیں تو یہ تحریر برسوں سے
میرے دل پر لکھی ہوئی ہے۔ میں ہر روز اسے پڑھتا تھا اور ہر روز سوچتا تھا کہ کاش میں یہ الفاظ
کاغذ پر بھی اتار سکتا اور آپ تک پہنچا سکتا۔ تین ہفتے پہلے جب میں نے آپ کے شوہر کی زبانی
یہ سنا کہ آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں اور میرے بارے میں سوچا کرتی ہیں تو مجھے اچانک یوں لگا
جیسے میرے ان جذبات کو زبان مل گئی ہے جو برسوں سے میرے دل میں ڈرے سہمے بیٹھے تھے
۔۔۔۔ آج میں پوری سچائی اور انتہائی دیانت داری کے ساتھ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں
آپ کو چاہتا ہوں۔ میری اس خاموش اور پُر خلوص اور پُر چاہت کا آغاز انہی دنوں ہو گیا تھا
جب ہم آپ کے محلے میں آئے تھے۔۔۔۔۔ پھر آنے والے ہر دن کے ساتھ یہ محبت پروان
چڑھتی رہی۔ اس کی شاخوں پر خواہشوں اور آرزوؤں کے پھول کھلتے رہے لیکن میں نے کبھی

اس محبت کو کسی پر آشکار نہیں ہونے دیا۔ آپ کے بھائی کا شمار میرے اچھے دوستوں میں ہوتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس رشتے پر کوئی حرف آئے۔ میرے دل میں بڑے بڑے طوفان اٹھتے تھے لیکن میں ان پر قابو پاتا تھا، کئی بار ایسا بھی ہوا کہ میں لاچار ہو گیا۔ کم از کم دو مرتبہ یہ واقعہ ہوا کہ میں نے آپ کے نام تفصیلی خطوط لکھے۔ میں اس موقع کی تلاش میں رہا کہ یہ خطوط آپ تک پہنچا سکوں مگر دونوں دفعہ موقع ملنے سے پیشتر ہی میری ہمت جواب دے گئی۔ معلوم نہیں خدا کو کیا منظور تھا۔۔۔۔۔ یقیناً یہی منظور تھا جو ہوا ہے۔ اوپر والے کے کام نرالے ہوتے ہیں۔ کیا کوئی تصور کر سکتا تھا کہ ایک روز میرے بجائے آپ محبت کا اظہار کریں گی۔۔۔۔۔ اور مجھے اس ''اظہار'' سے آگاہ کرنے والا آپ کا شوہر ہوگا۔''

خط کے آخر میں فیض کے دو شعر تھے جو الوداعی کلمات کے طور پر لکھے تھے ''میں آپ سے پُر خلوص محبت کرتا تھا اور کرتا رہوں گا۔ اگر آپ کو کسی سلسلے میں میری مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتائیں۔ خدا گواہ ہے آپ کے لئے جان بھی دے سکتا ہوں۔''

رخشندہ کتنی ہی دیر خط ہاتھ میں تھامے ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ کیا ہوا تھا؟ اور کیسے ہوا تھا؟ یہ ایک انوکھا اظہار محبت تھا اور اس اظہارِ محبت کا اصل تخلیق کار رخشندہ کا عاقبت نااندیش شوہر تھا۔ وہی شوہر جسے دعوئی تھا کہ وہ رخشندہ سے بے مثال محبت کرتا ہے۔ رخشندہ کو اس بے مثال شوہر پر رہ رہ کر طیش آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اپنی ان گنت چوٹوں کے بدلے میں اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارے اور پھر کبھی اس کی صورت نہ دیکھے۔ اس نے رخشندہ کے سر پر وعدہ کیا تھا کہ اگر رخشندہ ''ماضی'' کے بارے میں اعتراف کرلے گی تو وہ اس معاملے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فراموش کر دے گا لیکن وہ کم ظرف چند ہی روز بعد وعدے سے پھر گیا تھا۔ رخشندہ کے منہ سے سکندر کا نام سننے کے بعد اس نے سکندر سے ملاقات کی تھی اور وہی شرمناک تفتیش شروع کر دی تھی جو وہ اس سے پہلے رخشندہ سے کرتا رہا تھا۔

اگلے پانچ چھ روز رخشندہ نے سخت اذیت میں گزارے۔ اس میں اتنی ہمت ہرگز نہیں تھی کہ اپنے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ سکتی کہ اس نے اپنے وعدے سے انحراف کیوں کیا ہے؟ اس نے کیوں ایک بے نام شک کو اپنی حماقت سے حقیقت کا روپ دے دیا

ہے۔ یہ جو کچھ ہونا تھا، اس کا ذمے دار بھی وہی تھا۔ رخشندہ کے اندر چھپی ہوئی حساس عورت چیخ چیخ کر خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔ یہ عورت کہہ رہی تھی کہ جو بے نام شک، حقیقت کے روپ میں ڈھلا ہے وہ کسی سنگین حقیقت کا روپ بھی دھار سکتا ہے۔

☆☆☆

آٹھ دس روز بعد رخشندہ کو سکندر کی طرف سے ایک اور خط ملا۔ یہ خط سکندر نے دن کے گیارہ بجے کے لگ بھگ گھر کے لیٹر بکس میں ڈالا تھا اور خط ڈالنے کے فوراً بعد رخشندہ کو فون کر دیا تھا کہ وہ بکس میں سے خط نکال لے۔ اہل خانہ ابھی تک سرگودھا سے لوٹے نہیں تھے۔ گھر میں ملازمہ لڑکی اور رخشندہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا پھر بھی کسی کی نگاہ لیٹر بکس تک پہنچ سکتی تھی۔ رخشندہ نے فوراً جا کر بکس میں سے خط نکال لیا تھا۔ وہ خط کو پڑھے بغیر پھاڑ دینا چاہتی تھی مگر بعد ازاں اس نے ارادہ ترک کر دیا تھا۔

اندرونی کمرے میں جا کر اس نے خط پڑھا۔ یہ خط بھی سکندر نے اپنے دلی جذبات کے حوالے سے ہی لکھا تھا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ عارف ہرگز اس کے قابل نہیں، یہ خبطی شخص اس کی زندگی کو جہنم بنا کے رکھ دے گا، ابھی رخشندہ کے پاؤں میں ''بچے'' کی زنجیر نہیں پڑی۔ وہ اہم اور بروقت فیصلہ کر کے اپنی زندگی کو مسلسل عذاب بن جانے سے بچا سکتی ہے۔ اس خط میں اخلاص اور محبت کی جھلک تھی لیکن نہ جانے کیوں رخشندہ اس اخلاص اور محبت کو سراہنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سکندر کو دوٹوک جواب دے گی اور وہ پر کاٹ دے گی جو اسے پرواز پر اکسا رہے ہیں۔ وہ سکندر کو کسی صورت بھی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ وہ اس کی ازدواجی زندگی میں زہر گھولے۔ خط کے ایک گوشے میں سکندر کی دکان کا فون نمبر بھی لکھا تھا۔ رخشندہ اتنی جھنجھلائی ہوئی تھی کہ اس کا ہاتھ فوراً ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے سکندر کے نمبر ڈائل کیے۔ پہلے کسی ملازم لڑکے کی آواز آئی، پھر سکندر بولا۔ ''ہیلو، میں سکندر بول رہا ہوں۔''

''میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں'' وہ قدرے تیز لہجے میں بولی۔

''کون؟ رخشندہ! او گاڈ، مجھے یقین نہیں تھا کہ اتنی جلدی تمہارا فون آئے گا۔''

''میں نے تمہارا خط پڑھا ہے سکندر'' وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں بولی ''تم ایسی باتیں کیوں

لکھ رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک شادی شدہ عورت سے تمھیں ایسی باتیں کرنی چاہئیں۔ اگر ماضی میں ۔ ۔ ۔ ۔ ''

یکا یک رخشندہ لرز اٹھی۔ ساتھ والے کمرے سے دلدوز چیخ ابھری تھی۔ ریسیور رکھ کر آواز کی سمت لپکی۔ یہ آواز یقیناً ملازمہ لڑکی پروین کی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے دہشتناک منظر دیکھا۔ ایک آٹھ فٹ لمبا گوبرا سانپ بستر پر پڑا تھا۔ لڑکی اسی کو دیکھ کر چیخی تھی اور صحن میں بھاگ گئی تھی۔ رخشندہ کی بھی چیخ نکل گئی۔ عین اس وقت عارف کا قہقہہ سنائی دیا اور اس نے ایک گوشے سے برآمد ہو کر رخشندہ کو عقب سے بانہوں میں لے لیا۔

''بڑے خراب ہو تم!'' رخشندہ لال بھبوکا چہرے سے بولی۔

''میں کب کہتا ہوں کہ اچھا ہوں'' عارف اس کے بالوں کی خوشبو سونگھتے ہوئے بولا ''اگر اچھا ہوتا تو ربر کے سانپ کے بجائے اصلی سانپ لیتا اور تمہارے سامنے خود کو ڈسوا لیتا۔''

اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ رخشندہ اس طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی ''اچھا چھوڑ دو مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لڑکی کو دیکھوں، کہیں بے چاری کا ہارٹ فیل ہی نہ ہو گیا ہو۔''

لڑکی کو تسلی تشفی دے کر رخشندہ کمرے میں واپس آ گئی۔ عارف کا موڈ آج خوش گوار تھا۔ ایسا موڈ اس پر کبھی کبھار ہی طاری ہوتا تھا۔ ایسے میں وہ رخشندہ سے ہنسی مذاق بھی کیا کرتا تھا۔ پچھلی دفعہ وہ ایک کھلونا پستول لے آیا تھا۔ سبز رنگ کے ایسے کھلونا پستولوں سے عموماً پانی کی دھار نکلتی ہے۔ عارف نے یہ پستول رخشندہ کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ رخشندہ نے یونہی ٹریگر دبایا تھا لیکن پانی کی دھار نکلنے کے بجائے زوردار دھماکے سے فائر ہوا تھا اور رخشندہ کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ یہ بے ضرر فائر تھا لیکن رخشندہ کے اوسان تو خطا ہو گئے تھے۔ عارف کے ''مذاق'' ایسے ہی اوسان خطا کر دینے والے ہوا کرتے تھے۔

اس نے ربر کا سانپ گود سے نکال کر بستر پر پھینکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پتلون کی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکال کر اس نے رخشندہ کی آنکھوں کے سامنے کھولی۔ اس میں ایک خوبصورت طلائی انگوٹھی تھی۔ انگوٹھی پر ایک چھوٹا سا مونوگرام بنا ہوا تھا لیکن غور سے دیکھنے پر پتا چلتا کہ یہ عارف اور رخشندہ کے نام ہیں۔ خطاطی کے انداز میں دونوں ناموں کے حروف ایک دوسرے میں یوں گڈمڈ کر دیے گئے تھے کہ یک جان دو قالب نظر آتے تھے۔ وہ بولا ''شاید

بھول گئی ہو۔ آج ہماری منگنی کی پہلی سالگرہ ہے۔''

وہ محبت کا اظہار کبھی کبھی کرتا تھا لیکن جب بھی کرتا تھا ایسا ہی شدید کرتا تھا۔ رخشندہ کو اس کی آنکھوں میں محبت کا سمندر موجزن نظر آ رہا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی آنکھیں ہیں جو اس پر شک اور نفرت کے شعلے برساتی ہیں اور یہ وہی نامہرباں ہاتھ ہیں جو اسے آہنی چیمن رسید کرتے ہیں۔ ''چلو آج کہیں باہر کھانا کھاتے ہیں۔''

''جیسے تمہاری مرضی'' رخشندہ نے کہا۔

ملازمہ لڑکی کو چھٹی دینے کے بعد رخشندہ کپڑے بدلنے کے لیے اندرونی کمرے میں چلی گئی۔ وہاں اسے دس پندرہ منٹ لگ گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب تیار ہو کر باہر نکلی تو سارا منظر بدل چکا تھا۔ اس نے عارف کو دیکھا۔ وہ خواب گاہ کے صوفے پر عجیب سے انداز میں بیٹھا تھا۔ اندرونی اضطراب کے سبب اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور آنکھوں کا رنگ سرخ ہو چکا تھا۔ وہی سرخ رنگ جو رخشندہ کا خون پیتا تھا اور اس کے جسم سے جان کشید کرتا تھا۔ چند لمحوں کے لئے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر اس کی نگاہ اس نیلگوں کاغذ پر پڑی جو عارف کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔ یہ سکندر کا خط تھا۔ رخشندہ کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ وہ یہ خط جلدی میں تکیے کے نیچے رکھ گئی تھی۔ کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں تھی، کوئی دلیل، کوئی صفائی یا معافی تلافی یہاں کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔

نفرت اور طیش کے سبب عارف کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے تھے۔ اس نے خطرناک انداز میں اٹھ کر کھڑکیاں اور دروازہ بند کیا پھر اس کے حلق سے ایک زہریلی پھنکار نکلی ''حرام زادی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !''

اس کے ساتھ ہی وہ رخشندہ پر پل پڑا۔ رخشندہ کا نازک جسم جیسے اچانک وزنی ہتھوڑوں کی زد میں آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اڑ رہی تھیں اور وہ خود بھی اڑ اڑ کر دیواروں سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا اور بلا کی رفتار سے اس پر گھونسوں کی بارش کر رہا تھا ''بدکار، بدمعاش عورت، میں آج تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں جان لے لوں گا تیری'' وہ چیخا اور اس نے الماری میں سے اپنا لائسنس یافتہ ریوالور نکال لیا۔

رخشندہ کی دھندلائی ہوئی نگاہوں میں موت ناچ رہی تھی۔ وہ اپنے ذہن کو اس کچھ

ہوئے سیسے کے لئے تیار کرنے لگی جو ایک دھماکے سے اس کے جسم کے کسی حصے میں اترنے والا تھا۔۔۔۔ وہ زمین پر پڑی تھی اور اب شاید اسے کبھی اٹھنا نہیں تھا۔۔۔۔ اچانک زوردار دھماکے سے دروازہ کھلا اور سکندر جست لگا کر اندر آ گیا۔۔۔۔ وہی سکندر جس کے بازوؤں کی مچھلیاں ہر وقت تڑپتی تھیں اور جو ہر آن ہنگامہ خیزی کے لئے تیار رہتا تھا۔

رخشندہ کو اس کی آنکھوں میں عقابی چمک نظر آئی۔ اس سے پہلے کہ عارف صورت حال ادراک کرتا اور اس کا ریوالور کسی سمت میں متحرک ہوتا، سکندر نے جھپٹ کر اس کی کلائی تھام لی۔ دس پندرہ سیکنڈ تک ان دونوں میں زبردست کشمکش ہوئی پھر رخشندہ نے سیاہ ریوالور عارف کے ہاتھ سے فرش پر گرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی عارف اور سکندر گتھم گتھا ہو کر بستر پر پڑے۔ دونوں کی آنکھوں میں حیوانی چمک تھی اور وہ ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے نظر آ رہے تھے۔ رخشندہ کی سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا، اس نے جلدی سے ریوالور اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دیا۔۔۔۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ برآمدے سے صحن اور صحن سے برآمدے تک ناچ کر رہ گئی۔ چند سیکنڈ بعد جب دوبارہ کمرے میں پہنچی تو صورت حال نہایت بھیانک نقشہ پیش کر رہی تھی۔ عارف نے سات آٹھ انچ لمبے پھل کے چاقو سے سکندر پر حملہ کیا تھا۔ چاقو کا پھل پورے کا پورا سکندر کے کندھے میں گھسا ہوا تھا اور عارف اسے واپس کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ ربر کا وہ سانپ جو بستر پر پڑا تھا، عارف کے گلے میں تھا اور سکندر اس سانپ کی مدد سے پوری طاقت کے ساتھ عارف کا گلا کھینچ رہا تھا۔ عارف کا رنگ نیلا ہو چکا تھا اور آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑی تھیں لیکن وہ سکندر کے کندھے سے چاقو نکالنے کی کوشش پھر بھی ترک نہیں کر رہا تھا۔ ان میں سے جو بھی پہلے کامیاب ہوتا، اس کی زندگی بچ جاتی تھی۔ غم کی شدت سے بے قابو ہو کر رخشندہ ان دونوں کو جھنجھوڑنے لگی اور چیخنے لگی۔ ''چھوڑو۔۔۔۔ خدا کے لئے چھوڑ دو۔ خدا کے لئے چھوڑ دو۔''

پھر اتفاقاً کسی ایک کی ٹانگ لگ جانے سے گر گئی تھی۔

چند لمحے بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو بستر پر عارف کی لاش پڑی تھی۔ سانپ ابھی تک اس کے گلے میں تھا۔ یہ ربر کا سانپ تھا، پھر بھی اس کی جان لے گیا تھا۔ خون آلود دستے والا چاقو ابھی تک سکندر کے کندھے میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کی نوک یقیناً کسی ہڈی میں

پھنس گئی تھی۔ سکندر کا رنگ درد کی شدت سے ہلدی ہو رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں دلیری اور حوصلے کی چمک تھی۔۔۔۔ وہ چند لمحے تک رخشندہ کی سکتہ زدہ آنکھوں میں دیکھتا رہا'' پھر اس نے بڑی مضبوطی سے رخشندہ کے دونوں شانے تھام لیے'' آؤ رخشندہ! میرے ساتھ'' وہ طلوع ہوتے سورج جیسی توانا آواز میں بولا۔

''کہاں؟'' رخشندہ کے ہونٹوں سے لرزتی کانپتی ماتم کناں آواز نکلی اور اس کے ہی آنسوؤں کی طویل لڑیاں اس کی پلکوں سے ٹوٹنے لگیں۔

''جہاں میں کہوں'' وہ وجدانی آواز میں بولا تھا۔

اور پھر رخشندہ کا جواب سننے سے پہلے ہی اس نے اسے بازو سے تھام لیا۔ رخشندہ جیسے کسی بھیانک خواب میں تھی۔ اپنی حرکات و سکنات پر اس کا بس نہیں چل رہا تھا پھر بھی کمرے کی دہلیز چھوڑنے سے پہلے اس نے مڑ کر اس شخص کی طرف دیکھا، جو اس کا شوہر تھا۔ جس نے بڑی محنت سے ایک ''شک'' کی پرورش کی تھی اور پھر اس ''شک'' کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔۔۔۔ اس بات میں ذرہ بھر بھی شبہ نہیں تھا کہ اس نے اپنی بدنصیبی کو خود دعوت دی تھی۔

گھر سے باہر وہ سوزوکی کار کھڑی تھی جس میں سکندر یہاں پہنچا تھا۔ سکندر نے اسے کار میں بٹھایا۔ کار نے اپنی جگہ سے جنبش کی۔ پہیہ متحرک ہوا اور پھر یہ حرکت طویل ہوتی چلی گئی۔ وہ وہاں سے سیدھا گجرات گیا جہاں اپنے ایک دوست کے ہاں رک کر اسی کے توسط سے اس نے زخم کی مرہم پٹی کرائی پھر اس کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔۔۔۔۔۔ جہلم، راولپنڈی، پشاور، کوہاٹ۔۔۔۔ اور پھر کرم ایجنسی۔ ایک روز نئے سورج نے انہیں آزاد قبائلی علاقے میں دیکھا۔۔۔۔ یہاں پہاڑ تھے اور پہاڑوں کے اسرار تھے۔۔۔۔ یہاں ان دونوں کے لیے ایک نئی زندگی کا نشان موجود تھا۔۔۔۔ نئی زندگی جو انہیں ماضی کے ہر حادثے کے اثر سے نکال سکتی تھی۔

☆

دردِ عافیت

ڈاکٹر عارفہ کافی خوب صورت تھی۔ بول چال کا انداز بھی بہت اچھا تھا۔ ہنستے ہوئے وہ بہت اچھی لگتی تھی لیکن وہ ہنستی ہی بہت کم تھی۔ اس کی ٹھوڑی پر اگر ایک چھوٹے سے زخم کا نشان نہ ہوتا تو اسے بہ آسانی حسین لڑکی کہا جا سکتا تھا۔ یہ زخم ہلال نما تھا اور صرف اس وقت نظر آتا تھا جب وہ اپنا چہرہ ذرا اوپر اٹھاتی تھی۔ ٹھوڑی سے شروع ہو کر یہ زخم گردن تک چلا گیا تھا۔

ڈاکٹر عارفہ کی ڈیوٹی اکثر آرتھوپیڈک وارڈ میں لگتی تھی اور میری ڈیوٹی اکثر گائنی میں ہوتی تھی۔ یہ دونوں وارڈز پہلو بہ پہلو تھے۔ یوں اکثر ہم دونوں کو مل بیٹھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ جن دنوں رات کی ڈیوٹی ہوتی، ڈاکٹرز روم میں ہمارے درمیان عموماً طویل گپ شپ ہوتی۔۔۔

یوں تو کسی کو جاننے کے لئے ایک عمر بھی ناکافی ہوتی ہے لیکن بہرحال ان ملاقاتوں کے نتیجے میں، میں کسی نہ کسی حد تک عارفہ کو سمجھنے لگی تھی۔ وہ غیر معمولی حد تک سنجیدہ اور روکھی پھیکی لڑکی تھی۔ حقیقت پسندی اس کے مزاج پر یوں حاوی تھی کہ رومانیت کا دور دور سراغ نہیں ملتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ زندگی کے کچھ حسین پہلو بھی ہیں لیکن وہ زندگی کی ناہمواری اور تلخی پر زیادہ نظر رکھتی تھی کیونکہ اس کے نزدیک زمانے میں انہی چیزوں کی بہتات تھی۔۔۔ ساتھی ڈاکٹرز اور مریضوں وغیرہ کے ساتھ عارفہ کا رویہ بے حد سنجیدہ ہوتا تھا۔ وہ ٹو دا پوائنٹ بات کرتی تھی اور بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت موبائل فون پر بات کیا کرتی ہے۔ جہاں عموماً مختصر ترین بات کی جاتی ہے اور ضرورت سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں بولا جاتا۔

پورے اسٹاف میں صرف میں تھی جس کے ساتھ عارفہ کی قدرے بے تکلفی تھی اور یہ میں ہی تھی جو کبھی کبھی عارفہ کو اس کی کسی بات پر ٹوک بھی دیتی تھی۔

ایک دن میں نے کہا ”عارفہ! کبھی کبھی تم مریضوں کے ساتھ کافی بے رخی برتتی ہو۔ کل تمہارے وارڈ میں گھٹنے کے آپریشن والا وہ دیہاتی مریض کئی گھنٹے چیخ پکار کرتا رہا لیکن تم نے اسے پین کلر (SOS) نہیں دی۔ مجھے تو بڑا ترس آ رہا تھا بے چارے پر۔“

”بھئی، اسے پرسوں معدے میں درد کی شکایت ہوئی تھی۔ میں پین کلر AVOID کرنا چاہ رہی تھی۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا ”چلو اسے تو معدے کا درد تھا لیکن میں نے اکثر ایسے ہی دیکھا ہے۔ تم مریضوں کو پین کلر دینے سے کتراتی ہو۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے۔۔۔“ میں کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ وہ اصرار کرنے لگی کہ میں اپنا جملہ مکمل کروں۔ میں نے کہا ”برا نہ ماننا، کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے تم مریضوں کو تنگ کر کے خوش ہوتی ہو۔ ان کا تماشا دیکھتی ہو۔“

یہ بات کسی اور نے کہی ہوتی تو عارفہ اس سے لڑ پڑتی لیکن میری بات وہ کسی نہ کسی طور برداشت کر گئی۔ کچھ دیر گہری سوچ میں کھوئی رہی پھر بولی۔

”میں نے کبھی جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا۔ ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ بندے کو تھوڑی بہت تکلیف برداشت بھی کرنا چاہیے۔ تکلیف جھیلنا ایک فطری عمل ہے جب کہ پین کلر کھانا ایک اکتسابی فعل ہے۔“

میں نے کہا ”کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ ڈاکٹر عارفہ کے اندر ایک سائیکالوجسٹ گھسی بیٹھی ہے۔“

وہ کہیں کھو سی گئی پھر آہستگی سے بولی ”اچھا کبھی تمہیں بتاؤں گی، اس بارے میں بھی۔“

”یعنی کوئی بات ہے اس کے پیچھے۔“

”کس کے پیچھے۔“

”تمہاری اس اذیت پسندی کے پیچھے۔“

”نہیں تم اسے اذیت پسندی تو نہ کہو۔ ہاں ایک رویہ ہے۔“

اس واقعے کے کوئی دو ہفتے بعد ایک روز جب ہم رات کی ڈیوٹی پر تھے اور دونوں وارڈز میں کوئی بھی ”بے آرام“ مریض نہیں تھا ہمارے درمیان پھر اسی موضوع پر بات چھڑ گئی۔ میں نے عارفہ کو یاد دلایا کہ وہ مجھے ایک واقعہ سنانے والی تھی۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک

لگائی اور ماضی کی دھند میں کھوگئی پھر اس نے کہانی سنانے والے انداز میں بولنا شروع کیا۔

''یہ آج سے قریباً چار سال پہلے کی بات ہے۔ میں ہاؤس جاب کر رہی تھی۔۔۔ پروفیسر ڈاکٹر افتخار عثمانی ہمارے شعبے کے انچارج تھے۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ وہ ایک اچھ ڈاکٹر ہونے کے علاوہ ایک بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ سماجی خدمت کے کاموں میں بڑ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ وہ ان دنوں اکثر ایسے پروگرام ترتیب دیتے رہتے تھے کہ ہم میڈیک اسٹاف کے لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر دیہی علاقوں میں چلے جاتے اور عام لوگو طبی معائنہ کرتے۔ خاص طور پر بچوں پر توجہ دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی اسی طرح حفاظتی ٹیکے لگانے کا پروگرام ترتیب دیا جاتا تھا۔

ایک ایسے ہی موقع پر ہم چند ڈاکٹرز لاہور سے ساٹھ ستر میل دور جڑانوالہ کے علا میں پہنچے۔ یہ جولائی اگست کے دن تھے۔ دوسرے تیسرے روز بارش بھی ہو جاتی تھی۔ ہم بار سے بچنے کے انتظامات سے لیس ہو کر آئے تھے۔ چھتریاں، رین کوٹ، فل بوٹ وغ ہمارے پاس تھے لیکن پختہ سڑک سے کم از کم پانچ کلومیٹر دور باغ پور نامی گاؤں کے نزد ہمیں جس آفت نے گھیرا وہ بارش نہیں تھی۔۔۔ مطلع ابر آلود ضرور تھا اور ہلکی ہلکی پھوار بھی رہی تھی لیکن جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ ہمیں کچھ دیہاتی دھان کے کھیتوں میں بھاگتے ا چیخ و پکار کرتے نظر آئے پھر ایک سرپٹ بھاگتے تانگے سوار نے ہمیں بتایا کہ راوی دریا حفاظتی بند ٹوٹ گیا ہے اور پانی کا سیلابی ریلا بڑی تیزی سے اس طرف آ رہا ہے۔۔۔ ہمار اوسان خطا ہو گئے۔ اس قسم کی صورت حال سے کبھی ہمارا پالا نہیں پڑا تھا۔ ہمارے گرو میں تین مرد اور دو لڑکیاں تھیں جن میں ایک میں تھی۔ میری ساتھی کا نام تابندہ تھا وہ خا نازک مزاج واقع ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور اس نے باقاعدہ آ بہانے شروع کر دیے۔ ہم پیدل تھے۔ ہماری جیپ قریباً دو کلومیٹر پیچھے ایک زمیندار کے ڈیرے پر کھڑی تھی۔ ہم نہ آگے جا سکتے تھے، نہ پیچھے دوڑ سکتے تھے پھر ہمیں جلد ہی ایک پرہو گونج سنائی دی۔ یہ سیلابی ریلے کی گونج تھی۔ ہم قدرے نشیب میں تھے۔ یہ سیلابی ریلا خوف ناک تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ بھیانک منظر ابھی تک میرے ذہن میں نقش ہے سرخی مائل پانی کی لہریں تھیں جو نشیب و فراز کو ایک کرتی ہماری طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں

چھوٹے چھوٹے کمزور درخت پانی کی پہلی ہی ضرب سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور کھیتوں کی سبز رنگت پانی کی سرخی میں گم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ہم ایک قدرے بلند جگہ کی طرف بھاگے ۔ کھیتوں کے درمیان یہ ایک قدرتی ٹیلہ سا تھا لیکن ابھی ہم ٹیلے سے سو ڈیڑھ سو گز دور ہی تھے کہ پانی نے کسی عفریت کی طرح ہمیں آ لیا۔ میں جانتی تھی کہ تابندہ کو بالکل تیرنا نہیں آتا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اس کے بعد کچھ پتا نہیں چلا کہ کیا ہوا۔ تابندہ تو اناڑی تھی ہی، میری تیراکی بھی دھری کی دھری رہ گئی۔ سرکش پانی نے ہمیں اٹھایا اور تنکے کی طرح اپنے ساتھ بہانے لگا۔ وہ ایک ڈراؤنا خواب سا تھا۔ اس ڈراؤنے خواب میں مجھے بس ایک ہی بات یاد رہی کہ میں نے تابندہ کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے اور اس کے ساتھ بہتی جا رہی ہوں۔ جب ذرا ہوش آیا تو میں نے خود کو کسی گیلی سطح پر لیٹے پایا۔ میرے چاروں طرف ابھی تک پانی کا شور موجود تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دیکھا، تابندہ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر موجود تھی۔ اس کے لمبے بال ایک جھاڑی میں الجھے ہوئے تھے اور نچلا دھڑ پانی میں تھا۔ وہ بے ہوش تھی۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ تابندہ کے بال جھاڑی سے چھڑائے اور اسے کھینچ کر پانی سے باہر نکالا۔ یہ پختہ اینٹوں کا بنا ہوا ایک چبوترا سا تھا۔ ماہ و سال کی گردش نے اسے خستہ حال کر دیا تھا۔ یہاں دو تین قبروں کے مٹے مٹے نشانات بھی تھے۔ اس شکستہ چبوترے کو چاروں طرف سے جھاڑ جھنکاڑ نے گھیر رکھا تھا۔

میں نے تابندہ کو فوری طور پر طبی امداد دی۔ اس کے پیٹ سے پانی نکالا اور اس کی سانس بحال کی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی پلکوں میں جنبش پیدا ہونے لگی۔ یہی وقت تھا جب مجھے احساس ہوا کہ چبوترے پر ہمارے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے۔ یہ ایک لحیم شحیم شخص تھا۔ چبوترے پر اوندھے منہ پڑا تھا اور ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ اپنے لباس اور حلیے سے وہ مقامی نظر آتا تھا۔ اس کے بال گھونگریالے تھے۔ ایک کان میں چاندی کی چھوٹی سی بالی تھی۔ اس کے سر سے بہنے والا خون ناک تک چندی اینٹوں کو بھگو رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے بائیں کندھے سے بھی خون رس رہا تھا۔

تابندہ ہوش میں آ گئی تھی۔ میں جلدی سے اس شخص کے پاس پہنچی۔ اسے دو تین بار پکارا تو وہ کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اب میں اس کی صورت دیکھ سکتی تھی۔ وہ ستائیس اٹھائیس سال کا تھا۔

جسم بھرا بھرا تھا۔ سینے اور بازوؤں پر کالے سیال بال تھے۔ تنومند گردن اور جبڑوں کی سا
سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مضبوط اعصاب کا مالک اور ایک سخت جان شخص ہے۔ خون اس ۔
سے بہہ رہا تھا لیکن وہ کندھے کی تکلیف کو زیادہ شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ اس نے
داہنے ہاتھ سے کندھے کو تھاما ہوا تھا اور اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔

میں نے پوچھا ''تم کون ہو؟''

وہ کراہتے ہوئے بولا ''ملک امین کے ڈیرے پر کام کرتا ہوں۔''

''یہ چوٹ کیسے لگی؟'' میں نے پوچھا۔

''پانی کا شور سن کر میں ملک کی گھوڑی کھولنے ڈھارے میں گیا تھا۔ ایک دم ساری چ
اوپر آن پڑی۔ لوہے کا گارڈر لگا ہے یہاں سر پر اور کندھے پر بھی۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا

''شکر کرو جان بچ گئی۔'' میں نے کہا۔

''پتا نہیں کیسے پہنچا ہوں یہاں۔ اللہ ہی جانتا ہے۔''

تکلیف سے بے حال ہو کر وہ ایک بار پھر لیٹ گیا۔ بری طرح کراہتے ہوئے بولا '
آپ کون ہیں؟''

میں نے کہا ''ہم دونوں ڈاکٹر ہیں۔ شہر سے یہاں آئی تھیں۔ حفاظتی ٹیکے وغیرہ لگا
کے لئے۔ ہمارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ اللہ کرے وہ بھی خیر خیریت سے ہوں۔''

''اگر تم ڈاکٹر ہو تو میرا کچھ کرو۔ یہ کندھے کی تکلیف میری جان نکال دے گی۔''

میں نے اسے اوندھا لیٹنے کو کہا اور کندھے پر سے اس کی قمیض پھاڑ دی۔ کندھے کے پ
حصے میں گہری چوٹ آئی تھی اور یہ پورا حصہ نیلگوں ہو رہا تھا۔ کٹ لگنے سے تھوڑا سا خون
رس رہا تھا لیکن اصل مسئلہ اندرونی چوٹ کا تھا۔ میں نے کندھے کو ہلایا۔ تو درد نے مضرو
بے حال کر دیا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا اور آنکھیں زور سے میچ لی تھیں۔
اندازہ ہوا کہ کندھے کی پچھلی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ اس کے علاوہ ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ متصا
بالائی پسلیوں پر بھی شدید ضرب آئی تھی۔ سر پر بھی پچھلے حصے میں ہی زخم آیا تھا۔ صاف پتا
تھا کہ یہ دونوں شدید چوٹیں آہنی گارڈر کی ایک ہی ضرب کا نتیجہ ہیں۔

میرے گلے میں ایک اسکارف موجود تھا۔ میں نے اس میں سے چند پٹیاں پھاڑ کر

مضروب کے سر سے بہنے والا خون روکا اور پٹی باندھ دی۔ اس کے بعد ایک پٹی کے ذریعے
میں نے اس کا زخمی بازو گلے میں لٹکا دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ بازو کو کم سے کم حرکت دے
۔۔۔ تابندہ بھی اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ حیرت کی تصویر بنی کبھی میری طرف اور کبھی زخمی کی
طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں نے سفید کوٹ پہن رکھے تھے۔ خوش قسمتی سے میرے کوٹ کی
ایک جیب میں چند دوائیں محفوظ رہی تھیں۔ ایک وائل کے سوا یہ سب کی سب ٹیبلٹس تھیں۔

☆☆☆

اگلے چوبیس گھنٹے ہم نے اس شکستہ چبوترے پر گزار دیے۔ وہ چبوترہ درحقیقت
ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سیلابی پانی کے درمیان عافیت اور سلامتی کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جہاں
ہم تین افراد نے پناہ لے رکھی تھی۔ یہ بالکل ویران جگہ تھی۔ چاروں طرف جہاں تک نگاہ جاتی
تھی، پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ اس پانی میں بس کہیں کہیں درختوں کے بالائی حصے دکھائی دیتے
تھے یا کھیتوں کے درمیان واقع کسی پختہ کوٹھے کی چھت نظر آتی تھی۔ ایسا ایک تنہا کوٹھا ہم سے
قریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ اس کوٹھے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ پانی کی گہرائی دس
گیارہ فٹ سے کم نہیں ہے۔ جس تیسرے شخص نے ہمارے ساتھ اس شکستہ چبوترے پر پناہ لی
تھی اس نے اپنا نام ریاض عرف راجو بتایا تھا۔ وہ درحقیقت ملک امین نامی زمیندار کا گن مین
تھا۔ اس کے علاوہ زمیندار کے کتوں اور گھوڑوں کی رکھوالی وغیرہ بھی کرتا تھا۔ وہ باغ پور گاؤں
میں ہی رہتا تھا۔ باغ پور گاؤں بھی یقیناً پورے کا پورا پانی میں ڈوب چکا تھا تاہم راجو کو اپنے گھر
بار کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ اس کی بیوی اپنے دو بچوں سمیت کئی ماہ سے روٹھ کر میکے میں بیٹھی ہوئی
تھی۔ گھر میں بس بوڑھا والد تھا۔ راجو کو اس کی فکر نہ ہونے کے برابر تھی۔ فی الوقت اگر اسے
کوئی فکر تھی تو وہ اپنے کندھے کی تھی۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں وہ مسلسل درد سے کراہتا رہا تھا۔
شاید پندرہ منٹ کے لئے بھی اسے نیند نہیں آئی تھی۔

ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس چھوٹے سے ویران ''جزیرے'' پر ہمیں کب تک رہنا ہے
اور کیسے رہنا ہے۔ ہزار ہا قسم کے اندیشے گھیرتے چلے جا رہے تھے۔ خاص طور پر تابندہ کی
حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ نازک مزاج اور بڑی حد تک کمزور دل لڑکی تھی۔ کل سے وہ درجنوں
مرتبہ چپکے چپکے رو چکی تھی۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک اہم واقعہ ہوا تھا۔ ہمیں کچھ

فاصلے پر ہیلی کاپٹر کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی تھی۔ اس ہیلی کاپٹر نے باغ پور گاؤں کی جانب
تین چکر لگائے تھے پھر دھیرے دھیرے اس کی آواز معدوم ہوگئی تھی۔ میری اور تابندہ کی یہ
بر نہیں آئی تھی کہ ہیلی کاپٹر اس چبوترے کی طرف سے بھی گزرے گا اور ہم ہاتھ وغیرہ
پائلٹ کو اپنی طرف متوجہ کریں گے۔

آج دوپہر سے ذرا پہلے میں نے کچھ فاصلے پر پانی میں کوئی شے تیرتے ہوئے د
تھی۔ دور سے یہ کوئی تھیلا سا نظر آتا تھا۔ یہ تھیلا پانی کے بہاؤ کے ساتھ دھیرے دھیر
چبوترے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے میں وہ چبوترے کے نزدیک آ گیا۔ اس
حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دس بیس فٹ کی دوری سے گزر جائے گا۔ یہ پولی تھین میں
ہوا ایک پیکٹ تھا۔ یقیناً آج صبح سویرے یہ پیکٹ ہیلی کاپٹر سے گرائے گئے تھے اور ان
سیلاب زدگان کے لئے کھانے پینے کی اشیا تھیں۔ ریاض عرف راجو تو درد سے بے حال پڑ
اور مسلسل کراہ رہا تھا۔ اسے کسی مدد کی توقع نہیں تھی۔ میں نے تابندہ کے ساتھ مل کے ا
جھاڑی سے لمبی شاخ توڑی۔ میں تین چار فٹ تک پانی میں گئی اور شاخ کی مدد سے تھیلا
چبوترے کے قریب کرلیا۔ اس تھیلے میں بھنے ہوئے چنے بسکٹ اور دودھ کے پیکٹ تھے۔
خوراک ہم احتیاط سے استعمال کرتے تو دو تین روز کے لئے کافی تھی۔

وہ سارا دن بھی راجو نے سخت بے چینی کے عالم میں گزارا۔ اس کے کندھے کے درد میں
بالکل افاقہ نہیں ہوا تھا۔ وہ کافی سخت جان شخص تھا اور میرے خیال میں سخت مزاج بھی تھا لیکن
مسلسل درد نے اسے عاجز کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ کسی وقت درد ذرا ہلکا ہوتا تو وہ ہم سے چ
باتیں کرتا ورنہ اپنی ہی تکلیف سے لڑتا رہتا۔ نہ جانے کیوں یہ شخص مجھے زیادہ اچھا نہیں لگا تھا
اس کے چہرے کے خدوخال بتاتے تھے کہ وہ قابل بھروسا شخص نہیں تھا۔ اس ویران چبوترے
پر طاقت کا توازن سراسر اس کے حق میں تھا۔ اگر اس کی نیت میں کسی طرح کا فتور آ جاتا تو ہم
دونوں لڑکیاں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔۔۔ اور میں نے ایک دوبار اس کی آنکھوں
میں حریصانہ چمک لپکتے ہوئے دیکھی بھی تھی۔ ان لمحوں میں وہ مجھے اس "چبوترے کا ساتھی" نظر
نہیں آیا تھا، ایک اجنبی شخص دکھائی دیا تھا۔ نہایت گھنی مونچھوں کے نیچے اس کے بھنچے ہوئے
سیاہی مائل ہونٹوں نے غیرارادی طور پر ایک خاموش دھمکی دی تھی مجھے۔۔۔ اب پتا نہیں یہ میرا

وہم تھا یا حقیقت میں یہ کوئی دھمکی ہی تھی۔

تابندہ کو زخمی راجو پر رہ رہ کر ترس آ رہا تھا۔ میرے کوٹ کی جیب میں جو دوائیں پڑی رہ
گئی تھیں، ان میں کوئی پین کلر نہیں تھی۔ تابندہ کئی بار ان ٹیبلٹس کو کھنگال چکی تھی کہ شاید کوئی ایک
آدھ گولی دردکش دوا کی نکل آئے لیکن اسے مایوسی ہی ہوئی تھی۔ شام کو جب راجو مسلسل
کراہنے لگا تو وہ جھلا کر بولی "عارفہ! کچھ کرو اس کا۔۔۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے۔"

"تم ہی بتاؤ کیا کروں؟" میں نے کہا "اینٹی بائیوٹک گولیاں ہیں وہ دے رہے ہیں اور
کیا کر سکتے ہیں۔"

وہ سٹپٹا کر بولی "مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے دوسری دواؤں کے ساتھ وولٹران
(پین کلر) کے دو پتے بھی لئے تھے۔ اب پتا نہیں وہ تمہارے کوٹ میں ڈالے تھے یا اپنے کوٹ
میں۔"

اپنے ہی میں ڈالے ہوں گے۔ میں نے کہا۔

وہ ایک بار پھر کوٹ کی جیبیں کھنگالنے لگی۔ ایک دم چیخ سنائی دی۔ میں اور تابندہ لپک کر
راجو کی طرف گئیں۔ لیٹنے کی کوشش میں اس کے کندھے کو دھچکا لگا تھا اور اس کے درد میں اضافہ
ہو گیا تھا۔ ہم اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ کندھے کا ورم پہلے سے کم تھا۔ جوڑ میں مومنٹ بھی
موجود تھی مگر درد میں افاقہ نہیں تھا۔ دوپہر کو بسکٹ کا جو ڈبا تابندہ نے راجو کو دیا تھا وہ خالی پڑا
تھا۔ اب اس کے چہرے پر پھر نقاہت نظر آ رہی تھی۔ تابندہ نے اسے بھنے ہوئے چنے دیے۔
وہ چند منٹ میں چبا گیا۔ بعدازاں دودھ کے دو پیکٹ پی کر اس کے چہرے پر تھوڑی سی رونق
نمودار ہوئی۔ اگر اسے درد میں افاقہ ہوتا تو وہ یقیناً گہری نیند سو جاتا لیکن اب تو اونگھ بھی اس کی
قسمت میں نہیں تھی۔

"ڈاکٹر، اتنی ساری دوائیں ہیں تیرے پاس۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو
اس درد کو کم کر سکے۔" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "اگر ہوتی تو ہم تجھ سے چھپا کر رکھتے۔"

وہ بولا "یہ ساری دوائیں تھوڑی تھوڑی مجھے کھلا دو۔ ہوسکتا ہے کوئی کام کر جائے۔"

میں نے کہا "کام تو کوئی نہ کوئی ضرور کرے گی۔۔۔ لیکن الٹا کام کرے گی۔ تم ہمیں

صلواتیں سناؤ گے کہ جو تھوڑا بہت سکون تھا، وہ بھی غارت ہو گیا ہے۔''

''سکون کس بد بخت کو ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔

وہ ساری رات بھی ہم نے کسی مدد کے انتظار میں سوتے جاگتے گزار دی۔ اگلا دن بھی گزر گیا۔ پانی کی سطح ذرا سی نیچی ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ ایک د بار پھر ہیلی کاپٹر کی دور افتادہ آواز سنائی دی تھی پھر ایک مرتبہ باغ پور گاؤں کی جانب موٹر لانچ کے انجن کا مدھم شور سنائی دیا تھا مگر یہ آوازیں ہمارے لئے کوئی ''مدد'' نہیں لا سکی تھیں۔ بارش سے ہمارے لباس بھیگ کر بدن سے چپک گئے تھے۔ راجو کے سامنے جاتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہوتی تھی مگر کچھ بھی تھا، رہنا تو اسی مختصر سے چبوترے پر تھا۔ یہیں اٹھنا بیٹھنا تھا، یہیں لیٹنا تھا، یہیں سونا تھا۔

یہ تیسری رات کا واقعہ ہے۔ میں اپنا سفید کوٹ نیچے بچھا کر لیٹی ہوئی تھی۔ چاروں طرف تاریکی کا راج تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں دور تک ٹھاٹیں مارتے ہوئے پانی کی چمک نظر آتی تھی۔ جھاڑیوں کے پس منظر میں جھینگروں کا شور جیسے خاموشی ہی کا حصہ بن چکا تھا۔ تابندہ میرے قریب ہی سو رہی تھی۔ دس بارہ فٹ کی دوری پر راجو نیم دراز تھا۔ وہ شاید اونگھ رہا تھا لیکن اس حالت میں بھی اس کے گلے سے کراہنے کی آواز ''ہوں ہوں'' کی صورت میں نکل رہی تھی۔

نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے لیٹے لیٹے میں بھی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ میں دیر تک سوئی۔ رات کسی پہر میری آنکھ کھلی۔ چاند کی مدھم روشنی نظر آ رہی تھی۔ تابندہ میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے بال ایک شانے پر آبشار کی طرح گر رہے تھے۔ تابندہ نے ہی میرا شانہ جھنجوڑ کر مجھے جگایا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر ناراضگی کی جھلک تھی۔ ''کیا بات ہے تابندہ۔'' میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''تم نے جھوٹ کیوں بولا؟''

''کیسا جھوٹ؟''

''یہی کہ تمہارے پاس پین کلر نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

تابندہ نے اپنی مٹھی کھولی۔ اس میں درد کش دوا وولٹران کے دو پتے موجود تھے۔ ''یہ میں نے تمہارے کوٹ کی اندر کی جیب سے نکالے ہیں۔'' تابندہ نے کہا۔

میں چند لمحے خاموش رہی پھر چبوترے کی نیم پختہ دیوار سے ٹیک لگا لی ''ہاں میں مانتی ہوں کہ میں نے ان گولیوں کے بارے میں غلط بیانی کی تھی۔''

''لیکن کیوں؟ کیوں تم نے اتنی سنگ دلی کا ثبوت دیا۔ یہ شخص تین دن سے سخت درد میں مبتلا ہے۔ ایک ڈاکٹر ہوتے ہوئے اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم نے اس کی مدد نہیں کی۔''

میں نے کہا ''تابندہ! تم بہت نرم مزاج اور سیدھی سادی لڑکی ہو لیکن یہ دنیا بہت ٹیڑھی ہے۔''

''تم کس ٹیڑھے پن کی بات کر رہی ہو۔''

''میں انسان کے اندر کے ٹیڑھے پن کی بات کر رہی ہوں۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ میں نے تھوڑی بہت نفسیات بھی پڑھی ہے۔ اس رو سے میں کسی بھی اجنبی کو تم سے زیادہ جان سکتی ہوں۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟''

''نفسیات ہمیں بتاتی ہے کہ بعض حالات میں انسانی جبلتیں شدت سے بیدار ہوتی ہیں اور بعض حالات میں وہ نیم جان ہو کر سو جاتی ہیں جیسے خوف میں غصہ نہیں آتا، نفرت میں پیار نہیں ہوتا۔۔۔ میں تمہیں ایک آسان اور حسب حال مثال دیتی ہوں۔ عورت کی طرف مرد کا رجحان ایک جبلت ہے لیکن شدید بھوک اور جسمانی تکلیف کی شکل میں یہ جبلت بیدار نہیں ہوتی۔ ایک بھوک سے نڈھال مرد، حسینہ عالم کو نظر انداز کر کے روکھی سوکھی روٹی میں دلچسپی ظاہر کرے گا۔ اسی طرح جسمانی تکلیف میں مبتلا شخص کے لئے بھی جنس کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ اس کے لئے ایک بے کار چیز ہے۔ بقول کسے، جان ہے تو جہاں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تم میری بات کچھ کچھ سمجھ رہی ہو۔۔۔۔ یہ شخص ہمارے لئے اجنبی ہے لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کچھ زیادہ اچھے کردار کا مالک نہیں۔ اس تنہا مقام پر اگر اس کی نیت میں فتور آ جائے تو ہم دونوں

مل کر بھی اس کی مزاحمت نہیں کر سکتیں لیکن اس کی جسمانی تکلیف نے اس کو زنجیر کر رکھا ہے
اس کی خواہشات درد میں دبی ہوئی ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ اپنی تکلیف کے علاوہ اس کا دھیا
کسی اور طرف جاتا ہی نہیں۔''

ایک لمحے توقف کر کے میں نے کہا ''میں یقین سے کہتی ہوں تابندہ کہ اگر یہ شخص تکلیف
کے شکنجے میں نہ ہوتا تو اس ماحول میں اس کا ذہن اسے ضرور بھٹکا دیتا۔ یہاں ہماری فریاد
والا کون تھا۔ اس کا ایک بھرپور تھپڑ مجھے یا ہمیں بے ہوش کرنے کے لئے کافی تھا۔''

میں نے تابندہ کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ میرے خیالات سے اتفاق کر رہی۔
لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی پریشانی بھی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ میں۔
اسے غور سے دیکھ کر پوچھا ''کیا بات ہے، تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔''

وہ بولی ''اگر تمہاری باتیں درست ہیں تو پھر تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی ہے مجھ سے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے تمہارے سونے کے بعد اسے وولٹران کی دو گولیاں دے دی تھیں۔ وہ ڈھا
تین گھنٹے آرام سے لیٹا رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ پھر دوا مانگ رہا تھا۔ میں نے دو گولیا
مزید کھلا دی ہیں۔'' میں نے وولٹران کے پتے دیکھے۔ تابندہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ایک۔
میں چار گولیاں موجود نہیں تھیں۔

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ راجو کی مسلسل ''ہوں ہوں'' سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مد
چاندنی میں، میں نے غور سے دیکھا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ ایک پتھر سے ٹیک لگائے
دراز تھا۔ تیز اثر دوا نے اسے وقتی طور پر درد سے بالکل بیگانہ کر دیا تھا۔ نہ جانے کیوں پہلی
راجو کو دیکھ کر مجھے اپنے جسم میں پھریری سی محسوس ہوئی۔ بہر طور میں نے اپنا خوف تابندہ پر ظا
نہیں ہونے دیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے تسلی تشفی کی باتیں ہی کرتی رہیں۔ میں نے تابن
سے کہا کہ جو ہو چکا، وہ تو ہو چکا لیکن اب آئندہ ہمیں یہ غلطی نہیں دہرانی چاہیے۔ تابندہ کے
چہرے پر بدستور خوف کے سائے تھے۔ وہ اپنی غلطی کو محسوس کر رہی تھی اور شاید دل ہی دل میں
اپنی ''نرم دلی'' کو کوس بھی رہی تھی۔ موضوع سے دھیان ہٹانے کے لئے میں نے چند ادھ
اُدھر کی باتیں کیں۔ رات کا آخری پہر ابھی باقی تھا۔ میں اور تابندہ لیٹ گئیں۔ تابندہ کی۔

چینی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک طرح کا
خوف خود میرے اپنے دل میں بھی گھر کرتا چلا جا رہا تھا۔

نہ جانے میں کب تک نیم غنودگی کی کیفیت میں رہی۔ غالباً ڈیڑھ گھنٹہ تو اس عالم میں گزرا
ہی ہو گا پھر ایک لرزہ خیز چیخ نے میرا دل دہلا دیا۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ یہ چیخ تابندہ کی تھی۔
میرے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ راجو کسی درندے کی طرح تابندہ سے
چمٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں تابندہ کی مدد کے لئے بڑھی تو اس
نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ میرے چہرے پر رسید کیا۔ میں دور جا گری۔ یہاں درخت کی ایک ٹوٹی
ہوئی لٹھ نما شاخ میرے ہاتھ آ گئی۔ میں نے اس شاخ سے راجو پر حملہ کیا۔ میرا پہلا وار اس
کے سینے پر لگا لیکن دوسرا اس نے بہ آسانی جھک کر بچا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے
صحت مند ہاتھ سے جھٹک دیا اور شاخ میرے ہاتھ سے چھین لی۔ میں اوندھے منہ پختہ
چبوترے پر گری۔ میری ٹھوڑی چبوترے کے کنارے سے ٹکرائی تھی۔ ٹھوڑی کا یہ زخم اسی
بھیانک واقعے کی منحوس یادگار ہے۔ راجو نے لاٹھی نما شاخ سے مجھ پر بے دریغ حملہ کیا۔ وہ
بالکل پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے خود کو بہ مشکل اس کے مہلک وار سے بچایا اور پانی میں چھلانگ لگا
دی۔ ساتھ ساتھ میں تابندہ کو پکار رہی تھی اور اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ بھی پانی میں چھلانگ لگا
دے۔ ان پُرخوف لمحوں میں مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ بے چاری تیر نہیں سکتی۔ میں سرد پانی
میں تیرتی ہوئی چالیس پچاس گز آگے نکل آئی۔ اس وقت مجھے تابندہ کی چیخیں سنائی دیں اور
مجھے معلوم ہوا کہ وہ راجو کے شکنجے میں ہے۔ وہ شخص جو تین دن تک رحم طلب نظروں سے ہمیں
دیکھتا رہا تھا، اپنی تکلیف سے نجات پانے کے پانچ چھ گھنٹے بعد ہی خود ''بے رحم'' بن گیا تھا اور
ایک بالکل مختلف روپ میں سامنے آیا تھا۔ اب تم اسے میری بزدلی کہو، بے حسی کہو یا کمزوری کہ
میں واپس تابندہ کی مدد کو نہ جا سکی۔ اس کی دلدوز چیخیں پانی میں تیر کر مجھ تک پہنچتی رہیں اور میں
اس تنہا کوٹھے کی طرف تیرتی رہی جس کی چھت کا کچھ حصہ پانی میں سے دکھائی دے رہا تھا۔
مجھے نہیں معلوم کہ میں کس طرح اس چھت تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ میرا جسم شل ہو چکا تھا
اور ذہن تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ ٹھوڑی سے بہنے والے خون نے میرے کپڑوں کو رنگین کر
دیا تھا۔ چھت پر پہنچ کر میں نے ہیجانی انداز میں مدد کے لئے چلانا شروع کر دیا لیکن آس پاس

کوئی ہوتا تو پچھلے تین دنوں میں ہمیں نظر کیوں نہ آتا۔ وہاں خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا او
اگر کچھ تھا تو وہ میں سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ایک بے بس لڑکی کی چیخیں تھیں پھر دھیرے دھیر
یہ چیخیں بھی معدوم ہو گئیں۔''

روئداد سناتے سناتے عارفہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے تھوڑی دیر آنسو بہائے پھ
اشکبار لہجے میں بولی'' اگلے روز دوپہر کے وقت ایک موٹر بوٹ میری مدد کو پہنچی۔ اس میں فوج
تھے۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور اپنے مددگاروں کو بتانے لگی کہ ہمارے ساتھ کی
رہا ہے۔

فوجی جوان چبوترے پر پہنچے۔ چبوترہ خالی تھا۔ تاہم قریب ہی پانی میں تابندہ کی لاش
تیرتی ہوئی مل گئی۔ میں وہ منظر ساری زندگی بھول نہ سکوں گی۔ ریاض عرف راجو کو دو گھنٹے بعد
ایک قریبی درخت پر سے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ تیر کر فرار ہونے کی کوشش میں تھا لیکن زخمی کندھے
کی وجہ سے زیادہ دور نہیں جا سکا تھا۔۔۔ بعد ازاں راجو پر آبروریزی اور قتل کا مقدمہ چلا۔ قریب
دو سال بعد اسے پھانسی کی سزا ہوئی اور وہ اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچا۔

اپنی روئداد ختم کر کے عارفہ خاموش ہو گئی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ کمرے
میں اس کی مدھم سسکیاں گونجنے لگیں۔ میں بھی تادیر گم صم بیٹھی رہی پھر آرتھوپیڈک وارڈ میں
موجود کوئی مریض درد سے کراہنے لگا۔ دھیرے دھیرے اس کی آواز بلند ہونے لگی۔ شب کے
سناٹے میں یہ آواز دور تک گونج رہی تھی'' ڈاکٹر صاحبہ! مجھے درد کا انجکشن لگا دیں۔ ڈاکٹر صاحب
خدا کے لئے۔ بہت درد ہو رہا ہے ڈاکٹر صاحبہ۔''

نرس مریض کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ میری طرح وہ بھی جانتی تھی کہ ڈاکٹر
عارفہ اتنی جلدی مریض کی فریاد نہیں سنے گی۔ میں آنسو پونچھ کر تھکے تھکے انداز میں اٹھی اور
مریض کے لئے درد کا انجکشن تیار کرنے لگی۔

☆

ردِعمل

وہ لڑکی نہیں ایک آفت تھی۔ پوری یونیورسٹی میں اس کا چرچا تھا۔ آئے دن اس کے
بارے میں نت نئی کہانیاں سننے کو ملتی تھیں۔ کسی روز پتا چلتا کہ نادیہ کی وجہ سے اس کے دو کلاس
فیلوز میں مار اماری ہوئی ہے اور فائرنگ ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ اگلے روز یہ خبر اڑتی کہ جن دو
لڑکوں میں مار اماری ہوئی تھی ان میں سے ایک نے خودکشی کی نہایت سنجیدہ کوشش کی ہے۔ پھر
کسی دن پتا چلتا کہ ایک لیکچرار صاحب نادیہ کے چکر میں ہیں اور اس کے ساتھ جناح گارڈن
کے ایک سنسان کنج میں راز و نیاز کرتے دیکھے گئے ہیں۔ ابھی یہ اسکینڈل زوروں پر ہوتا کہ
ایک نیا چکر شروع ہو جاتا۔ مثلاً یہ معلوم ہوتا کہ نادیہ کے کسی پرانے شناسا نے رات کو ہوسٹل کی
دیوار پھاندنے کی کوشش کی تھی، چوکی داروں نے اسے پکڑ لیا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ غرض
ہر دن نادیہ کے حوالے سے ایک نئے انکشاف اور نئی خبر کا دن ہوتا تھا۔

یونیورسٹی میں اور بھی ایڈوانس اور رومان پسند لڑکیاں موجود تھیں لیکن نادیہ سب کو پیچھے
بہت پیچھے چھوڑ گئی تھی۔۔۔۔ بے باکی، فیشن پرستی اور ''افیئرز'' میں وہ بلاشک و شبہ نمبر ون
تھی۔ پھر ایک روز اچانک یونیورسٹی میں چمکتی کڑکتی ہوئی یہ بجلی عدیل پر بھی آن گری تھی۔
عدیل یونیورسٹی کے ذہین اور اسمارٹ نوجوانوں میں سے ایک تھا۔ وہ اپلائیڈ سائیکالوجی میں
ایم ایس سی کر رہا تھا۔ سائیکالوجی میں گہری دلچسپی اسے ورثے میں ملی تھی۔ اس کے والد فلسفے
اور نفسیات میں ایم اے تھے اور ان مضامین کے بہترین اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان
کی لکھی ہوئی درسی کتب اسکول و کالج کے طلبہ کے لئے ''رہنما'' کی حیثیت رکھتی تھیں۔ عدیل
اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ وہ والد کے کام کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ نفسیات

میں تحقیق کے شعبے سے اسے خصوصی دلچسپی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نفسیات ایک ایسا علم ہے جس میں انسان کی معلومات ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں ہیں۔

صنفِ مخالف سے عدیل کو کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ یونیورسٹی کے آزاد ماحول میں ہوتے ہوئے بھی وہ ابھی تک ہر قسم کے اسکینڈل سے محفوظ تھا۔ شروع میں ایک دو لڑکیوں نے اس کی طرف پیش قدمی کی کوشش کی تھی لیکن اس نے بہ آسانی یہ کوشش ناکام بنا دی تھی۔ مگر یہ لڑکی -------- یہ لڑکی تو ایک قیامت تھی۔ اس کا حسن، اس کا جادو اور اس کی ہوشربا پیش قدمی یہ سب کچھ عدیل کے لئے قطعی ناقابل مزاحمت ثابت ہوا تھا۔ کچھ بھی تھا، آخر تو وہ گوشت پوست کا پتلا تھا۔ اس گوشت پوست میں ایک جوان دل دھڑکتا تھا اور ایک متاثر ہونے والا ذہن تھا۔

شروعات عجیب طرح سے ہوئی تھی۔ وہ ایک خوش رنگ شام تھی۔ عدیل لڑکوں کے ہوسٹل کے سامنے گراسی گراؤنڈ پر ٹہل رہا تھا اور ساتھ ساتھ ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ دفعتاً اسے سُریلی چیخیں سنائی دیں۔ یہ نادیہ کی چیخیں تھیں۔ وہ اپنی ایک فرینڈ کے ساتھ خرمستی میں مشغول تھی۔ فرینڈ جس کا نام نرگس تھا، نادیہ کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ یقیناً نادیہ نے کوئی شرارت کی تھی۔

نرگس ہر قیمت پر نادیہ کو پکڑنا چاہ رہی تھی۔ نادیہ بچاؤ بچاؤ کی مصنوعی فریاد بلند کر رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے ایک دم رخ موڑا اور عدیل کی پشت سے یوں لپٹ گئی کہ اس کے دونوں بازو عدیل کے سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ نرگس اسے چھڑی سے ضرب لگانے کی کوشش میں تھی۔ نادیہ نے بڑی چالاکی سے عدیل کو اپنی ڈھال بنا لیا تھا۔ وہ عدیل کی پشت سے چمٹی ہوئی تھی اور نرگس جس سمت سے بھی آگے بڑھتی تھی وہ عدیل کو اس رخ پر گھما دیتی تھی۔ اسی دوران میں کہیں سے ایک پیلی بھڑ نمودار ہوئی اور نرگس کے گرد چکرانے لگی۔ نرگس شرارت چھوڑ کر چلاتی ہوئی ہوسٹل کی طرف بھاگ گئی۔ نادیہ اسی طرح عدیل کی پشت سے چپکی ہوئی تھی اور ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھی۔ عدیل نے خود کو اس سے چھڑانے کی کوشش کی، نادیہ اسے چھوڑ کر الگ ہو گئی۔ کچھ دیر تک خاموش مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر لہراتی بل کھاتی ہوسٹل کی طرف چلی گئی۔

رات بھر عدیل کے ذہن میں اس لمس کی نرمی گرمی سمائی رہی جو سرِ شام اس نے اپنی پشت پر محسوس کی تھی۔ وہ کھلکھلاتی ہنسی جس کا ارتعاش ابھی تک اس کی کمر میں گدگدیاں کر رہا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود صبح تک نادیہ کو اپنے ذہن سے جھٹک نہیں سکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ایک دو روز تک وہ اس کے خیال کو جھٹکنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن اگلے ہی روز شام کو اس آفتِ جاں سے پھر ملاقات ہو گئی۔ وہ سرسبز گراؤنڈ میں بیٹھا تھا کہ وہ اس کے پاس آن بیٹھی۔ اس کے پاس ایک ادھوری پینٹنگ تھی۔ یقیناً یہ پینٹنگ نادیہ نے ہی بنائی تھی۔ عدیل نے پینٹنگ دیکھی اور دنگ رہ گیا۔ یہ ایک مکمل عریاں لڑکی تھی۔ جسم کا ہر خد و خال واضح تھا۔ ابھی کچھ رنگ بھرے جانے باقی تھے لیکن ابھی سے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ایک دھماکا خیز پورٹریٹ ہو گی۔

نادیہ بڑی بے باکی سے بولی ''عدیل! یہ ایک ایسی لڑکی کی تصویر ہے جو ایک رات پہلے دلہن بنی ہے۔ شبِ عروسی کی صبح وہ اپنا آپ آئینے میں دیکھ رہی ہے۔ یہ شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔ میں اس نوبیاہتا کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھارنا چاہ رہی ہوں جس میں خوشی کی ہلکی سی لہر کے ساتھ ساتھ غم کی پرچھائیاں بھی ہوں، کچھ کھو دینے کا احساس --- تم ایک سائیکالوجسٹ ہو، اس نفسیاتی کیفیت کو اجاگر کرنے میں میری مدد کر سکتے ہو۔''

وہ قریباً گھنٹا بھر عدیل کے پاس بیٹھی رہی اور بڑی بے باکی سے تصویر کے ظاہری و باطنی محاسن پر گفتگو کرتی رہی۔ ظاہر ہے کہ ایسی ''نامعقول'' گفتگو کے بعد کیا حجاب باقی رہ جانا تھا۔ اس کے بعد ان دونوں کی جو ملاقات بھی ہوئی وہ پہلی سے زیادہ بے تکلف اور بامعنی ثابت ہوئی۔ یہ ایک طوفانی تعلق تھا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر وہ دونوں بے حد قریب آ گئے۔ عدیل جو اپنی شخصیت کے حوالے سے ایک بارعب نوجوان تھا، تنکے سے ہلکا ہو گیا اور نادیہ کے حسن ہوش ربا کی آندھی میں اڑتا چلا گیا۔ پھر ایک رات انتہا ہو گئی۔ نادیہ عدیل کو اپنی ایک سہیلی کے گھر لے گئی۔ اس کی سہیلی بھی اسی قماش کی تھی۔ وہاں دو لڑکیاں اور تین لڑکے موجود تھے۔ بہت ملے گلے والی محفل تھی۔ تیز میوزک بج رہا تھا۔ ''باربی کیو'' کا انتظام تھا، ڈانس ہو رہا تھا اور بیئر چل رہی تھی۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر عدیل کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ جب یہ محفل جوبن پر تھی، نادیہ نے بڑی بے حجابی سے عدیل کی کمر میں بازو ڈالا اور اسے قریباً کھینچتی ہوئی ایک کمرے میں لے گئی۔ اس کے بعد وہ سب کچھ ہوا جس کی عدیل کو توقع نہیں تھی۔ کم از کم یہ توقع تو ہرگز نہیں تھی

کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو جائے گا۔ وہ دونوں جذبات کی رو میں ایک دوسرے کے ا
قریب چلے گئے کہ فاصلے کا تصور ہی ختم ہو گیا۔

عدیل اپنے دوست محسن کو صورتِ حال سے باخبر رکھے ہوئے تھا۔ محسن اس کا کلاس ف
تو نہیں تھا لیکن دونوں ایک ہی ہوسٹل میں رہتے تھے۔ محسن انگلش میں ایم اے کر رہا تھا، فو
گرافی سے اسے خاص شغف تھا۔ عدیل کی طرح محسن بھی اس لڑکی کے عجیب و غریب اطوار
حیرت زدہ تھا۔ ان دونوں کی حیرت دو تین ہفتے بعد مزید بڑھ گئی۔ نادیہ نے جس طرح اچانک
عدیل کی طرف پیش قدمی کی تھی اسی طرح اچانک عدیل سے بے رخی اختیار کر لی۔ دیکھتے
دیکھتے وہ عدیل سے بالکل بے گانہ ہو گئی۔ ان دونوں کا تعلق تین چار ''توبہ شکن'' ملاقاتوں تک
ہی محدود رہا تھا۔ عدیل اور محسن کو معلوم ہوا کہ اب وہ اسٹوڈنٹ یونین کے نومنتخب صدر کے
ساتھ دیکھی جا رہی ہے۔ دونوں کار میں بیٹھ کر نہر کے ساتھ ساتھ دور نکل جاتے ہیں اور ا
شامیں مہکاتے ہیں۔۔۔۔ وہ صحیح معنوں میں ایک پلے گرل ثابت ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ
ایک سوغات کی طرح ہر کسی میں بانٹتی پھر رہی تھی۔ اس کے بارے میں جو خبر بھی ملتی تھی، پہ
سے بڑھ کر سنسنی خیز ہوتی تھی۔

عدیل کچھ روز پریشان رہنے کے بعد اپنے معمولات کی طرف لوٹ آیا تھا۔ وہ رات دا
نادیہ کے بارے میں سوچتا تھا لیکن اب یہ سوچ فلمی نوعیت کی نہیں علمی نوعیت کی تھی۔ وہ شب
روز اپنے طور پر نادیہ کی تحلیل نفسی میں لگا رہتا تھا۔ وہ نادیہ کی نفسیات کی گتھی سلجھانا چاہتا تھا۔ ا
حالات جاننا چاہتا تھا، جن کی وجہ سے نادیہ کا کردار اس عجیب و غریب سانچے میں ڈھلا تھا
عدیل اور محسن اکثر اس بارے میں گفتگو کرتے رہتے تھے۔۔۔۔ ایک روز کیفے ٹیریا میں بیٹھے
بیٹھے پھر یہ موضوع چھڑ گیا۔ عدیل بولا ''نفسیات کی رو سے ہر ''عمل'' ایک ردعمل کا نتیجہ ہوتا ہے
اور ایک ردعمل پیدا کرتا ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ نادیہ کا کردار درحقیقت ایک
ردعمل ہے۔ اب یہ ردعمل کس چیز کا ہے؟ اس کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں۔ بہر حال وہ چ
موجود ہے۔ کوئی نہ کوئی شدید کج روی ایسی ہے جس کے نتیجے میں نادیہ کا کردار اس سانچے میں
ڈھلا ہے۔''

یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا کہ عدیل نے عمل اور ردعمل کا ذکر چھیڑا تھا، اس سے پہلے بھی و

بیسیوں مرتبہ پورے وثوق کے ساتھ یہی بات کہہ چکا تھا۔ وہ اس سلسلے میں بہت سنجیدہ تھا۔
اسے یقین تھا کہ کوشش کی جائے تو وہ وجہ تلاش کی جا سکتی ہے جس کا نتیجہ ایک نہایت آوارہ
مزاج نادیہ کی صورت میں نکلا ہے۔

۔۔۔۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ عدیل ''عمل اور ردعمل'' کی تلاش میں نادیہ کے آبائی
شہر سیالکوٹ جا پہنچا۔ وہ محسن کو بھی بالجبر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہاں ایک قریبی قصبے میں نادیہ
کے والد کی زرعی زمین اور ایک شاندار حویلی تھی۔ نادیہ کے والد عرصہ دراز سے علیل تھے اور
بستر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ آٹھ دس مربع زمین کے سارے معاملات نادیہ کی والدہ کے ہاتھ
میں تھے۔ وہ ایک نہایت بااصول اور دین دار عورت تھیں۔ انہیں لوگ بڑی بی بی کہتے تھے۔
بڑی بی بی نے خوش دلی سے عدیل اور محسن کا استقبال کیا۔ نادیہ نے بذریعہ ٹیلی فون انہیں
عدیل اور محسن کی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ نادیہ نے اپنی والدہ کو بتایا تھا کہ وہ دونوں اس کے
ساتھ پڑھتے ہیں اور یہاں فوٹو گرافی وغیرہ کرنا چاہتے ہیں۔ پروگرام کے مطابق ان کا قیام دو
تین ہفتے کا تھا۔ محسن اپنے ساتھ فوٹو گرافی کا تمام سامان بھی لے کر آیا تھا۔ نادیہ کو بھی ان
دونوں نے یہی بتایا تھا کہ وہ فوٹو گرافی کرنا چاہتے ہیں۔

حویلی میں عدیل اور محسن کے پہلے پانچ چھ روز بڑے خوشگوار رہے۔ وہ سارا دن اس
مضافاتی علاقے میں گھومتے، کھاتے پیتے، رات کو ٹیلی وژن دیکھتے اور پھر سو رہتے۔ محسن فوٹو
گرافی بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کا دل یہاں خوب لگا تھا۔ انہوں نے فوٹو گرافی کا
صرف بہانہ بنایا تھا لیکن اب محسن کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ واقعی فوٹو گرافی کے لئے یہاں آیا
ہے۔ جدھر نظر اٹھتی تھی، کوئی خوبصورت فریم نظر آ جاتا تھا۔ کھیت کھلیان، باغات، نہریں سب
کچھ یہاں موجود تھا۔

عدیل اپنا اصل کام بھی کر رہا تھا۔ وہ اس ٹوہ میں رہتا تھا کہ نادیہ کے ماضی کے حوالے
سے اسے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو جائیں۔ نادیہ کا خاندانی پس منظر جاننے کے لئے
اس نے نادیہ کی والدہ بڑی بی بی سے خاصی بے تکلفی پیدا کر لی تھی اور ان سے گھنٹوں باتیں کرتا
رہتا تھا۔ اس کے علاوہ نادیہ کے چھوٹے بھائی سے بھی وہ کئی ''غیر اعلانیہ'' انٹرویوز کر چکا تھا۔
حویلی کے ملازمین میں سے دو سینئر ملازم خدا بخش اور کرم داد بھی اس کی توجہ کا مرکز تھے۔

پائیں باغ میں ٹہلتے ٹہلتے محسن نے عدیل سے پوچھا ''کیا نتیجہ نکلا تمہاری تحقیق کا؟''

''ابھی تو نہیں نکلا لیکن نکلے گا ضرور۔'' عدیل نے جواب دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ کس قسم کا نتیجہ ہوگا؟''

عدیل نے سگریٹ سلگا کر اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں ''میں اس موقع پر اپنے خیالات کی وضاحت نہیں کر سکتا لیکن مجھے یقین ہے کہ نادیہ کے ماضی میں کوئی نہ کوئی انکشاف انگیز بات ضرور ہوگی جو ابھی تک ہمارے علم میں نہیں۔''

''یار! یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ تمہارے خیال میں وہ کس قسم کی بات ہوگی۔ کچھ آؤٹ لائن تو بتاؤ۔''

عدیل نے پھر گہری سانس لی اور پُر سوچ لہجہ اختیار کیا ''بعض بچوں کے والدین بے حد سخت مزاج ہوتے ہیں۔ اس سخت مزاجی کا اثر بچوں پر پڑتا ہے اور جب وہ جوان ہوتے ہیں تو یہ اثر بے حد نمایاں طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ مثلاً یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض بہت زیادہ مذہبی والدین کی اولاد مذہب سے بیگانگی کا رجحان ظاہر کرتی ہے۔ یا پھر حد سے زیادہ لاڈ پیار کی وجہ سے بچے پر دوررس اثرات مرتب ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال اکثر سب سے چھوٹے بچے یا اکلوتے بچے کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ گھر میں بے راہ روی کا دور دورہ رہتا ہے، بچہ اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتا ہے وہی سب کچھ اس کے کردار کا حصہ بن جاتا ہے۔ لیکن مجھے ابھی تک اس قسم کی کوئی بات اس گھرانے میں دکھائی نہیں دی۔ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ حویلی کا ماحول صاف ستھرا ہے۔''

محسن نے کہا ''نادیہ کے فالج زدہ والد صاحب کو میں نے کل دیکھا تھا۔ ان کی لائف تو بس بستر تک محدود ہو چکی ہے۔''

''ہاں میں بھی ملا تھا ان سے۔'' عدیل نے کہا ''کافی کمزور ہو چکے ہیں۔ وہ بلڈ پریشر کے مریض تھے، اس مرض میں کبھی کبھی اچانک فالج کا حملہ ہو جاتا ہے۔ وقار صاحب (نادیہ کے والد) بھی بھلے چنگے عید کی شاپنگ کے لئے لاہور گئے تھے، وہاں بازار میں ہی ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور اسپتال میں کئی روز زیرِ علاج رہنے کے بعد ایمبولینس میں گھر واپس آئے۔''

محسن نے کہا ''وہ کچھ سخت مزاج نہیں لگتے؟''

''ہاں سخت مزاج تو لگتے ہیں، لیکن ان کی سخت مزاجی کا اثر نادیہ پر کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ چھ سات برس سے مفلوج ہو کر بستر پر پڑے ہیں، اُس وقت نادیہ کی عمر بمشکل تیرہ چودہ سال ہو گی۔ بہر حال اس کا مطلب یہ نہیں کہ نادیہ کے ''ایب نارمل'' ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔۔۔۔ وجہ تو بہر حال موجود ہے''۔

''یار! میں کب جھٹلا رہا ہوں تمہیں؟'' محسن نے بے زاری سے کہا ''ہوگی وجہ ضرور ہو گی لیکن ہم اس وجہ کو ڈھونڈ کر کون سا نوبل پرائز حاصل کر لیں گے، ہزاروں بگڑی تگڑی ''نادیائیں'' اس شہر میں اور شہر شہر میں موجود ہیں۔ ان سب کا ماضی کھنگالنے کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ہم نے۔''

''ہمیں دوسروں سے غرض نہیں۔ نادیہ سے میرا تعلق رہا ہے۔ اس کے بارے میں میرا متجس ہونا فطری عمل ہے۔ اور یہ جو تجس ہوتا ہے اس میں سے کبھی کبھی بہتری کی صورت بھی نکل آتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اگر ہم نادیہ کے لئے کچھ کر سکتے ہیں تو ضرور کرنا چاہیے۔''

''گویا تم کہنا چاہتے ہو کہ اگر تم نادیہ کے بگاڑ کی وجہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے تو اسے ٹھیک بھی کر لو گے۔''

''امکان تو موجود ہے۔''

''سائیکالوجسٹ صاحب! میں آپ کو لکھ کر دے سکتا ہوں کہ آپ جھک مار رہے ہیں۔ آپ کو ناکامی کے سوا کچھ وصول نہیں ہوگا۔''

''خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں پہلے ہم بگاڑ کی بنیاد تو ڈھونڈ لیں۔''

''بگاڑ۔۔۔کی۔۔۔بنیاد۔۔۔۔'' محسن نے فلسفیانہ انداز مین اوپر نیچے سر ہلایا پھر چونک کر بولا ''ہاں یاد آیا، ایک انگلش فلم میں بھی میں نے نادیہ جیسا ایک کردار دیکھا تھا۔ ایک ایسی خوبصورت لڑکی جو حد درجہ آزاد خیال تھی۔ اس نے اپنا نام ہی باغی رکھا ہوا تھا۔ ہر معاشرتی قدر اور پابندی سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اس لڑکی سے نوعمری میں ریپ ہوا تھا۔۔۔۔''

عدیل نے کہا ''اس لائن پر میں نے بھی سوچا ہے۔ گمان کیا جا سکتا ہے کہ ماضی میں نادیہ کے ساتھ بھی اس نوعیت کا کوئی واقعہ ہوا ہے۔ کوئی حادثہ، کوئی سازش۔۔۔ بہر حال ابھی تک

اس حوالے سے بھی میں اندھیرے میں ہی ہوں۔"

"بس تم اندھیرے میں ہی ٹامک ٹوئیاں مارتے رہو گے اور یہ تین ہفتے۔۔۔ تین خوب صورت ہفتے برباد کر کے رکھ دو گے۔ ارے چغد ذرا باہر نکل کر دیکھو اور اس علاقے کے حسن کو محسوس کرو۔ تمہارے دماغ کے سارے کیڑے جھڑ جائیں گے۔ دل میں گلاب ہی گلاب نہ کھل اٹھیں تو میرا نام محسن نہیں۔ تم نادیہ والی کہانی کو لے کر بیٹھے ہوئے ہو۔۔۔ خدا کی قسم یہاں کھیتوں، کھلیانوں میں گھومنے والا ہر بندہ ایک کہانی ہے۔ کچھ دن سے میں ایک عورت کو دیکھ رہا ہوں۔ یقین کرو میں دنگ ہوں۔ میں تمہیں اس سے ملانا چاہتا تھا لیکن تمہیں اپنی تحقیق سے ہی فرصت نہیں۔ کل جب میں وہاں جا رہا تھا، تم خدا بخش کو بغل میں لئے بیٹھے تھے۔"

"کیا خاص بات ہے اس عورت میں؟"

"وہ بتانے کی نہیں دیکھنے کی چیز ہے۔ مزہ آ جائے گا تمہیں اس سے مل کر۔"

"کیا چاند شاند کا ٹکڑا ہے؟"

"بس یہی سمجھو۔"

دوسرے دن جب عدیل مہمان خانے میں کسی اداس الو کی طرح بیٹھا تھا، محسن اسے کھینچ کر باہر لے گیا۔ یہ مارچ کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ دونوں پگڈنڈیوں پر چلتے، کھیتوں سے گزرتے اور کھالوں کو پھلانگتے قصبے سے قریباً دو میل دور نکل آئے۔ یہاں بھی نہایت سرسبز کھیتوں اور باغات کے درمیان ایک حویلی نما عمارت موجود تھی۔ عمارت کے دو حصے تھے۔ ایک تو بالکل کھنڈر ہو چکا تھا، دوسرا نیا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ اسے تعمیر ہوئے دس پندرہ برس سے زائد نہیں گزرے۔ اس نئی عمارت کے پورچ میں ایک جیپ اور کار بھی موجود تھی۔

محسن کے لئے کشش کا باعث عمارت کا پرانا حصہ تھا۔ یہ تقریباً کھنڈر ہو چکا تھا۔ محسن نے مختلف زاویوں سے اس کی تصاویر اتاری تھیں اور ابھی مزید اتارنا چاہتا تھا۔ اسی تصویر کشی کے دوران میں اس کی ملاقات نئی عمارت کے مکینوں سے ہوئی تھی اور اسے وہ عورت نظر آئی تھی جسے دکھانے کے لئے وہ عدیل کو یہاں کھینچ لایا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک عمر رسیدہ شخص کے روبرو بیٹھے تھے۔ ان کا نام عبدالعزیز تھا۔ سر اور چہرے کے بال سفید ہو چکے تھے۔ ان کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا تو مشکل تھا لیکن بظاہر

وہ ساٹھ سال کے لگ بھگ تھے۔ وہی اس عمارت کے مالک تھے۔ وہ عدیل اور محسن کے ساتھ گھر کے وسیع ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ایک دیوار گیر کھڑکی میں سے کوٹھی کا عقبی حصہ نظر آ رہا تھا۔ یہاں دو تین ٹریکٹر اور ویٹ تھریشر وغیرہ موجود تھے۔ اس مشینری سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ صاحب بھی زراعت سے وابستہ ہیں۔ بہر حال چہرے مہرے سے وہ بالکل شہری بلکہ ماڈرن شہری نظر آتے تھے۔

محسن نے کہا "جن خاتون کا میں نے ذکر کیا ہے وہ انکل عزیز کی بڑی ہمشیرہ ہیں۔"

عدیل کا سارا تجسس غارت ہو گیا۔ وہ تو کسی حسین کومل چہرے کی توقع لگائے بیٹھا تھا۔ بہر طور اپنے دلی جذبات چھپا کر وہ شائستہ لہجے میں بولا "انکل عزیز سے مل کر بہت خوشی ہوئی، امید ہے کہ ان کی بہن سے مل کر بھی ہو گی۔"

"لو وہ خود ہی آ گئیں۔" انکل عزیز بولے۔

عدیل نے دیکھا، سفید براق بالوں اور ہم رنگ لباس والی ایک عمر رسیدہ لیکن پیاری سی بڑھیا اندر آ رہی ہیں۔ دونوں نے اٹھ کر آداب پیش کیا۔ انہوں نے خوش خلقی سے جواب دیا۔ ان کی آواز میں لرزش تھی اور آواز ہی میں نہیں یہ لرزش پورے جسم میں تھی۔ وہ رعشے کی مریضہ تھیں۔ ان کا سر مسلسل ہل رہا تھا اور یہی کیفیت ہاتھوں کی تھی۔۔۔۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ محسن نے عدیل کا تعارف کرایا پھر عدیل سے بولا "یہ ہیں ہماری خالہ صفیہ۔ بڑی مہربان اور محبت کرنے والی بزرگ ہیں۔ میں جب بھی انہیں دیکھتا ہوں، لگتا ہے تپتی دوپہر میں سایہ دار درخت کو دیکھ رہا ہوں۔"

"بیٹا، خوب صورتی تو دیکھنے والی آنکھ کے اندر ہوتی ہے۔" معمر خاتون نے لرزاں آواز میں کہا۔

وہ کچھ دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے، پھر وہ بولیں "اچھا بیٹا! میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں۔"

عدیل کا خیال تھا کہ محسن انہیں روکنے کی کوشش کرے گا۔ وہ چائے نہیں پیتا تھا۔ کافی پیتا تھا اور عدیل کافی پیتا تھا نہ چائے۔۔۔۔ مگر محسن نے انہیں روکا نہیں۔

پانچ دس منٹ بعد معمر خاتون از خود چائے کی ٹرالی دھکیلتی اندر داخل ہوئیں۔ عدیل کو کچھ

اچھا نہیں لگا۔ وہ اٹھ کر چائے کی ٹرالی خود تھامنا چاہ رہا تھا لیکن ایک چیز نوٹ کر کے بری طرح چونک گیا۔ معمر خاتون کے ہاتھ پاؤں میں اب رعشے کا شائبہ تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بڑے سکون سے ٹرالی دھکیلتی اندر داخل ہوئیں۔ ٹرالی روک کر وہ صوفے پر بیٹھ گئیں اور نہایت سلیقے سے چائے بنانے لگیں۔ ان کے ہاتھ بڑی خوب صورتی و نفاست سے حرکت کر رہے تھے
''کتنی چینی بیٹا؟'' ان کی چینی سے میٹھی آواز نے عدیل کو چونکایا۔

''ایک چمچ خالہ'' عدیل نے گڑبڑا کر کہا۔

عدیل کے منع کرنے کے باوجود معمر خاتون نے سب کے لئے خود چائے بنائی اور انہیں پیش بھی کی۔ عدیل کو ڈر تھا کہ جب وہ پیالی اٹھا کر عدیل کو تھمانے لگیں گی تو چائے ضرور چھلک جائے گی۔ مگر چائے چھلکنا تو دور کی بات ہے، پلیٹ پر پیالی کی ہلکی سی آہٹ بھی سنائی نہیں دی۔

عدیل نے سوالیہ نظروں سے محسن کو دیکھا۔ محسن کی نگاہ بھید بھری تھی۔ ان سب کو چائے پیش کرنے کے بعد معمر خاتون بیٹھ گئیں۔ وہ خود بھی چائے پینے لگی تھیں۔ عدیل نے ایک بات نوٹ کی اور اس کی حیرت مزید بڑھ گئی۔ چائے پیش کر چکنے کے بعد معمر خاتون پر ایک بار پھر رعشہ طاری ہونے لگا تھا۔ وہی کپکپاہٹ، وہی ناتوانی، بتدریج یہ رعشہ بڑھ کر اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ ان کے لئے چائے پینا ایک دشوار عمل ثابت ہو رہا تھا لیکن وہ چونکہ اس عمل کی عادی تھیں لہٰذا کسی نہ کسی طور یہ کام کر گزریں۔ اس واقعے کے بعد وہ دونوں ڈیڑھ دو گھنٹے تک انکل عبدالعزیز کے پاس بیٹھے۔ ان ڈیڑھ دو گھنٹوں میں معمر خاتون بھی کمرے میں آتی جاتی رہیں۔ وہ رعشہ جو چائے بنانے کے دوران میں دس پندرہ منٹ کے لئے کہیں گم ہو گیا تھا، پھر ان کے پورے وجود کو جکڑ چکا تھا۔

ساتھ والے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ انکل عزیز فون سننے کے لئے دوسرے کمرے میں گئے تو عدیل نے محسن سے پوچھا ''یار یہ کیا ماجرا ہے؟ چائے بناتے وقت خاتون کے ہاتھ پاؤں بالکل درست تھے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے نفسیات کی رو سے۔۔۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ خاتون خود کو جان بوجھ کر رعشہ زدہ ظاہر کر رہی ہیں۔''

عدیل نے کہا ''یہ معاملہ کسی اور کے ساتھ ہوتا تو میں یقیناً کہتا کہ وہ رعشے کا ڈراما کر رہا ہے۔ مگر ان بزرگ خاتون کے بارے میں تو ایسی کوئی بات سوچی نہیں جا سکتی۔''
محسن بولا ''یہی گتھی سلجھانے کے لئے تو میں تمہیں یہاں لایا ہوں ماہر نفسیات صاحب۔''

''کک۔۔۔ کیا مطلب؟ میں سلجھاؤں گا؟''

''ارے گھبرا کیوں گئے۔ ہم نہیں سلجھائیں گے، ہم صرف ماجرا سنیں گے۔ انکل عزیز ہمیں اپنے اور اپنی ہمشیرہ کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ایک نو خیز سائیکالوجسٹ کے لئے یہ ایک اہم گفتگو ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس گفتگو سے ''چائے اور رعشے'' کے تعلق پر بھی کوئی روشنی پڑ سکے۔''

''چائے اور رعشے کا تعلق؟''

''ہاں۔۔۔ جو کچھ تم نے آج دیکھا ہے، میں پانچ چھ مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ جب بھی یہ بزرگ خاتون چائے بناتی ہیں ان کے ہاتھوں بلکہ پورے جسم کا رعشہ ناپید ہو جاتا ہے۔ اور ایسا صرف اور صرف چائے بناتے وقت ہوتا ہے۔ ہے نا حیرت کی بات؟''

''یہ تو کوئی افسانوی سی بات لگتی ہے۔''

''پیارے! میں نے کہا ہے نا کہ دنیا میں ہر طرف کہانیاں بکھری ہوئی ہیں، تم بس ایک کہانی کے پیچھے پڑ جاتے ہو اور مہینوں اسی کے چکر میں گھن چکر بنے رہتے ہو۔''

اسی دوران میں انکل عزیز اندر آ گئے اور انہیں اپنی بات چیت ختم کرنا پڑی۔ لنچ انہوں نے انکل کے ساتھ ہی کیا۔ پھر وہ لوگ چھت پر چلے گئے اور ٹیرس میں کرسیاں ڈلوا کر بیٹھ گئے۔ موسم خوشگوار تھا، مدھم ہوا چلتی تھی تو اپنے ساتھ کھیتوں کھلیانوں کی خوشبو بھی سمیٹ لاتی تھی۔ معمر خاتون قیلولے کے لئے اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ اب ان تینوں کو یکسوئی اور فرصت مہیا تھی۔ خوش پوش ملازم نے ان کے سامنے چائے کے برتن سجا دیے۔ وہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اپنے اصل موضوع کی طرف آ گئے۔

انکل عبدالعزیز نے کہا ''جیسا کہ آپ دونوں کو معلوم ہے صفیہ میری بڑی ہمشیرہ ہیں، میں انہیں بچپن سے صفی آپا کہتا تھا۔ ہماری رہائش ان دنوں سیالکوٹ شہر میں تھی۔ مجھ سے بڑا

ایک اور بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ والد صاحب فوت ہو چکے تھے۔ بڑے بھائی صاحب ایک دفتر میں ملازم تھے اور گھر کا خرچ چلاتے تھے۔ عہدہ اچھا تھا لیکن بڑے بھائی چونکہ ایمان دار تھے لہٰذا مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی۔ میری عمر اس وقت تیرہ چودہ سال تھی جب گھر والوں کو بڑی بہن یعنی صفی آپا کی شادی کی فکر لاحق ہوئی۔ صفی آپا بی اے اچھے نمبروں سے پاس کر چکی تھیں۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی تھیں لیکن بڑے بھائی چونکہ مذہبی ذہن رکھتے تھے اور کچھ تخت گیر بھی تھے لہٰذا انہوں نے صفی آپا کو پڑھنے سے روک دیا اور پردے کا سختی سے پابند کر دیا۔ پڑھائی چھوڑنے کے سال ڈیڑھ سال بعد صفی آپا کے رشتے کی باتیں شروع ہوئیں۔ لوگ صفی آپا کو دیکھنے کے لئے آنے لگے وہ درمیانی شکل وصورت کی تھیں لیکن سلیقہ منداور ذہین تھیں۔ امید تھی کہ جلد ہی ان کا رشتہ طے ہو جائے گا لیکن یہ سلسلہ طول پکڑتا گیا اور جوں جوں طول پکڑتا گیا، گھر والوں میں مایوسی کے آثار نمایاں ہوتے گئے اور اس کے ساتھ ساتھ رشتے کے حوالے سے ان کی عجلت بھی بڑھتی گئی۔ میں ان دنوں ایک کھلنڈرا لڑکا تھا اور گھریلو معاملات کی مجھے زیادہ سمجھ بوجھ نہیں تھی لیکن وہ دن رات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ رشتے کرانے والی ایک مائی اکثر ہمارے گھر کے چکر لگایا کرتی تھی۔ اس کی کوششوں کا نتیجہ یہ تھا کہ مہینے میں دو تین مرتبہ گھر میں تہلکہ مچتا تھا۔ یہ تہلکہ ان مہمانوں کے سلسلے میں ہوتا تھا جو صفی آپا کو دیکھنے کے لئے تشریف لاتے تھے۔ عموماً یہ تہلکہ چھٹی کے روز یعنی اتوار کو برپا ہوتا تھا۔ علی الصبح گھر کی صفائی ہوتی، ہر شے کو قرینے سے رکھا جاتا، پردے درست کیے جاتے پنکھے صاف ہوتے، گھریلو استعمال کی خستہ حال اشیا کو اِدھر اُدھر چھپا دیا جاتا۔ پھر کھانے یا چائے کا اہتمام ہوتا۔ بند کمرے میں والد اور والدہ دیر تک مشورہ کرتے۔ مشورہ یقیناً یہی ہوتا تھا کہ کم سے کم پیسوں میں بہتر سے بہتر تو ضع کیسے کی جاسکتی ہے۔ بڑے بھائی کی تنخواہ سے تو بمشکل مہینہ پورا ہوتا تھا۔ مہمانوں کی آمد سے گھنٹا دو گھنٹا پہلے صفی آپا کو تیار کیا جاتا، اچھے کپڑے پہنائے جاتے، بنایا سنوارا جاتا۔ والدہ اور چھوٹی باجی انہیں مسلسل نصیحتیں کرتی رہتیں۔ دادی اماں تسبیح لے کر بیٹھ جاتیں، بڑے بھائی کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمایاں ہو جاتے، بالکل یوں لگتا جیسے پورا گھرانا ایک امتحان سے گزرنے والا ہے۔ آخر مہمانوں کی آمد ہوتی، میرے ذہن کے پردے پر وہ دھندلی تصویریں اب بھی موجود ہیں۔ چمک دار کپڑوں والی بھاری بھرکم عورتیں ہوتی تھیں۔ اکثر ان

کے چہروں پر شوخ میک اَپ ہوتا تھا۔ ساتھ میں ایک دو ادھیڑ عمر افراد نظر آتے تھے۔ پھر ایک آدھ نوجوان لڑکی بھی ان کے ساتھ ضرور ہوتی تھی۔ یہ لوگ ڈرائنگ روم کی کرسیوں پر براجمان ہو جاتے۔ بالکل یوں لگتا جیسے یہ ڈرائنگ روم کوئی عدالت ہے۔ کرسیوں پر خوش پوش جج حضرات بیٹھے ہیں۔ ابھی ان کے سامنے کوئی ملزم پیش ہونے والا ہے، جس کے گناہ گار یا بے گناہ ہونے کا فیصلہ انہیں کرنا ہے۔ مجھے یہ مناظر ہمیشہ سے بہت گراں گزرتے تھے لیکن دھیرے دھیرے میں ان کا عادی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میں مہمانوں کے درمیان گھومتا۔ ان کی پر تکلف مسکراہٹوں اور اجنبی لہجوں کی تلخی اپنے سینے میں ایک بوجھ کی طرح محسوس کرتا۔ ان موقعوں پر اکثر ایک ہی طرح کی بناوٹی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ایک ہی جیسے سوال و جواب ہوتے تھے۔ جیسے کوئی گھسی پٹی ٹیپ چل رہی ہو۔ پھر صفی آپا اندر آتی تھیں۔ گھبرائی ہوئی اور سمٹی سمٹائی ہوئی۔ ان کے ہاتھوں میں چائے کے برتن ہوتے تھے۔ پیالیاں کھڑ کھڑاتی ہوئی اور قدم ڈگمگاتے ہوئے۔ میں جیسے گھبرا کر سانس روک لیا کرتا تھا، مجھے ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ابھی آپا لڑکھڑا کر گر جائیں گی اور بڑے بھائی کے چہرے پر سجی ہوئی مصنوعی مسکراہٹ ایک درشت تاثر میں ڈھل جائے گی۔ صفی آپا جھک کر ٹرے میز پر رکھتیں، پھر ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کرتیں کبھی ان کی آواز نکلتی تھی، کبھی ہونٹوں میں پھنس کر رہ جاتی تھی۔ مہمانوں میں سے کوئی ادھیڑ عمر عورت صفی آپا کے سر پر ہاتھ پھیرتی اور بازو پکڑ کر انہیں اپنے پاس بٹھا لیتی۔ ہر نظر صفی آپا پر گڑ جاتی، جیسے وہ شوکیس میں سجی ہوئی کوئی شے ہوں جسے خریدنے سے پہلے نگاہوں میں تولا جا رہا ہو۔ یا پھر وہ قربانی کا جانور ہوں جسے مہندی لگائی گئی ہو، سینگوں پر رنگ کیا گیا ہو اور گلے میں نیلے موتیوں کا ہار پہنایا گیا ہو۔ اب وہ جانور سر جھکائے خریداروں کے سامنے کھڑا ہو۔

کچھ ہی دیر بعد لرزتی کانپتی صفی آپا اٹھ کر چلی جاتی تھیں۔ والدہ اور بڑے بھائی مہمانوں سے گفتگو میں لگے ہوتے تھے۔ یہ بڑا نازک وقت ہوتا تھا۔ تمام اہل خانہ مہمانوں کے چہروں سے ان کی مرضی پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر مہمان بھی ایک کائیاں ہوتے تھے۔ فوری طور پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔۔۔ ہاں رخصت کے وقت ان کی باتوں سے تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا تھا اور یہ اندازہ اکثر ناخوشگوار ہی ہوتا تھا۔ والدہ کے چہرے پر مایوسی دوڑ جاتی تھی۔ بڑے بھائی بھی ایک دم بجھے بجھے سے نظر آنے لگتے تھے۔

مہمانوں کے جانے کے بعد گھر میں سوگواری اپنے پر پھیلا لیتی تھی۔ بڑے بھائی صا
گم صم ہو کر اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ والدہ کے ہونٹ اکثر بڑبڑانے والے ا
میں ہلتے دکھائی دیتے تھے۔ ایسے موقعوں پر میں نے اکثر صفی آپا کی آنکھیں سرخ اور م
دیکھیں۔ چھوٹی باجی دل جوئی کے لئے ان کے ساتھ لگی رہتیں مگر ان کی دل جوئی گھر کی سو
فضا کو بدلنے میں قطعی ناکام رہتی تھی۔ یہ منظر آج تک میری نگاہوں میں روز اول کی ط
تازہ ہے اور احساس میں کانٹے چبھوتا رہتا ہے۔ صفی آپا کو دیکھنے والے مہمان ہمارے
میں مایوسی کا چھڑکاؤ کر کے واپس جا چکے تھے۔ والدہ اور صفی آپا تھکی ہاری سی برتن سمیٹ
تھیں۔ مٹھائی کی ایک پلیٹ صفی آپا کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی۔ والدہ کا چہرہ غصے سے تمتما
ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا" تیرے ہاتھوں میں تو سوراخ ہیں۔ توڑ دے، سارے گھر
برتن توڑ دے۔ منحوس کہیں کی۔"

صفی آپا نے سر جھکایا تھا اور روتی ہوئی کمرے میں گھس گئی تھیں "منحوس کہیں کی" یہ الف
جیسے پورے گھر میں گونج رہے تھے اور میرے سینے کو تیروں کی طرح چھلنی کر رہے تھے۔
ساری رات جاگتا رہا تھا۔ والدہ نے یہ الفاظ کسی اور موقع پر کہے ہوتے تو شاید مجھے اتنا
دکھ نہ ہوتا لیکن انہوں نے یہ الفاظ مہمانوں کی واپسی کے فوراً بعد کہے تھے۔ میں ساری
سوچتا رہا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ یہ مہمان ہمارے گھر کیوں آتے ہیں اور کیوں ہمیں
چھوڑ جاتے ہیں۔ آج دوپہر والدہ اور چھوٹی باجی کتنے چاؤ سے صفی آپا کو تیار کر رہی تھیں
کے ماتھے پر بوسے دے رہی تھیں لیکن مہمانوں کے جانے کے بعد والدہ کس قدر بددل
تھیں انہوں نے صفی آپا کو بے طرح جھڑکا تھا اور منحوس کا لقب دے ڈالا تھا۔

اس واقعے کے بعد والدہ بڑی آزردہ ہوئی تھیں۔ دوسرے دن انہوں نے صفی آپا کو
ساتھ لپٹا کر بے تحاشا پیار کیا تھا اور دیر تک آنسو بہاتی رہی تھیں۔ اس روز شام کو میں نے
اور بڑے بھائی کو صفی آپا کے بارے میں باتیں کرتے سنا تھا۔ والدہ کہہ رہی تھیں" بڑی
ہے۔ رنگت دیکھو کیسے پیلی پیلی رہتی ہے۔ ذرا سی بات پر تو ڈر جاتی ہے۔ کل شام پلیٹ
آج صبح سے اتنا ڈری ہوئی ہے کہ دو برتن اور توڑ چکی ہے۔"

"بس آپ کا بے جا لاڈ پیار ہے اور کیا ہے۔ بعض بچوں کو ضرورت سے زیادہ تو

جائے تو ان میں حالات کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رہتی۔ اب دیکھیں آپ! مہمانوں سے
ایسے خوف کھاتی ہے جیسے وہ ہوا ہوں۔ ان کی آمد کا سن کر ہی لرزے کا بخار چڑھ جاتا ہے اسے۔
امی جان، یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں ہے۔ لڑکیوں کے رشتے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں، لوگ
دیکھنے کے لئے آیا ہی کرتے ہیں۔"

والدہ نے کہا" تم اسے کسی ڈاکٹر کو دکھا دو، روز بہ روز کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ کل کو
۔۔۔ گھر گرہستی کا بوجھ کیسے اٹھائے گی۔"

"امی جان آپ کو پتا ہی ہے کہ گھر کا خرچ کیسے چل رہا ہے۔"

"بیٹے! یہ بھی تو ہماری ذمے داری ہے۔ تم جانتے ہی ہو اللہ بخشے تمہارے ابا کتنا خیال
رکھتے تھے اس کا۔۔۔ اب تم ان کی جگہ ہو۔۔۔ یہ لڑکیاں مہمانوں کی طرح ہوتی ہیں بیٹا۔ ان
کے دل بڑے نازک ہوتے ہیں، ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اگر اس کے دل میں ایک
بار بھی یہ خیال آیا کہ بھائی نے باپ جیسا سلوک نہیں کیا تو ہم گناہگار ہوں گے۔"

"آپ کو تو امی! صفیہ کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اصل خرابی یہی ہے کہ۔۔۔ آپ اس
پر ضرورت سے زیادہ توجہ دیتی ہیں۔۔۔۔"

اس روز بڑے بھائی اور امی میں صفیہ آپا کے متعلق دیر تک بات ہوتی رہی، میں ساتھ
والے کمرے میں سنتا رہا۔ اس روز کی باتوں سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن دنوں صفی آپا کالج
میں پڑھتی تھیں، ایک لڑکا انہیں پسند کرنے لگا تھا۔ وہ اچھے گھرانے کا شریف لڑکا تھا اور آپا سے
شادی کا خواہش مند تھا، لیکن بڑے بھائی کو وہ لڑکا پسند نہ آیا اور نہ ہی یہ بات پسند آئی کہ صفی آپا
کی شادی اس انداز سے ہو۔ صفی آپا کے کالج چھوڑنے کے بعد وہ معاملہ اب یکسر ختم ہو چکا تھا
لیکن بڑے بھائی کے ذہن میں اس کی کسک اب تک موجود تھی اور وہ وقتاً فوقتاً والدہ کو یہ بات
جتاتے رہتے تھے (بعد ازاں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس لڑکے کی شادی ایک انگلش لڑکی سے
ہوگئی تھی) مہمانوں کا آنا جانا جاری تھا لیکن اب ان کی آمد میں وقفے آنے لگے تھے۔ شاید اس
کی وجہ یہ تھی کہ صفی آپا اب چوبیس پچیس سال کی ہو چکی تھیں۔ ان کی صحت بھی پہلے سے کمزور
تھی۔ سرخ و سفید رنگ سانولا گیا تھا اور وہ کچھ دھان پان سی ہو گئی تھیں۔ اگر کسی وقت کچھ لوگ
صفی آپا کو دیکھنے آتے تھے تو صفی آپا کی صحت کچھ اور بھی ابتر نظر آنے لگتی تھی۔ کوئی جیسے ان کے

جسم کا سارا لہو نچوڑ لیتا تھا۔ صفی آپا کے لئے سب سے مشکل مرحلہ مہمانوں کے سامنے پیش ہونے
اور ان کے لئے چائے بنانا ہوتا تھا۔ چائے بناتے ہوئے پیالیاں کھڑ کھڑ بجتیں، صفی آپا کے
ہاتھ لرزتے، کبھی چینی گر جاتی، کبھی دودھ الٹ جاتا۔ صفی آپا خود کو جتنا سنبھالنے کی کوشش کرتیں
اتنا ہی بوکھلاتی چلی جاتیں۔ ایسے موقعوں پر والدہ یا چھوٹی باجی آگے بڑھتیں اور بڑی
سے چائے بنانے کی ذمے داری اپنے اوپر لے لیتیں۔ کبھی کسی مہمان خاتون کو ہی ترس آتا
اور وہ صفی آپا کو پیچھے ہٹا کر چائے خود بنانے لگتیں۔ ایک ایسے ہی موقع پر جب صفی آپا کی جگہ
چھوٹی باجی چائے خود بنانے لگی تھیں۔۔۔۔ چھوٹی باجی کی شادی ہوگئی۔ وہ لوگ جو صفی آپا کو
دیکھنے آئے تھے، چھوٹی باجی کو پسند کر گئے۔ گھر والوں نے بہت کہا کہ وہ پہلے بڑی بیٹی کے فرض
سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں لیکن زور آوروں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ یہ سوچ کر کہ
چھوٹی باجی کے لئے بھی ایسے ہی پاپڑ نہ بیلنے پڑیں، گھر والوں نے چھوٹی باجی کا رشتہ منظور کر لیا
اور وہ جو صفی آپا کے غم میں دبلی ہو رہی تھیں، صفی آپا کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنے شوہر کے ساتھ
سدھار گئیں۔

اس واقعے کا صفی آپا پر بہت گہرا اثر ہوا، قریباً ایک سال تک وہ بیمار رہیں۔ انہیں دماغ کی
سوزش ہوگئی تھی۔ ایک آپریشن کے بعد ان کی حالت کچھ سنبھل گئی لیکن صحت بحال ہوتے
ہوتے قریباً ایک برس اور لگ گیا۔ اب وہ ستائیس برس سے اوپر کی ہو چکی تھیں۔ ان کے جسم پر
ہلکا سا لرزہ طاری رہنے لگا تھا۔ چیزیں اکثر ان کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جاتی تھیں، خاص طور
سے چائے بناتے ہوئے تو ان کے ہاتھ بے طرح کانپتے تھے۔ ان کی صحت یابی کے بعد دو
بار لوگ انہیں دیکھنے کے لئے آئے۔ وہ ان کے سامنے دہشت زدہ سی بیٹھی رہیں۔ ان کی
ناکامی اب واضح الفاظ میں ان کے چہرے پر لکھی رہتی تھی۔ چائے بنانا تو دور کی بات ہے
وہ مہمانوں کے سامنے چائے پینے سے بھی کتراتی تھیں۔ ایک دو مرتبہ اگر انہوں نے چائے
پینے کی کوشش کی تو پیالی ان کے ہاتھوں میں کھڑ کھڑ بج اٹھی۔

دھیرے دھیرے صفی آپا کی عمر ڈھلتی گئی۔ وہ اپنے آپ میں سمٹتی چلی گئیں۔ رشتے آنے
بند ہو چکے تھے۔ صفی آپا ایم اے میں داخلہ لینا چاہتی تھیں۔ والدہ کی منت سماجت کے بعد
بڑے بھائی نے پرائیویٹ ایم اے کرنے کی اجازت دی لیکن وہ بھی اس شرط کے ساتھ

انگلش یا اردو نہیں لیں گی۔ ان کا خیال تھا کہ ان مضامین میں طلبہ کو غیر شائستہ مواد پڑھنا پڑتا
تھا۔۔۔ صفی آپا نے پہلے عمرانیات پھر اسلامیات اور پھر عربی میں ایم اے کیا۔ اسی دوران میں
میری بھی شادی ہوگئی۔ پھر مجھے اپنی بیوی کے ساتھ لیبیا جانا پڑ گیا۔ میں وہاں قریباً پندرہ برس
رہا۔ اس دوران میں کئی اہم وقعات ہوئے، والدہ صاحبہ وفات پا گئیں۔ گاؤں میں ہماری
زمینوں کا ایک مقدمہ کافی عرصے سے چل رہا تھا۔ اس مقدمے کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگیا
اور ہم دونوں بھائیوں کو قریباً تیس مربعے زرعی اراضی ملی۔ دونوں بہنوں کا حصہ نکال کر بھی
ہمارے حصے میں کافی زمین آگئی۔ میں نے اپنی زمین آباد کرنے کا فیصلہ کیا اور لیبیا سے
پاکستان واپس آگیا۔ صفی آپا، بڑے بھائی کے ساتھ رہ رہی تھیں، تاہم بڑے بھائی اور بھابی کا
سلوک صفی آپا سے کچھ اچھا نہیں تھا۔ آٹھ دس سال پہلے تک بڑے بھائی مسلسل یہ تکرار کرتے
رہے تھے کہ ادھیڑ عمر صفی آپا کسی جگہ شادی کر لیں اور اپنے گھر کی ہو جائیں۔ لیکن صفی آپا اپنے
اوپر یہ باب ہمیشہ کے لئے بند کر چکی تھیں۔ میں پاکستان منتقل ہوا تو صفی آپا کو اپنے ہاں لے
آیا۔ صفی آپا کافی کمزور ہو چکی تھیں اور ان کے ہاتھ پاؤں کا رعشہ بھی نمایاں ہو چکا تھا، لیکن
پاکستان آنے کے بعد میں نے ایک خاص بات نوٹ کی اور حیران رہ گیا۔ اور یہ وہ بات ہے
جس پر آپ دونوں بھی حیران ہوئے ہیں۔ صفی آپا جب بھی چائے بناتی تھی ان کا رعشہ یکسر ختم
ہو جاتا تھا۔ وہ بڑے سکون سے چائے کے برتن میز پر سجاتی تھیں۔ بڑے سلیقے سے اٹھتی بیٹھتی
تھیں اور چائے تیار کرتی تھیں۔ ان کی بیماری میں یہ عارضی افاقہ صرف اور صرف چائے
بنانے سے مشروط تھا۔ میں نے اس بارے میں بھیا بھابی سے پوچھا، اپنے طور پر بھی بہت سوچا
لیکن اس کی کوئی ٹھوس وجہ میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ شاید یہ کوئی نفسیاتی تبدیلی ہے۔ ماضی میں
چائے بنانے کے عمل نے صفی آپا کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ ہزار کوشش کرتی تھیں لیکن
مہمانوں کے سامنے ''پیش'' ہوتے وقت اور چائے بناتے وقت اپنا اعتماد برقرار نہیں رکھ پاتی
تھیں۔ اب جبکہ مہمانوں کے سامنے پیش ہونے والا مسئلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا اور امید
کا چراغ دم توڑ چکی تھی، چائے بنانے کے سلسلے میں صفی آپا کا اعتماد آپ ہی آپ بحال ہوگیا
تھا اور وہ رعشہ کی مریضہ ہونے کے باوجود حیران کن طور پر بڑی نفاست سے چائے تیار کرتی
تھیں۔ بہر طور یہاں آنے کے دو تین سال بعد ہی میری بیوی ایک حادثے میں انتقال کرگئی۔

میرا صرف ایک بیٹا ہے، وہ انگلینڈ میں زیر تعلیم ہے۔ پچھلے سات آٹھ برس سے صرف میں ا
صفی آپا اس حویلی میں رہتے ہیں اور کافی حد تک ایک مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔۔۔۔ ہا
کبھی کبھی بیتے دنوں کی یاد مجھے آزردہ کر دیتی ہے۔ والدہ کے ہونٹوں سے مایوسی کی لہر میں
کر جو فقرہ نکلا تھا، وہ آج بھی میرے کانوں میں گونجتا ہے۔۔۔۔ ''منحوس کہیں کی'' ا
فقرے کی بازگشت میری آنکھوں سے ساون کی جھڑی لگا دیتی ہے اور میں سوچتا ہوں ک
ہمارے معاشرے نے بیٹیوں اور بہنوں کی تقدیر میں یہ ''کڑی آزمائش'' کیوں رکھی ہے
اب تک صفی آپا جیسی نجانے کتنی معصوم لڑکیاں بار بار ٹھکرائے جانے کی اذیت سہہ کر نفسیا
مریض بن چکی ہیں۔۔۔۔ اور بن رہی ہیں۔۔۔۔ سہاگ کا سرخ جوڑا پہننے کی آرزو دل م
لیے وہ بوڑھی ہو جائیں گی اور خود کو کسی چار دیواری کے اندھیرے میں گم کر لیں گی۔ پھر بڑ
بھائی جیسے تنگ ذہن لوگ ہی انہیں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھیں گے اور انہیں ایک عضو معطل
قرار دے کر معاشرے کے جسم سے کاٹنے کے خواہش مند ہوں گے۔''

انکل عزیز خاموش ہو گئے، ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

☆☆☆

انکل عزیز اور ان کی ہمشیرہ صفی آپا کی کہانی میں کھو کر عدیل اور محسن نادیہ والا معاملہ بال
بھول گئے۔ یہ بڑی دلچسپ روداد تھی۔ عدیل کا دل چاہتا تھا کہ صفی آپا سے بار بار ملے اور ا
کے کردار کی نفسیاتی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرے اور اگر سلجھا نہ سکے تو کم از کم ان سے باخ
ہو جائے۔ وہ سائیکالوجی پڑھ رہا تھا اور صفی آپا جیسے کیسز کو اسٹڈی کرنا اس کے لئے بڑا سود
ثابت ہو سکتا تھا۔

محسن اور عدیل اس خوب صورت علاقے میں شاید کچھ روز مزید ٹھہرتے مگر اسی دور
میں عدیل کو فون پر اپنے ایک گہرے دوست کی بیماری کی اطلاع ملی اور ان دونوں کو واپس
پڑا۔

پھر ان واقعات کو تین چار سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ عدیل اور محسن دونوں ماسٹر
چکے تھے۔ محسن لاہور میں تھا اور اس نے نسبت روڈ پر ایک بڑا فوٹو اسٹوڈیو کھول لیا تھا۔ عد
کراچی چلا گیا تھا اور وہاں ایک کالج میں اسے بطور لیکچرار ملازمت مل گئی تھی۔ روٹی کے

بھاگتے بھاگتے وہ دونوں گہرے دوست ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے۔ بہرحال ان کا
رابطہ منقطع نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھار فون یا خط کے ذریعے وہ ایک دوسرے کو یاد کر لیتے تھے۔ محسن
کو بالکل یاد نہیں رہا تھا کہ چند برس پہلے ایک روز عدیل اسے بیٹھے بٹھائے کھینچ کر سیالکوٹ لے
گیا تھا تا کہ اس افلاطونی لڑکی کے کردار کی پرتیں کھول سکے جس نے یونیورسٹی میں اودھم مچا رکھا
تھا۔ اسے ''عمل اور ردعمل'' کے موضوع پر کی جانے والی باتیں بھی یاد نہیں رہی تھیں اور نہ ہی یاد
رہا تھا کہ ان دنوں عدیل کتنی شدت سے وہ ''وجہ'' ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا جس کا نتیجہ ایک
نہایت بے باک اور جنس زدہ نادیہ کی صورت میں نکلا تھا۔

لیکن پھر ایک دن جب محسن اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا اسے ایک خط موصول
ہوا۔۔۔۔ یہ کراچی سے عدیل کا خط تھا۔۔۔۔ لیکچرار عدیل احمد کا۔۔۔۔ خلاف معمول عدیل
کا یہ خط قدرے طویل تھا۔ محسن کے لئے یہ خط انکشاف انگیز ثابت ہوا۔ عدیل نے لکھا تھا۔

ڈیئر محسن!

تمہیں یاد ہوگا چار برس پہلے مجھ پر ایک خبط سوار رہا تھا۔ میں نے اس خوب رو لڑکی کا
ماضی کھنگالنا چاہا تھا جو خود کو یونیورسٹی کے لڑکوں میں ریوڑیوں کی طرح تقسیم کرتی پھرتی تھی۔
میں اس ''عمل'' کی تلاش میں تھا جس کا ردعمل نہایت آزاد خیال نادیہ کی صورت میں سامنے آیا
تھا۔ کل چار سال بعد میں نے وہ ''ردعمل'' ڈھونڈ لیا ہے۔

کل کا دن میرے لئے بے حد تعجب خیز تھا۔ تمہیں وہ پیاری سی بڑھیا یاد ہوگی جو ہم نے
سیالکوٹ کے مضافات میں دیکھی تھی۔ وہی رعشہ زدہ بڑھیا جسے انکل عزیز نے اپنی بڑی ہمشیرہ
بتایا تھا۔ کل دوپہر ڈیفنس کے ایک شاپنگ سینٹر میں میں نے اس معمر خاتون کو نادیہ کے ساتھ
دیکھا اور میں دنگ رہ گیا۔ نادیہ حسب معمول تنگ جینز اور شرٹ پہنے ہوئے تھی لیکن اس لباس
کے اندر وہ کچھ موجود نہیں تھا جسے دیکھ کر یونیورسٹی کے لڑکے پھڑک جایا کرتے تھے۔ ایک ڈھلا
ہوا پچپیاں سا جسم تھا۔ وہ اپنی عمر سے آٹھ دس سال بڑی نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ
حلقے تھے۔ رخساروں پر یرقان کے مریضوں جیسی زردی تھی۔ میں بمشکل اسے پہچان پایا۔ وہ
معمر خاتون کو سہارا دے کر زینوں کی طرف لا رہی تھی۔ نادیہ نے بھی مجھے دیکھ لیا اور پہچان لیا۔
نادیہ کے ساتھ ایک ملازم بھی تھا جس نے شاپنگ کا سامان اٹھا رکھا تھا۔ میں نے رسمی کلمات

کے بعد نادیہ سے پوچھا۔

''یہ معمر خاتون تمہاری کون ہیں؟''

وہ بولی ''میری پھوپھی ہیں۔ کیا تم ان سے مل چکے ہو؟''

میں نے انکار میں جواب دیا۔ لیکن ظاہر ہے میرے ذہن میں جو کانٹا چبھ چکا تھا آسانی سے نکلنے والا نہیں تھا۔ کمزور بینائی کے سبب معمر خاتون یعنی صفی آپا مجھے پہچاننے میں ناکام رہی تھیں۔ میں نے نادیہ کا فون نمبر وغیرہ لے لیا۔ کل شام میں نادیہ سے ایک ریسٹورنٹ میں ملا۔ نادیہ کی باتیں سن کر اور اس سے مل کر دکھ ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو برباد کر لیا ہے۔ بے اعمالیاں اور بے اعتدالیاں اس کا جسم گھن کی طرح چاٹ گئی ہیں۔ وہ اسموکنگ بھی کرتی ہے۔ میرے سامنے تو سادہ سگریٹ پی رہی تھی یقیناً بھرے ہوئے بھی پیتی ہوگی۔ دو سال پہلے جب اس میں تھوڑی بہت کشش باقی تھی، اس نے اپنے ایک بوائے فرینڈ سے شادی بھی کر لی تھی لیکن چند ہی ماہ بعد شدید اختلافات کے بعد طلاق ہوگئی اور نادیہ نے ابارشن کرا لیا۔ اب اس کی زندگی ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہے جس کی کوئی منزل ہے اور نہ راستہ۔ بہرحال یہ تو نادیہ کا منطقی انجام تھا۔۔۔۔۔۔ نادیہ سے میری ملاقات کا مقصد یہ تھا کہ میں اس سے صفی آپا کے متعلق تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ نادیہ کی باتوں سے جو کچھ معلوم ہوا اس کا لب لباب میں یہاں درج کر رہا ہوں۔

درحقیقت نادیہ کے بیمار والد ہی صفی آپا کے بڑے بھائی ہیں۔ وہی سخت گیر بڑے بھائی جنہوں نے صفی آپا پر ناروا پابندیاں عائد رکھیں اور ان کی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کو بھی کچل کر رکھ دیا۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ آخر تک بھی صفی آپا کی بڑے بھائی سے ساتھ بنی نہیں تھی۔ اسی دوران میں چھوٹے بھائی یعنی انکل عبدالعزیز لیبیا سے پاکستان واپس آئے اور وہ صفی آپا کو اپنے گھر لے گئے۔ میرا خیال ہے کہ اب بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔ صفی آپا، نادیہ کی پھوپھی ہیں۔ سیالکوٹ میں اپنے قیام کے دوران میں پہلے ہم بڑے بھائی یعنی انکل عزیز کی حویلی میں گئے لیکن یہ نہ جان سکے کہ ان دونوں حویلیوں میں گہرا تعلق ہے اور ان کے مالکان آپس میں سگے بھائی ہیں۔ ہماری بے خبری کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ دونوں بھائیوں اور ان کے گھرانوں میں بول چال بالکل بند تھی اور وہ زبان سے ایک

دوسرے کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ انکل عزیز سے ملاقات کے دوران میں مجھے تھوڑا شک ہوا تھا کہ ان کی شکل کسی سے ملتی جلتی ہے لیکن یہ شک مجھے کسی نتیجے پر نہیں پہنچا سکا تھا۔

کل نادیہ کی باتوں سے معلوم ہوا ہے کہ اس کے والد سخت بیمار ہیں اور ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ وہ لاہور ہی کے ایک پرائیویٹ کلینک میں زیر علاج ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں ''بول چال کی حد تک'' انہوں نے چھوٹے بھائی سے صلح کر لی ہے اور اس صلح ہی کا نتیجہ تھا کہ نادیہ اپنی پھپھو یعنی صفی آپا کے ساتھ نظر آئی تھی۔

ڈیئر محسن! ہوسکتا ہے کہ تمہیں میری بات عجیب لگے لیکن اپنے تجربے کی بنیاد پر پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے وہ غیر معمولی ''عمل'' ڈھونڈ لیا ہے جس کا غیر معمولی ''ردِعمل'' نادیہ ہے۔ یہ عمل صفی آپا کو جکڑنے والی ناروا پابندیاں ہیں۔ ہاں محسن ڈیئر! اپنے بڑے بھائی کے گھر میں صفی آپا کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ننھی منی نادیہ دیکھتی رہی، اس نے اپنی لرزتی کانپتی پھپھو کی بے بسی دیکھی، مہمانوں کے سامنے ان کی پیشی کے ترس ناک واقعات سنے، وہ معاشرتی جبر دیکھا جس کے بے رحم بوجھ نے صفی آپا کے جسم کو رعشہ زدہ کیا۔۔۔۔۔ اور بتدریج اس کے ذہن میں معاشرتی رسوم و قیود کے خلاف نفرت پروان چڑھتی چلی گئی۔۔۔۔ وہ معاشرتی اور اخلاقی اقدار سے باغی ہوگئی۔ اس کی بغاوت ایک دھماکے کے ساتھ منظرِ عام پر آئی۔ ایک ایسا دھماکا جس نے اس کے قدامت پسند والد کو فالج زدہ کر کے ہمیشہ کے لئے بستر سے لگا دیا۔ وہی لڑکی جو اپنے والد کے گھر میں تھی تو سر پر دوپٹا رکھتی تھی اور نظر جھکا کر بات کرتی تھی، جب کالج پہنچی تو دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا بن گئی۔ جس روز نادیہ کے سخت گیر والد صاحب پر فالج کا شدید حملہ ہوا اس روز انہوں نے لاہور کے ایک بازار میں اپنی چھوٹی موٹی بیٹی کو اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ ایک کھلی جیپ میں سوار دیکھا تھا، وہ انگریزی لباس میں تھی اور میوزک پر تھرک رہی تھی۔ یہ سب کچھ مجھے نادیہ ہی نے بتایا ہے۔ میرا خیال ہے اب تو تمہیں یقین آجانا چاہئے کہ میں نے صفی آپا کی بے بسی اور نادیہ کی بربادی میں جو تعلق دریافت کیا ہے وہ خیالی نہیں ہے۔۔۔ نادیہ نے اپنی گفتگو میں خود اس تعلق کی تصدیق کی ہے۔

ہاں محسن ڈیئر! نادیہ کا رویہ دراصل ایک احتجاج تھا، وہ ایک غیر ارادی احتجاج تھا اپنی پھپھو کے ان ڈگمگاتے قدموں کے خلاف جو رشتے کی امید میں مہمانوں کے سامنے پیش ہونے کے

لئے اٹھتے تھے، اور اپنی پھپھو کی ان لرزتی انگلیوں کے خلاف جو چائے کی پیالیوں کی طرف بڑھتی تھیں، اور اپنی پھپھو کی زبان کے خلاف جو بولنے کی کوشش میں ہونٹوں کے اندر ہی لرز کر رہ جاتی تھی۔

اس احتجاج نے نادیہ کو تباہ کر دیا۔ مگر تباہ ہو جانے کا خوف احتجاج کرنے والوں کو روک نہیں سکتا۔ وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر احتجاج کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ جس معاشرے میں اور جہاں بھی صفیہ کو "عضو معطل" بنایا جائے گا، وہاں بے لگام نادیہ ضرور پیدا ہوگی۔۔۔۔

تمھارا فلسفی عدیل

☆

جرأت اظہار

سورج دور بیلے کے اونچے درختوں کے پیچھے ڈوب گیا، سرما کی تیز رفتار شام نے دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کو ڈھانپ لیا۔ وہ چھت پر سے دیکھ رہی تھی، گاؤں کی گلیوں میں مرغیاں کٹ کٹ کرتی اپنے اپنے گھروں اور ڈربوں کی طرف جا رہی تھیں۔ جو نہیں جا رہی تھیں انہیں ان کے مالک جو زیادہ تر لڑکے بالے تھے گھیر گھار کر لے جا رہے تھے۔ دور بابے رفیق کے کنوئیں کے آس پاس گائے بھینسوں کے ریوڑ اپنی مخصوص رفتار سے گاؤں کی جانب آ رہے تھے، ان کے عقب میں بکریاں اور بھیڑیں وغیرہ تھیں۔ یہ جانور بھی جیسے جانتے تھے کہ ایک تاریک اور نہایت سرد رات کی آمد آمد ہے اور اس رات کی آمد سے پہلے انہیں اپنے ٹھکانوں پر ہونا چاہئے۔

خالدہ نے ایک گہرا سانس لے کر کچی منڈیر سے ٹیک لگائی۔ نیچے باورچی خانے میں اس کی پھوپی گڑ والے چاول پکا رہی تھی۔ چاول کی خوشبو، دال کو لگائے جانے والے پیاز کے تڑکے سے بغل گیر ہو کر ہوا میں اوپر جا رہی تھی، اور جیسے اس ٹھنڈی ٹھنڈی دھندلی دھندلی شام کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ گھر کے سامنے ایک میدان تھا، میدان سے آگے جوہڑ تھا۔ جوہڑ کے سرد پانی پر ابھی سے دھند پھیلی محسوس ہوتی تھی۔ ماسی زینب کی سفید بطخوں نے پانی سے نکل کر اپنے پر جھاڑے اور ایک قطار میں ڈولتی ہوئی گلی میں داخل ہو گئیں۔

خالدہ سوچنے لگی، کیا ان کو سردی نہیں لگتی؟

خیر سردی تو خالدہ کو بھی نہیں لگتی تھی۔ وہ اس وقت بھی وائل کا پتلا سا کرتا پہنے ہوئے تھی جس کی آستینیں اڑسی ہوئی تھیں۔ وہ جانتی تھی ابھی تھوڑی دیر میں پھوپی اسے آوازیں دے

دے کر نیچے بلا لے گی، اگر وہ نہ بلاتی تو خالدہ پوہ کی اس لمبی رات میں شاید چھت پر ہی بیٹھی رہتی۔ ان سرد دنوں میں بھی ایک عجیب سی تپش اس کے جسم میں جاگی رہتی تھی۔ ذرا دھوپ لگتی تو چنگاریاں سی چھوٹتی سی محسوس ہوتیں اور اس کے گال سرخ گلابی ہو کر تپنے لگتے۔ دو تین سال پہلے تک تو ایسا نہیں تھا، نہ بدن میں الاؤ دہکتا تھا، نہ بیٹھے بیٹھے انگڑائیاں آتی تھیں، نہ جاگتی آنکھوں میں مسلسل خواب اترتے تھے۔

خالدہ سیالکوٹ کے ایک گاؤں ''چانن پور'' کی رہنے والی تھی۔

اس کی پھوپھی گوجرانوالہ کے ایک گاؤں ''باغ والی'' کی رہنے والی تھی۔ پھوپھی کے ہاں بچے کی پیدائش ہونے والی تھی لہٰذا خالدہ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لئے یہاں آ گئی تھی۔ اسے یہاں آئے ہوئے اب دو ڈھائی مہینے ہو چلے تھے۔ پھوپھی کے ہاں ایک بیٹے نے جنم لیا تھا، اب وہ گھر کے کام کاج کرنے لگی تھی، تاہم خالدہ کو ابھی آٹھ دس روز مزید یہیں رہنا تھا۔

اچانک پڑوس کی چھت سے ابھرنے والی ایک آواز نے خالدہ کو اپنے خیالوں سے چونکا دیا۔ یہ بے بے بختے کی آواز تھی ''ہائے نی کُڑیے! تجھ کو ٹھنڈ نہیں لگتی؟ اب تک بیٹھی ہوئی ہے یہاں۔''

''اتنی ٹھنڈ تو نہیں ہے بے بے!''

''بس ویلے ویلے کی بات ہوتی ہے۔'' بے بے بختے نے لمبا سانس کھینچ کر کہا ''کسی وقت مجھے بھی نہیں لگتی تھی ٹھنڈ۔۔۔۔ اشرف کا پیو کہا کرتا تھا کہ میرا پنڈا لوہے کا بنا ہوا ہے۔ میں سخت سردیوں میں بھی رات کو نہا کر سوتی تھی۔ مجھے نہیں یاد کہ اس زمانے میں کبھی کوئی گرم کپڑا پہنا ہو میں نے۔ صبح منہ اندھیرے سر پر لسی کی چاٹی اٹھا کر اپنے سورے (سسر) کے پاس کھیت میں جایا کرتی تھی اور جاتی بھی ننگے پاؤں تھی۔''

خالدہ نے کہا ''بے بے! جب تو پرانے وقتوں کی بات ہے ناں، تو دل کرتا ہے کہ تیری انگلی پکڑ کر میں بھی پرانے وقتوں میں چلی جاؤں۔ دیکھوں کہ تو جوانی میں کیسی ہوتی تھی، اشرف کا پیو کیسا ہوتا تھا۔ تیرا گھر اور گھر والے کیسے ہوتے تھے؟''

بے بے بختے ہنسی تو اس کے جھریوں بھرے چہرے کی جھریاں سینکڑوں سے ہزاروں

ہو گئیں۔ وہ لاڈ سے بولی ''تو بھی بس کملی ڈھی ہے۔ کوئی پرانے وقت میں نہیں جا سکتا۔ نہ کوئی اگلے وقت میں جا سکتا ہے۔ کوئی پرانے وقت میں جا سکتا تو سب سے پہلے میں جاتی۔ میرا بڑا کچھ رہ گیا ہوا ہے پرانے وقت میں۔'' آخری الفاظ ادا کرتے کرتے بے بے بختے ایک دم اداس ہو گئی تھی۔

بے بے بختے کی اداسی کی وجہ خالدہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اپنی شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد بے بے بختے کی اپنے گھر والے سے ناچاقی ہو گئی تھی۔ وہ تین چار مہینے کے بچے کو بے بے بختے کے پاس چھوڑ کر گھر سے چلا گیا تھا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا تھا۔ اس واقعے کا تذکرہ تین دن پہلے خالدہ بے بے بختے سے سن چکی تھی۔ بے بے بختے نے کئی برس تک اپنی نظریں اپنے شوہر کی راہ پر لگائے رکھی تھیں اور ساتھ ساتھ اپنے بچے کی پرورش بھی کرتی رہی تھی۔ اس کا شوہر واپس نہیں آیا تھا یہاں تک کہ اس کا بیٹا اشرف پل کر جوان ہو گیا تھا۔ اشرف کو لڑکپن میں پولیو ہو گیا تھا جس کے سبب اس کے دونوں پاؤں بے کار ہو گئے تھے۔ اشرف کی یہ معذوری بے بے بختے کے لئے اضافی ذمے داری بن گئی تھی، بہرحال اس نے بڑی خندہ پیشانی سے زندگی کی اس تلخی کو بھی سینے سے لگایا تھا اور اپنے بچے کو ماں کے ساتھ ساتھ باپ کا پیار بھی دیا تھا۔ وہ سلائی مشین پر دن رات محنت کرتی رہی تھی۔ نہ صرف کرائے کے گھر کو اپنے گھر میں تبدیل کیا تھا بلکہ اشرف کی شادی بھی اچھے طریقے سے کی تھی۔ اس موڑ پر زندگی نے بے بے بختے پر ایک اور کاری وار کیا تھا۔ ایک خونی سیلاب میں اشرف اور اس کی بیوی اپنی چند ماہ کی بچی سمیت جاں بحق ہو گئے تھے۔ وہ جاتے جاتے دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کی ذمے داری بے بے بختے کے غمزدہ کندھوں پر ڈال گئے تھے۔ اس واقعے کے بعد بے بے بختے ایک نئے سفر پر روانہ ہوئی تھی۔ اپنی جوانی اس نے اپنے بچے کی پرورش میں صرف کر دی تھی۔ اب باقی عمر اس نے اپنے پوتے اور دو پوتیوں کے نام کر دی۔ پوتیاں بڑی تھیں جبکہ پوتا صرف دو سال کا تھا۔ بے بے بختے کا ہاتھ دن رات سلائی مشین کے چکر پر چلتا رہا۔ اس کے چہرے کی جھریاں بڑھتی رہیں۔ اس کے بال سفید تر ہوتے رہے اور اس کی عینک کے شیشے موٹے ہوتے چلے گئے۔ آخر اس نے زندگی کے چند اور سنگ میل عبور کر لیے۔ یکے بعد دیگرے اس نے اپنی دونوں پوتیوں کی شادیاں کر دیں اور اپنے پوتے کو چھوٹا سا کاروبار کروا دیا۔ اب تین چار سال

اس کی نظر زیادہ کمزور ہوگئی تھی، ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا۔قریباً چالیس برس تک دن رات چلنے والی مشین اب بند ہو چکی تھی۔اب بے بے بختے کو کسی ایسے دن کا انتظار تھا جب اس کا سر اپنے لاڈلے پوتے کی گود میں ہو۔اس کی دونوں پوتیاں اس کے دائیں بائیں بیٹھی ہوں وہ کلمہ پڑھے اور اپنی تھکی ہوئی جان اپنے خالق حقیقی کے حوالے کر دے۔

چھت سے نیچے آ کر بھی خالدہ دیر تک بے بے بختے کے بارے میں سوچتی رہی ''باغ والی'' گاؤں میں آئے ہوئے خالدہ کو دو ڈھائی مہینے ہو گئے تھے۔تاہم بے بے بختے سے ملاقات ہوئے پندرہ بیس دن ہوئے تھے۔ان پندرہ بیس دنوں میں ہی بے بے بختے، خالدہ کو بہت اپنی اپنی لگنے لگی تھی۔بے بے بختے سے ملاقات کے بعد خالدہ کو یوں لگا تھا جیسے ایک دم اس نے بہت سی دانائی، بہت سی ہمدردی اور بہت سی چاہت اپنی جھولی میں بھر لی ہو۔بے بے بختے اور خالدہ کی عمر میں قریباً آدھی صدی کا فرق تھا مگر پھر بھی خالدہ کو بے بے بختے ایک سہیلی کی طرح لگی تھی۔ایسی مہربان سہیلی جس کے ساتھ خالدہ ہر طرح کی بات بے تکلفی سے کر سکتی تھی۔خالدہ کا خیال تھا کہ یہ کیفیت صرف اسی کی نہیں ہے۔بے بے بختے سے ملنے والی اکثر عورتوں کی کیفیت یہی ہوتی ہوگی۔خالدہ نے دیکھا تھا کہ باغ والی گاؤں میں دو سال کے بچے سے لے کر نوے سالہ بوڑھے تک سب بے بے بختے کو بے بے ہی کہتے تھے اور اسے عزت اور پیار کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔خالدہ اب چند دنوں میں یہاں سے جانے والی تھی اسے افسوس ہو رہا تھا کہ بے بے بختے سے اس کی ملاقات اتنی دیر سے کیوں ہوئی۔

اس رات خالدہ دیر تک لحاف میں کروٹیں بدلتی رہی۔کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔دور کہیں تاریک کھیتوں میں ڈیزل انجن چلنے کی مخصوص آواز ''کوہ کوہ'' کی صورت بلند ہو رہی تھی۔گھر کے پچھواڑے آوارہ کتوں کا شور تھا اور گاؤں کی ٹھنڈی ٹھار گلیوں میں گاہے گاہے چوکیدار کی ٹھٹھری ہوئی صدا گونجتی تھی ''جاگدے رہنا۔''

کسی اور کا تو پتا نہیں تھا مگر خالدہ پچھلی کئی راتوں سے چوکیدار کی ''ہدایت'' پر عمل کر رہی تھی نیند کی جگہ اس کی آنکھوں میں ایک چبھن سی بھری رہتی تھی اور دل کی دھک دھک جیسے کنپٹیوں میں گونجتی تھی۔نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔یوں لگتا تھا کہ چپکے چپکے بڑے عرصے سے اس کے اندر کوئی چنگاری سلگ رہی تھی جو پوہ ماگھ کی ان طویل راتوں میں اچانک بھڑک اٹھی

تھی اور اس کے تن بدن کو اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی تھی۔خالدہ کے ذہن میں رہ رہ کر ایک تصویر ابھرتی تھی۔چوڑے شانوں والے ایک لمبے نوجوان کی شبیہ اس کے رخساروں کی ہڈیاں تھوڑی سی ابھری ہوئی تھیں، آنکھیں سرمے کے بغیر ہی بے حد سیاہ اور روشن تھیں۔پتلے ہونٹ اور ان کے اوپر پتلی پتلی مونچھیں۔وہ خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اب سے نہیں کئی برسوں سے دیکھ رہا تھا۔وہ کچھ بولتا تھا نہ کوئی اشارہ کرتا تھا، نہ کچھ سمجھاتا تھا، بس اس کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔اس کی خاموشی ایک معما تھی اور یہ معما کئی موسموں سے خالدہ کی جان کا روگ بنا ہوا تھا۔اس رات بہت دیر تک بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد خالدہ نے فیصلہ کیا کہ وہ کل بے بے بختے سے اس بارے میں بات کر کے رہے گی۔

☆☆☆

اگلی رات بھی پچھلی راتوں کی طرح سرد تھی۔آج یہ سردی یوں اور بڑھ گئی تھی کہ ہوا چل رہی تھی۔شمال کی طرف سے آنے والی یہ ہوا گاہے گاہے کھڑکیوں دروازوں کی درزوں سے اندر گھستی تھی اور کپکپی طاری کر دیتی تھی۔لوہے کی ایک پرانی کڑاہی میں کوئلے دہک رہے تھے۔بے بے بختے اور خالدہ کھدر کی ایک ہی رضائی میں قریب قریب بیٹھی تھیں۔

بے بے بختے نے بے تکلف سہیلی کی طرح خالدہ کا نرم ہاتھ اپنے جھریوں بھرے ہاتھ میں تھاما، اسے مسکراتی نظروں سے دیکھا اور بولی ''میری کملی دھی! مجھے پہلے ہی پتا تھا تو کسی نہ کسی سے پیار ضرور کرتی ہے۔چل اچھا اب مجھے اس کا نام بتا۔''

''نام تو پتا نہیں بے بے بس اسے حادی۔۔۔۔حادی کہتے ہیں۔''

''ہا۔۔۔۔ہائے۔۔۔۔چار سال سے اسے جانتی ہے اور نام کا پتا نہیں۔''

''چار سال سے تو جانتی ہوں بے بے۔مگر وہ پورے ایک سال بعد تو آتا ہے بس دس پندرہ دن کے لئے۔''

''کیا مطلب۔۔۔۔۔۔کہیں دبئی وغیرہ میں رہتا ہے۔''

''نہیں بے بے۔وہ دبئی کویت والا نہیں ہے۔بس اپنے جیسا ہی غریب مادھڑ ہے۔میلے میں پنگوڑا لگاتا ہے۔پہلے لکڑی کا پنگوڑا تھا اور وہ خود چلایا کرتا تھا، اب اس نے لوہے کا آسمانی پنگوڑا بنا لیا ہے۔چلانے کے لئے دو لڑکے ملازم بھی رکھے ہوئے ہیں۔بڑا شاندار

پنگوڑا ہے۔کئی رنگ کی ڈولیاں ہیں، ہر ڈولی کے اوپر چھت ہے۔ جب ڈولی اوپر جاتی ہے تو ایسے لگتا ہے کہ آدھی دنیا نظر آنے لگی ہے۔''

''اچھا تو وہ پنگوڑا لے کر میلے کے میلے تیرے گاؤں آتا ہے۔''

خالدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔اس کی پلکیں جھکی جھکی تھیں اور گال گلابی ہو کر دہکنے لگے تھے۔وہ آہستہ سے بولی'' ہمارے پنڈ میں پوہ کی اٹھارہ تاریخ سے پنجی تاریخ تک'' سانول پیر'' کا میلہ ہوتا ہے۔دکانیں اور پنگوڑے وغیرہ میلے سے چار پانچ دن پہلے لگ جاتے ہیں اور میلے کے بعد بھی دو تین دن لگے رہتے ہیں۔ ہر سال پوہ کی تیرہ چودہ تاریخ کو وہ آتا ہے اور بس دو ہفتے کے اندر چلا جاتا ہے۔''

بے بے بولی'' آج میرے خیال میں پوہ کی چار تاریخ ہے۔آٹھ دس دن بعد تیرا'' وہ'' آنے والا ہے۔''

خالدہ کے گال پھر سرخ ہو گئے۔وہ ادا سے بولی'' میرا وہ کچھ نہیں ہے بے بے۔بب۔ بس۔''

''بس کیا؟''

''بس پتا نہیں کیا بات ہے۔اس کا خیال میرے دماغ سے چمٹا رہتا ہے۔میں بڑا نکالتی ہوں، پر وہ نہیں نکلتا۔میں نے یہ بات آج تک کسی کو نہیں بتائی ہے بے بے۔اپنی پکی سے پکی سہیلی کو بھی نہیں ۔۔۔۔۔ پر پتا نہیں ۔۔۔۔ تمہیں کیوں بتا رہی ہوں۔''

''مجھے اپنا سمجھنے لگی ہے ناں اس لئے بتا رہی ہے اور بتا کر تو نے اچھا ہی کیا ہے۔اس سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔'' بے بے بختے نے شفقت سے کہا۔خالدہ کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے۔

''ایسا کیوں ہے بے بے۔میں ۔۔۔۔ کیوں اس کے بارے میں سوچتی ہوں۔کیا یہ گناہ نہیں ہے۔''

بے بے بختے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا'' یہ گناہ نہیں ہے دھی رانی۔یہ پیار ہے۔اور پیار گناہ نہیں ہوتا۔''

''میں کیا کروں بے بے! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔مجھے لگتا ہے میں ۔۔۔۔ پاگل

ہو جاؤں گی۔''

''پاگل ہوں تیرے دشمن۔مجھے یہ بتا، کبھی اس نے تجھ سے بات شات کی ہے؟''

''بس ایک بار۔'' خالدہ نے کہا پھر گہرا سانس لے کر اس نے کمرے کی کچی دیوار سے ٹیک لگائی اور لالٹین کے شعلے کو گھورتے ہوئے بولی'' چار سال پہلے میں نے اسے میلے میں ہی دیکھا تھا۔اس وقت اس کے پاس لکڑی کا پنگوڑا تھا جسے وہ خود ہی ہلا وا دیتا تھا۔میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ میرا ابا مٹی کے برتن بنانے کا کام کرتا ہے۔ میلے کے دنوں میں وہ بڑے سوہنے سوہنے بھانڈے بناتا ہے، پیالے، گھڑیاں، جھجھراں، گڑویاں۔ان پر رنگ برنگے پھُل بوٹے بناتا ہے اور سجا بنا کر لشکارا دیتا ہے۔وہ ہر سال میلے میں دکان لگاتا ہے۔اس سال بھی اس نے دکان لگائی تھی۔میں اپنی سہیلی چھیموں اور صغراں کو دکان دکھانے ہی لے گئی تھی، واپسی پر ہم نے رنگ رنگیلا پنگوڑا دیکھا اور ہمارا دل اس میں بیٹھنے کو مچل گیا۔ہم ایک ایک روپیا دے کر پنگوڑے میں بیٹھ گئیں۔وہ ہمیں جھولے دینے لگا، ان دنوں اس کا جسم کچھ زیادہ ہی دبلا پتلا تھا۔وہ بڑی تیزی سے پاؤں رکھتا ہوا پنگوڑے کے اوپر چڑھ جاتا تھا اور پھر کسی ایک ڈولی کے ساتھ لٹک کر زوردار جھٹکا لگاتا تھا اور پنگوڑا ایک دم تیز ہو جاتا تھا۔اس نے کئی بار ایسے ہی کیا اور ہماری چیخیں نکل گئیں، مگر ان چیخوں میں ایک مزہ ہوتا ہے بے بے۔بڑا سواد آتا ہے۔پیٹ میں گدگدی سی ہوتی ہے۔بے بے تو کبھی بیٹھی ہے پنگوڑے میں؟'' خالدہ نے اچانک سوال کیا۔

''ہاں دھیئے! کسی زمانے میں بیٹھا کرتی تھی، اب تو سب کچھ بھول بھال گیا ہے۔اچھا تو چھوڑ ان باتوں کو۔اپنی بتا۔اس لڑکے سے تیری بات کب ہوئی؟''

''بات تو کوئی دو سال بعد ہوئی۔اس سے پہلے تو ہم بس ایک دوسرے کی طرف دیکھا ہی کرتے تھے۔پتا نہیں کیا بات تھی۔مجھے اس کا اپنی طرف دیکھنا برا نہیں لگتا تھا، اور نہ اب لگتا ہے۔پہلے دن اس کے جھولے پر بیٹھنے کے بعد میں جیسے کسی جادو کے اثر میں آ گئی تھی۔نہ چاہنے کے باوجود میں ہر دوسرے تیسرے دن میلے چلی جاتی تھی۔اکثر چھیموں بھی میرے ساتھ ہوتی تھی۔ہم جھولے کے ارد گرد ہی گھومتے رہتے تھے پھر کبھی کبھی جھولے میں بیٹھ بھی جاتے تھے۔جھولے تو اور کئی بھی تھے مگر اس کے جھولے میں بیٹھنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔اور پھر

میلہ ختم ہوگیا۔ دو تین دن کے اندر سارے دکان دار دکانیں اٹھا کر چلے گئے اور دوسرے کھیل تماشے والے بھی رخصت ہو گئے ۔ایک روز میں نے دیکھا تو وہ جگہ خالی اور ویران پڑی تھی جہاں اس کا جھولا تھا۔

وہ چلا گیا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچتی رہی ۔سردیاں گزر گئیں بہار کا موسم آیا، پھر لمبی گرمیوں نے ڈیرے ڈال لیے۔گرمیوں کے بعد برسات آئی پھر پت جھڑ آیا۔ پت جھڑ میں لوگ اداس ہوتے ہیں لیکن پتا نہیں کیوں میرے دل میں خوشی سی تھی میں سوچتی تھی کہ سردیاں شروع ہونے والی ہیں اور میلہ نزدیک آرہا ہے۔۔۔۔۔اور پھر آخر کار میلے کے دن آ گئے ۔ایک روز چھیموں صبح سویرے بھاگتی ہوئی میرے پاس پہنچی۔اس نے بتایا کہ میلے کی دکانیں لگنا شروع ہوگئی ہیں اور پنگوڑے والا بھی آ گیا ہے۔ میں سارا سال اس کا انتظار کرتی رہی تھی مگر جب وہ آیا تو میں دو تین دن تک اس کے پنگوڑے میں نہ جا سکی، آخر ایک روز چھیموں مجھے گھسیٹ گھساٹ کر میلے میں لے گئی۔ ایک بار پھر پچھلے سال والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں اور چھیموں کسی نہ کسی بہانے ہر دوسرے روز میلے پہنچ جاتیں ۔اس کے جھولے میں بیٹھتیں۔ وہ بہت کم بولتا تھا اور ہنستا تو بہت ہی کم تھا لیکن جب کبھی بھی ہنستا تھا اس کے سفید دانت لشکارے مارنے لگتے تھے۔ہمیں اس کا نام تو معلوم نہیں ہوا" بس اتنا معلوم ہوگیا کہ اس کے جاننے والے اسے حادی کہہ کر پکارتے ہیں ۔اس سال میلے کے دنوں میں ہی میں تین چار دن بیمار رہی ۔ میں چھیموں کے ساتھ میلے میں نہیں جا سکی تھی ،اس لئے میرے دل پر بھاری بوجھ سا پڑ گیا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ہر گھڑی میرا انتظار کر رہا ہے، میری راہ دیکھ رہا ہے۔ ایک دن چھیموں نے مجھے آ کر بتایا" وہ راستے میں مجھے ملا تھا، پوچھ رہا تھا تم دونوں میلے میں کیوں نہیں آتی ہو، تمہاری سہیلی کہاں ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ بیمار ہے۔

"چھیموں کی باتیں سن کر مجھے اتنا اچھا لگا ہے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی لیکن اس کے ساتھ بہت زیادہ شرم بھی آئی۔ اسے کیا حق پہنچتا تھا اس طرح میرے بارے میں پوچھنے کا۔ شرم کی وجہ سے میں ٹھیک ہونے کے بعد بھی میلے میں نہیں جا سکی۔ روز جانے کا سوچتی تھی اور جاتی نہیں تھی۔ میلہ ختم ہونے میں بس دو دن باقی رہ گئے تھے۔ میں نے سوچا، چلو کل جاؤں گی لیکن اسی رات بڑی تیز آندھی چلی اور زور کی بارش ہوئی۔ میلہ الٹ پلٹ ہوگیا۔ قناتیں وغیرہ

گر پڑیں۔ میلے والی جگہ گوڈے گوڈے پانی کھڑا ہوگیا۔ میلہ دو دن پہلے ہی ختم ہوگیا۔ میلے کی ساری رونق کے ساتھ ساتھ حادی بھی ہمارے گاؤں سے چلا گیا۔ دوسرے روز شام کو میں نے دیکھا تو میلے والی جگہ پر کچھ نہیں تھا۔"

"ایک بار پھر طویل انتظار شروع ہوگیا۔ پوہ ختم ہوا۔ ماگھ آیا پھاگن آیا اور پھر بہار کے دن آ گئے ۔ میں اکثر اداس رہتی تھی۔ کبھی میلے والی جگہ کے پاس سے گزرتی تھی تو دل کو ایک دھکا سا لگتا تھا۔ اس جگہ کو دیکھتی تھی جہاں ہر سال حادی کا پنگوڑا لگا کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں اپنے دل کو سمجھاتی، یہ بس تیرے دماغ کا فتور ہے خالدہ۔ اس کے دل میں کچھ نہیں ہے۔ اگر کچھ ہوتا تو وہ سال کے سال ہی تیرے گاؤں کیوں آتا۔ وہ کسی بہانے کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔ وہ تو یہاں سے جاتا ہے تو پھر سب کچھ بھول ہی جاتا ہے۔ پلٹ کر دیکھتا تک نہیں۔"

اور پھر بے بے! ایک سال اور اسی طرح گزر گیا۔ آخر پوہ کا مہینہ آیا۔ بس ایسے ہی دن تھے جیسے آج کل ہیں۔ میں ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ سوچتی تھی کہ وہ نہ آیا تو کیا ہوگا پھر خود ہی اپنے آپ پر لعن طعن کرتی تھی۔ وہ تیرا لگتا کیا ہے؟ کیوں کسی پرائے کے بارے میں اس طرح سوچتی ہے۔ ایک دن صبح سویرے اپنے ابے کے ساتھ چکنی مٹی لینے نہر کی طرف گئی۔ دوپہر ویلے واپس آئی تو میلے والی جگہ گہما گہمی تھی۔ دکانیں لگنا شروع ہوگئی تھیں۔ میں نے حادی کو دیکھا اور اس کے پنگوڑے کو بھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ جیسے میرے پاؤں زمین پر پڑنے کے بجائے ہوا پر پڑ رہے ہوں۔

حادی نے میرے ابے کے ساتھ دو باتیں کیں۔ میں ابے کے پیچھے سے چوری چوری اسے دیکھتی رہی۔ اس مرتبہ حادی کے پاس لکڑی کے بجائے لوہے کا آسمانی پنگوڑا تھا۔ ساتھ میں دو ملازم لڑکے بھی تھے۔ آسمانی جھولے کا سامان دو بیل گاڑیوں پر لدا ہوا تھا۔ وہ پندرہ دن ایک سہانے خواب کی طرح تھے۔ میں نہ سو رہی تھی نہ جاگ رہی تھی۔ پاؤں رکھتی کہیں تھی پڑتے کہیں تھے۔ میں اور چھیموں روزانہ ہی میلے کا ایک آدھ چکر لگاتی تھیں۔

"کئی بار حادی کے پنگوڑے میں بیٹھنا ہوا۔ اس پنگوڑے کا کرایہ تین روپے تھا۔ حادی ہم سے کرایہ نہیں لیتا تھا مگر ہم اسے زبردستی دیتے تھے۔ وہ بے بس ہو جاتا تھا اور بڑا بے چارہ نظر آنے لگتا تھا۔ میں جب بھی اسے دیکھتی تھی اپنی طرف ہی دیکھتا پاتی تھی لیکن وہ بولتا کچھ نہیں

تھا لیکن پھر میلہ ختم ہونے سے دو دن پہلے اس نے اپنی چپ کا روزہ توڑ دیا۔ اس روز چھیمو اکیلی ہی میلے سے چوڑیاں خریدنے نکل گئی تھی۔ میں اسے ڈھونڈ رہی تھی کہ ایک دم دس سال کا ایک لڑکا میرے سامنے آ گیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جسے حادی نے پنگوڑے پر ملازم رکھا تھا۔ اس نے چپکے سے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا اور بولا ''استاد نے دیا ہے۔'' میرے پسینے چھوٹ گئے۔ جلدی جلدی گھر گئی۔ پڑھنا تو آتا نہیں تھا، چھیمو آئی تو اس نے پڑھا۔ تھا ''میں تجھ سے بڑا پیار کرتا ہوں۔ ہر وقت تیرے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ پتا نہیں تو بھی میرے بارے میں سوچتی ہے کہ نہیں۔ میں تجھ سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ ڈرتا ہوں انکار نہ کر دے۔''

''اس خط نے مجھے پانی پانی کر دیا تھا بے بے! مجھے حادی پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ میں س تھی اس نے ایسی جرات کیوں کی۔'' حالانکہ اس سے پہلے مجھے اس کی خاموشی پر غصہ آتا میں دو دن گھر سے باہر نہیں نکلی۔ میلہ ختم ہو گیا۔ میلے والے اپنے کھیل تماشے لے کر چلے گئے ان کے جانے کے بعد میں کئی دن تک روتی رہی پھر آہستہ آہستہ دل کو سنبھال لیا۔''

یہاں تک بتا کر خالدہ جیسے ہانپ سی گئی تھی۔ سخت سردی میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے نمی تھی۔ باہر تیز ٹھنڈی ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی چل رہی تھی۔ بے بے نے اٹھ کر ایک ادھ کھڑکی کو بند کرنا چاہا۔ خالدہ نے بے بے کو روکا۔ خود اٹھ کر کھڑکی بند کی اور دوبارہ بے بے پاس رضائی میں آ بیٹھی۔ اس کی خوب صورت آنکھیں کسی سوچ میں کھو گئی تھیں۔ بے بے نے کہا ''اب آگے بھی بتا۔ اگلے سال وہ آیا کہ نہیں۔''؟

''آیا بے بے۔ اگلے سال بھی وہ آیا۔ میں اور چھیمو بھی میلے پر جاتی رہیں۔ ایک بار دوسری لڑکیوں کے ساتھ اس کے پنگوڑے پر بھی بیٹھیں۔ مگر کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کی نہ میں نے۔ وہ جیسے اس خط کو بھول ہی گیا تھا۔ وہ اسی طرح خاموش نظر آتا تھا جس طرح کرتا تھا۔ ہاں وہ مجھے دیکھتا ضرور تھا اور اس کے دیکھنے میں کوئی ایسی بات تھی جو کسی دوسر کے دیکھنے میں نہیں تھی۔ وہ اب بھی مجھے اسی طرح دیکھتا ہے۔ جیسے میرے بولنے کا انتظار کر ہے۔ میرے منہ سے کوئی بات سننا چاہتا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس سے کیا کہوں شاید کبھی سمجھ میں آئے گا بھی نہیں۔ وہ ایک پردیسی ہے بے بے۔ پتا نہیں کہاں سے آتا۔

کہاں چلا جاتا ہے؟ جس طرح کچھ پنچھی پوہ ماگھ کے مہینوں میں پتا نہیں کہاں سے اڑتے ہوئے آتے ہیں، کچھ دن ہمارے آس پاس رہتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ وہ تو اتنے دن بھی نہیں رہتا، بس چودہ پندرہ دنوں کا ساتھ ہوتا ہے اس کا پھر وہ چلا جاتا ہے اور مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے بے بے! میں یونہی اس کے پیچھے پاگل ہوں۔ وہ خط بھی شاید اس نے نہیں دیا تھا۔ کسی سکھی سہیلی نے شرارت کی تھی میرے ساتھ۔''

خالدہ کی پیاری پیاری آنکھوں میں بڑے پیارے سے آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے دیا اور خاموش ہو گئی۔

کمرے میں کتنی ہی دیر گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ ہوا بھی اب تھم گئی تھی۔ دور کسی مائی لوراں کی بھٹی کے آس پاس کتے شور مچا رہے تھے۔ بے بے بخت نے اپنا جھریوں بھرا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کے ہاتھ پر موٹی موٹی نسیں ابھری ہوئی تھیں اور استبداد زمانہ کا پتا دیتی تھیں۔ خالدہ کے چہرے پر جھولتی ہوئی بالوں کی ایک لٹ کو اس نے بڑے پیار سے پکڑ کر اس کے کان کے پیچھے اڑسا اور لحاف اس کے کندھوں پر اچھی طرح درست کر دیا پھر وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی ''دھیئے! مرد کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہوتے ہیں جو عورت کے قدموں میں بچھے رہتے ہیں مگر جب عورت ان کو مل جاتی ہے تو پھر اسے پاٹے پرانے کپڑے کی طرح لپیٹ کر گھر کے ایک کونے میں رکھ دیتے ہیں۔ ایک وہ ہوتے ہیں جو نہ عورت کو پانے سے پہلے اس کے قدموں میں بچھتے ہیں نہ بعد میں اور ایک ایسے بھی ہوتے ہیں جو عورت کو پانے سے پہلے تو بڑے سخت ہوتے ہیں لیکن جب عورت ان کو مل جاتی ہے تو پھر ساری زندگی اس کو دل کی رانی بنا کر رکھتے ہیں۔ یہ وہ مرد ہوتے ہیں جو عورت کو پیار تو بہت کرتے ہیں مگر اسے اس کی مرضی سے پانا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں اشرف کا پیو حیدر بھی ایسا ہی تھا۔ وہ میرے چاچے کا پتر تھا۔ ہم چھوٹی عمر سے ہی ایک دوجے کو دیکھا کرتے تھے اور سوچا کرتے تھے کہ شاید ہماری شادی ہو جائے لیکن جب ہم بڑے ہوئے اور شادی کا موقع آیا تو ہمارے بڑوں میں کچھ ان بن ہو گئی، میری ماں اس شادی پر کچھ زیادہ خوش نہیں تھی۔ ہمیں یوں لگنے لگا کہ ہماری بات بن نہیں سکے گی۔ میرے گھر والے میری شادی کہیں اور کر دیں گے۔ ایک دن اشرف کے پیو نے مجھ سے کہا، تم اپنے گھر والوں کو اپنی صلاح کیوں نہیں بتاتی ہو۔ ان سے کیوں نہیں کہتی ہو کہ تم

صرف اور صرف مجھ سے شادی کروگی، ورنہ نہیں کروں گی۔ میں بس ہاں میں سر ہلاتی رہی کچھ نہیں سکی۔ ماں کے سامنے تو میری زبان ہی گونگی ہو جاتی تھی اور ابے کے سامنے بولنے میں دل میں خیال تک نہیں لاسکتی تھی۔ ماں نے جب مجھ سے پوچھا تو میں نے روتی آنکھ کے ساتھ کہہ دیا کہ ماں جو تم لوگوں کی مرضی ہے وہی میری مرضی ہے۔ اس کے بعد میں اشرف کے پیو سے بات کرنا بھی بند کردی تھی۔ مگر پھر اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ بات آپ بن گئی۔ بڑوں میں جو اَن بَن ہوئی تھی وہ خود ہی ختم ہوگئی۔ ہم دونوں کی شادی ہوگئی اشرف کے پیو کے دل میں جو گرہ بیٹھ گئی تھی وہ نہیں کُھلی۔

میں سمجھی نہیں بے بے؟ خالدہ نے سوال کیا۔

''وہ مجھ سے بڑا پیار کرتا تھا۔ شادی کے بعد بھی مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا، مگر کبھی ایک دم گُم صُم ہو جاتا تھا۔ کہتا تھا، بخت آور تو نے میرا مان نہیں رکھا۔ تو نے میری محبت کو بکری سمجھ کر اس کے گلے پر چُھری چلادی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ چُھری چلی نہ ورنہ تو نے تو سب کچھ ختم کر ہی دیا تھا۔ کاش تو نے اس مشکل گھڑی میرے حق میں ایک ہی دیا ہوتا۔'' یہ بات کر کے کسی وقت اس کی آنکھوں میں اتھرو آجاتے تھے۔ میں اسے سمجھاتی تھی۔ اپنی کم ہمتی پر اس سے معافی مانگتی تھی۔ وہ وقتی طور پر ٹھیک بھی ہو جاتا تھا، مگر کے دل میں بیٹھی ہوئی بات نکلتی نہیں تھی۔ اس وقت اشرف تین چار مہینے کا تھا۔ چھوٹی عید والی تھی۔ میں چار پانچ دن کے لئے ماں کے گھر جانا چاہتی تھی۔ اشرف کا پیو راضی نہیں ایک دن میرا والد آیا اور مجھے لے گیا۔ چار پانچ دن کے بجائے میں دو دن میں ہی واپس تو اشرف کے ابے نے مجھ سے بات تک نہ کی۔ ایک دن اس نے مجھ سے جھگڑا کیا۔ آنکھیں لال انگارہ ہوگئیں۔ جو اس کے منہ میں آیا بولتا چلا گیا۔ میں نے کسی بات کا جواب تو اس نے مجھے اور اشرف کو دھکا دے کر چار پائی پر گرادیا اور خود غصے میں پیر پٹختا ہوا باہر چلا پھر وہ کبھی واپس نہیں آیا۔ کبھی نہیں۔'' بے بے کی آواز بیٹھ گئی اور اس کی گدلی آنکھوں میں سی تیر گئی۔

''کہاں گیا تھا وہ؟''

ڈیڑھ دو سال تو اس کا کچھ پتا ہی نہیں چلا، پھر معلوم ہوا کہ وہ کراچی میں ہے۔

دروازے بنانے کا کام کرتا ہے۔ وہ ترکھان تھا اور بڑا زبردست کاریگر تھا۔ یہ سامنے جو تو پھل بوٹوں والا دروازہ دیکھ رہی ہے۔ یہ اسی کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے، بے بے نے بڑی محبت سے ایک پرانے شیشم کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

''پھر کیا ہوا بے بے، آگے بتا ناں۔'' خالدہ نے کہا۔

بے بے بختے نے ایک گہرا سانس لیا اور بولی ''کسی نے مجھے بتایا کہ اشرف کے پیو نے کراچی میں شادی کرلی ہے اور وہاں ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ میں اسے ڈھونڈتی ہوئی کراچی پہنچی پر دونوں باتیں غلط نکلیں۔ اشرف کے پیو نے شادی کی تھی اور نہ وہ بڑے ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ وہ اپنے تین یار دوستوں کے ساتھ ایک کھولی میں رہتا تھا اور سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے ملنے کی اور بات کرنے کی بڑی کوشش کی پر اس نے ایک نہ چلنے دی۔ میرے ساتھ دو سال کا اشرف تھا اور میرا بھائی تھا۔ ہم ایک مہینہ کراچی رہے اور ایک مہینہ وہ اپنے ڈیرے پر ہی نہیں آیا۔ تھک ہار کر ہم واپس آگئے۔ دو چار مہینے بعد میرا بھائی پھر اس کے پیچھے کراچی گیا۔ ہمیں پتا چلا کہ وہ لانچ پر بیٹھ کر مسقط کی طرف چلا گیا ہے۔ ان دنوں لوگ نئے نئے مسقط دبئی وغیرہ جانا شروع ہوئے تھے۔ اسی طرح دھیئے، چار سال اور گزر گئے پھر کسی بندے نے بتایا کہ اس نے حیدر کو۔ میرا مطلب ہے اشرف کے پیو کو کراچی میں دیکھا تھا۔ وہ بہت بیمار تھا اور ایک خیراتی اسپتال کے دروازے پر کھڑا تھا۔ میں اپنے بھائی کے ساتھ ایک بار پھر کراچی گئی اور ڈیڑھ دو مہینے اسے ڈھونڈتی رہی۔ آخر پھر تھک ہار کر واپس آگئی۔ اس کے ملنے کی آس آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ڈیڑھ دو سال اور اسی طرح گزر گئے پھر ایک روز اشرف کے پیو کی لاش گاؤں ہوگئی۔ وہ پچھلے دو سال سے چنیوٹ میں تھا۔ اسے دمہ ہو چکا تھا۔ جب تھوڑا بہت آرام آتا تھا، کام کر لیتا تھا۔ سردیوں کے موسم میں وہ زیادہ بیمار ہوا اور چنیوٹ کے ایک اسپتال میں ہی اس نے دم دے دیا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے گاؤں کا نام لیا تھا اور اپنے گھر کا پتا بھی بتایا تھا۔''

بے بے خاموش ہوگئی۔ کمرے کے اندر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی خاموشی نے ڈیرا ڈال لیا۔ کتنی ہی دیر بعد بے بے بختے کی بوڑھی بوجھل آواز کمرے میں گونجی ''دھی رانی! مرد کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ اشرف کا پیو ان مردوں میں سے تھا جو عورت کو اس کی مرضی سے ان کو مل جائے

تو وہ ساری زندگی اس کو دل کی رانی بنا کر رکھتے ہیں۔ میں جانتی ہوں اشرف کا پیو مجھ کو پاگلوں کی طرح چاہتا تھا پر میری ایک چپ نے اس کا دل اندر سے پتھر کر دیا۔ اشرف کے پیو سے میری لڑائی، اپنی ماں کے گھر جانے پر ہوئی تھی۔ یہ بات تو بس ایک بہانہ تھی۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں اصل بات کیا تھی۔ اصل بات وہی تھی جو وہ میرے سامنے ہزاروں بار کر چکا تھا۔ کہتا تھا بخت آور تو نے میرا مان نہیں رکھا۔''

خالدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا'' بے بے! مجھے پہلے ہی پتا تھا، تیری کہانی کچھ ایسی دکھی ہوگی۔''

بے بے بولی'' تجھے پتا ہے میں نے یہ کہانی تجھے کیوں سنائی ہے؟ یہ کہانی میں نے تجھے اس لئے سنائی ہے کہ مجھے لگتا ہے، تیرا واسطہ بھی اسی طرح کے مرد سے پڑا ہے جس طرح کے مرد سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ میں نے اسے دیکھا نہیں۔۔۔۔۔لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس لڑکے، حادی کی سوچیں بھی وہی ہوں گی، جو اشرف کے پیو کی تھیں۔ وہ تجھے اتنا چاہتا ہو گا کہ جس کا تو خیال بھی نہیں کر سکتی، پر وہ تجھے مرضی سے حاصل کرنا چاہتا ہوگا۔''

بے بے! تیرا خیال، غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''میرا خیال غلط نہیں ہو سکتا دھیئے!'' بے بے نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

خالدہ کو یوں لگا جیسے بے بے بجتے۔ پنگوڑے والے کو نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہی ہے، نہ جانتے ہوئے بھی جان رہی ہے۔ وہ ایک بار پھر پورے یقین سے بولی'' دھیئے! تم میرے والی غلطی نہ کرو۔ اگر تم اس سے پیار کرتی ہو تو ایک بار اس سے کہہ دو۔ اس سے کہہ دو کہ تم اس سے شادی کر لو گی۔ اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ پیار کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔۔۔۔ہاں کسی اور کے ساتھ پیار کر کے، کسی اور کے ساتھ جھوٹی زندگی گزارنا ضرور گناہ ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہوں ناں؟''

''پر بے بے۔۔۔۔''

''پر کچھ نہیں!'' بے بے نے اعتراض سے پہلے ہی اسے رد کر دیا۔'' میں تجھے یقین دلا رہی ہوں کملی دھی! یہ حادی بھی وہی ہے جو اشرف کا پیو حیدر تھا۔''

☆☆☆

خالدہ واپس اپنے گاؤں'' چانن پور'' پہنچ چکی تھی اور بات صرف خالدہ ہی کی نہیں تھی چانن پور کے جتنے لوگ گاؤں سے باہر رہتے تھے وہ میلے کے دنوں میں گاؤں کی طرف کھنچے چلے آتے تھے جیسے مقناطیس کی طرف لوہا چون۔۔۔۔۔۔ چانن پور کے علاوہ آس پاس کی بستیوں میں بھی تہوار کا سا سماں تھا۔ پوہ کی اٹھارہ تاریخ تھی۔'' سانول پیر'' کا میلہ شروع ہو چکا تھا۔ نرم سنہری دھوپ دور تک پھیلی تھی اور اس دھوپ میں فصلوں کے خوشے ناچتے محسوس ہوتے تھے۔ رہٹ کی چر چراہٹ میں موسیقی تھی اور چھوٹی نہر (سوئے) میں مٹی رنگا پانی گنگناتا ہوا چلتا تھا۔

گاؤں سے میلے کے مقام تک رنگ دار آنچلوں، اونچی پگڑیوں اور چمکتے لاچوں کی اٹھکیلیاں کرتی لمبی قطار تھی۔ خوب صورت آسمانی پنگوڑے والا حادی بھی میلے میں آ چکا تھا۔ خالدہ نے اسے دور مکئی کے کھیت کے اندر سے دیکھا اور دھوپ میں اس کے گالوں کا رنگ شہابی ہو گیا۔ اس کے سارے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں، سینے کے اندر جیسے دل نہیں دھڑک رہا تھا، ڈھول پیٹا جا رہا تھا۔ آج ایک عجیب سی وارفتگی تھی اس کے رویے میں پھر بے خودی کے سے عالم میں اس کے قدم آسمانی پنگوڑے کی طرف اٹھتے چلے گئے چھیموں اس کے ساتھ تھی۔ پنگوڑے کے پاس پہنچ کر خالدہ نے چھیموں کا ہاتھ اتنے زور سے دبا لیا کہ چھیموں بے چاری کو ہاتھ کی ہڈیاں کڑکڑاتی محسوس ہوئیں۔

''پاگلے! میرا ہاتھ تو چھوڑ۔'' چھیموں نے دانت پیس کر سرگوشی کی۔

خالدہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ اور زور سے دبا دیا۔

چھیموں نے ذرا جھلا کر ہاتھ اس سے چھڑایا، پھر زور سے بولی'' اس میں میرا کیا قصور ہے میری جان کیوں نکال رہی ہے۔ یہ تیرے سامنے کھڑا ہے، جو کہنا ہے کہہ لے اس سے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

کتنی بڑی بات چھیموں نے کتنی با آسانی سے کہہ ڈالی تھی۔ بعض اوقات ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہت مشکل باتیں بڑی آسانی سے نوکِ زبان پر آ جاتی ہیں۔

حادی حیران نظروں سے دونوں سہیلیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خالدہ پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ اس کے کانوں کی لوئیں تک سرخ ہو چکی تھیں۔

''کک۔۔۔کیا بات ہے؟'' حادی ذرا ہکلا کر بولا۔

چھیموں بولی''بات یہ ہے بھائی! کہ یہ تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر اس کی زبان کو چا
کا بڑا تالا لگ گیا ہے، پچھلے سال بھی لگ گیا تھا، اس سے پچھلے سال بھی اور اس سے پچھلے سال
بھی۔۔۔۔۔اور اس۔۔۔۔''

خالدہ نے چھیموں کا پراندہ پکڑ کر اسے زور سے جھنجوڑا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا.
چھیموں بڑی فارم میں تھی، چیخ کر بولی''میں شور مچا دوں گی۔۔۔۔سب کو جمع کر لوں گی۔ میر
کہہ دوں گی یہ ڈشکری مجھے اغوا کر رہی ہے۔''

اس کے انداز نے حادی کو بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ حادی کو مسکراتے دیکھ کر
خالدہ کے ہونٹوں پر بھی لرزتی مسکراہٹ بکھر گئی، پھر اس کی لانبی پلکیں جھک گئیں۔ ایک طر
سے یہ پلکیں چھیموں کی بات کی تائید میں جھکی تھیں۔ وہ بات جواب تک نہاں تھی عیاں ہو گئ
تھی۔

حادی نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ایک ساتھ دونوں سے مخاطب ہو کر بولا''آؤ بیٹھ
جھولے میں۔''

وہ دونوں بیٹھ گئیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد جھولا حرکت میں آ گیا۔ آج خالدہ کو لگ رہا تھ
کہ یہ جھولا نہیں حادی کی بانہیں ہیں۔ وہ ان بانہوں کے سہارے زمین اور آسمان کے درمیا
ہلکورے لے رہی ہے۔ اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے رگ و پے میں عجیب سی گ
گدی تھی۔

☆☆☆

ٹھیک تین ماہ بعد بہار کے موسم میں آسمانی پنگوڑے والے حیدر عرف حادی اور لطیف
کمہار کی خوب صورت بیٹی خالدہ کی شادی ہو گئی۔ شادی کے چند روز بعد خالدہ سائن کا گلا
جوڑا پہنے، ہاتھوں میں ست رنگی چوڑیاں سجائے اپنی دادی ساس کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی۔ و
کھوئی کھوئی آواز میں بولی''بے بے! تو اگر اس وقت بتا دیتی کہ حادی تیرا ہی پوتا ہے تو کی
ہو جانا تھا؟''

بے بے ہنستے بولی''بتا دیتی تو پھر بات میں وہ بات نہیں رہ جانی تھی۔ اب جو کچھ ہوا ہے

ں میں جھوٹ کوئی نہیں ہے۔ سب سچ ہی سچ ہے۔ جو بات تیرے دل کے اندر سے اٹھی تو نے
ی کی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' خالدہ نے تائیدی انداز میں سر ہلایا پھر ذرا توقف سے بولی''بے بے!
ے ایسے لگ رہا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ
ں تیرے گھر تیری نوں بن کے آؤں گی۔''

''بس دھیئے! یہ اوپر والا ہی جانتا ہے کہ اس نے کس کے لئے کیا سوچ رکھا ہے۔''

خالدہ کے چہرے پر سوچ کی شکنیں ابھریں، وہ بولی''بے بے! میں کل بھی تجھ سے
پوچھنا چاہ رہی تھی۔ یہ کیا بات ہے۔ تیرے سر کے سائیں کا نام حیدر تھا اور تیرے پوتے کا نام
ی حیدر ہی ہے؟''

بے بے مسکرائی اور پوپلے منہ سے بولی''مجھے پتا تھا' میری دھی یہ سوال ضرور پوچھے گی مجھ
سے۔ دھیئے! یہ جو تیرے سر کا سائیں حیدر ہے ناں، یہ ہو بہو اشرف کے پیو کی نقل ہے۔ وہی
ک وہی نین نقش، وہی قد کاٹھ۔ اس کا نام حیدر میں نے ہی رکھا تھا۔ بڑا ہو کر بھی یہ سولہ آنے
پر ہی نکلا ہے۔ وہی عادتیں، وہی گل بات، وہی سب کچھ۔ میں نے تین مہینے پہلے تجھ سے کہا
تھا ناں، یہ پنگوڑے والا بھی ویسا ہی مرد ہے جیسا اشرف کا پیو تھا۔ ہاں دھی رانی! دونوں میں
شاید ہی انیس بیس کا فرق ہو۔ اشرف کا پیو بڑا پیار کرنے والا تھا۔ یہ حادی بھی تجھ سے بڑا پیار
کرے گا۔ ساری حیاتی تجھے سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔ مجھے اپنے رب پر پورا بھروسا ہے رانی!
جو کچھ مجھے نہ مل سکا، وہ تجھے ضرور ملے گا۔ دیکھنا، ضرور ملے گا۔''

اس نے خالدہ کو گلے سے لگایا اور اپنے سانولے خشک ہونٹوں کے ساتھ خالدہ کی
تر و تازہ پیشانی کو چوم لیا۔

☆

اے وطن پاک وطن

ایف ایم یوسفی نے تکیے سے ٹیک لگائی اور ادھ کھلی کھڑکی سے دور مشرق کی طرف لگے۔ کھڑکی سے آگے سرسبز لان تھا، لان میں گل داؤدی کے پودے لہک رہے تھے منظر میں بلند و بالا عمارتوں کی جھلک تھی وہ گلِ داؤدی کے پودوں اور ان عمارتوں سے بہت آگے دیکھ رہے تھے۔ جب یوسفی صاحب اس انداز میں اپنے بیڈ روم کی کھڑکی۔ دیکھا کرتے تھے تو ان کے بچے سمجھ جاتے تھے کہ وہ کیا بات کہنے والے ہیں۔ وہ یہ با، شمار دفعہ سن چکے تھے، لیکن ہر دفعہ یہ بات نئی لگتی تھی۔ ہر مرتبہ وہ پوری دلچسپی اور توجہ سے سنتے تھے۔ یہ اس گم گشتہ جنت کی بات تھی جو قریباً چوتھائی صدی پہلے ان کے والد سے تھی۔ یہ پاکستان کی بات تھی۔

قریباً چوبیس سال پہلے جب ایف ایم یوسفی روزگار کی تلاش میں پاکستان سے آئے تھے تو ان کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی جلاوطنی اتنی طویل ثابت ہوگی۔ نے تو فقط اتنا سوچا تھا کہ دو تین سال یہاں رکیں گے۔ خوب محنت کر کے کچھ ڈالر کما اور پاکستان واپس لوٹ جائیں گے۔ مگر جب وہ امریکا آئے تو بس یہیں کے ہو کے ر دھیرے دھیرے غیر محسوس طور پر وہ اپنے گرد و پیش میں جکڑتے چلے گئے۔ پہلے ہر صبح انہیں اپنے وطن اور اپنے پیاروں کی یاد آتی تھی۔ پھر اس یاد میں وقفے آنے لگے۔۔۔ یوں ہوا کہ اس یاد کے لئے کچھ اوقات مخصوص ہوگئے۔ اب یہ یاد تہواروں پر آتی تھی وقت دل کے دروازوں پر دستک دیتی تھی جب موسم بدلتا تھا، یا پھر اس وقت جب ا سے آنے والے کسی مسافر سے ملاقات ہوتی تھی اور ان گلی کوچوں اور لوگوں کی باتیں

ہں جو ماضی کی دھند میں کہیں کھو چکے تھے۔۔۔۔ پھر یوں ہوا کہ ان ''مخصوص اوقات'' ںاں بھی یہ یاد کچھ کم کم آنے لگی۔۔۔۔۔ دوری جذبوں کی شدت کو کم کر رہی تھی اور وقت کی گرد ںیادیں دھندلاتی جا رہی تھیں۔ لیکن دل کے اندر جو کسک اور تڑپ تھی وہ کبھی بھی معدوم ہں ہوئی۔ ان چوبیس سالوں میں بے شمار نشیب و فراز آئے مگر اپنی گم گشتہ جنت سے یوسفی ماحب کا ذہنی رابطہ ایک لمحے کے لئے بھی ٹوٹا نہیں۔

انہوں نے امریکا میں ہی ایک پاکستانی نژاد لڑکی سے شادی کی، ان کے تین بچے ہوئے۔ بیٹے اور ایک بیٹی۔۔۔ بڑے بیٹے کا نام اسد، چھوٹے کا اسامہ تھا۔ لڑکی سب سے چھوٹی ی۔ اس کا نام زبیدہ تھا۔ وہ بڑی پیاری بچی تھی۔ اس کی پیدائش کے بعد ہی صحیح معنوں ں یوسفی صاحب کے حالات بدلنے شروع ہوئے تھے۔ وہ کاسمیٹکس کی جس فرم میں بطور والنی کنٹرولر کام کر رہے تھے، اسی طرح کی ایک چھوٹی سی فرم کی انہوں نے داغ بیل ڈالی تھی ار کامیاب رہے تھے۔ اب ان کا اپنا اچھا خاصا کام تھا۔ اپنا مکان، گاڑی، بینک بیلنس بھی کچھ وجود تھا۔ بڑے بیٹے کی شادی ہو چکی تھی۔ بہو سلیمہ بڑی خوش اخلاق اور فرماں بردار لڑکی تھی۔ فی صاحب کو وہ بالکل اپنے باپ کی طرح چاہتی تھی۔ سلیمہ کے والد اس کے بچپن میں ہی فوت وگئے تھے، شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے یوسفی صاحب کی ذات میں باپ کی گمشدہ محبت ڈھونڈ لی تھی۔ سلیمہ کا شوہر یعنی یوسفی صاحب کا بیٹا اسد اپنے کام کے سلسلے میں نیوجرسی رہتا تھا۔ شوہر کی موجودگی میں سلیمہ کے پاس بہت سا فارغ وقت ہوتا تھا۔ وہ اس وقت کا زیادہ تر حصہ یوسفی ماحب کے ساتھ شیئر کرتی تھی اور ان کی خدمت و دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی تھی۔ وفی صاحب کا چھوٹا بیٹا اسامہ قریباً بیس برس کا شوخ لڑکا تھا، وہ کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔۔۔۔ بھابی اور چھوٹی بہن زبیدہ کے ساتھ اس کی دلچسپ نوک جھوک اکثر جاری رہتی تھی۔ وہ میوزک کا رسیا تھا۔ اس کے کمرے میں موسیقی کی ہزاروں کیسٹیں موجود تھیں۔ اس کا وق دیکھتے ہوئے یوسفی صاحب نے اسے مشرقی اور خاص طور سے پاکستانی موسیقی سے بھی روشناس کرایا تھا۔ لہٰذا اسامہ کی میوزک لائبریری میں جہاں ایلوس پریسلے اور مائیکل جیکسن وغیرہ کی آڈیو کیسٹیں موجود تھیں وہاں احمد رشدی، مسعود رانا اور نور جہاں جیسے گلوکاروں کے سدا بہار اردو گانے بھی پائے جاتے تھے۔ زبیدہ کو لطیفے بازی کا چسکا تھا۔ اسے ہزاروں لطائف، با

تھے، نہ صرف یاد تھے بلکہ وہ انہیں پورے لوازمات کے ساتھ سنانا بھی جانتی تھی۔ اس کے وجود سے گھر میں ہر وقت رونق اور خوشیوں کا بسیرا رہتا تھا۔

سلیمہ شادی کے ڈھائی تین سال بعد بڑی دعاؤں اور منتوں کے بعد ''امید'' سے ہوئی تھی۔ اس خوشی نے گھر کی رونق میں اضافہ کر دیا تھا۔ ابھی نئے فرد کی آمد کے لئے انہیں تین چار ماہ سے زائد انتظار کرنا تھا لیکن وہ سب اتنے پُر جوش تھے جیسے یہ صرف تین چار دن کی بات ہو۔ گھر کے ماحول میں بے تکلفی بہت زیادہ تھی لہٰذا آنے والے ''نئے فرد'' کے بارے میں آزادانہ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی تھیں۔

ایک دن اسامہ نے سلیمہ کو چھیڑنے کی غرض سے زبیدہ سے مخاطب ہو کر کہا ''ہمارے بھتیجے کا نام وکی ہوگا۔''

زبیدہ جھٹ بولی ''لیکن یہ تو کوئی باوقار نام نہیں۔''

''بھئی! وقار تو اس نام کے اندر ہی موجود ہے۔'' اسامہ نے کہا ''اصل نام تو وقار ہی ہوگا ہم پیار سے وکی کہیں گے۔''

''مجھے یقین ہے بھیا! اس کے بال بالکل براؤن ہوں گے بھائی جان کی طرح۔''

''اور ناک رس ملائی کی طرح پیاری ہوگی، بھابی جیسی۔''

اور قد تو یقیناً تمہارے اوپر ہی جائے گا بھیا۔'' زبیدہ نے کہا ''بس اونٹ کا اونٹ ہوگا۔ چھ سوا چھ فٹ کا۔''

سلیمہ کا چہرہ شرم سے گلنار ہو رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ پیچھے جھاڑ کر نند اور دیور کے پیچھے پڑ جاتی لیکن یوسفی صاحب قریب ہی موجود تھے۔ ابھی تک وہ لاتعلق بنے بیٹھے تھے لیکن اگر باقاعدہ جھڑپ ہو جاتی تو انہیں متوجہ ہونا پڑتا۔

ان کے گھر میں آنے والے بچے کی باتیں اور اسی حوالے سے چھیڑ خانیاں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ جب یہ تینوں نوجوان یعنی سلیمہ، زبیدہ اور اسامہ یوسفی صاحب کے گرد اکٹھے ہوتے تو وہ بھی خود کو از سر نو تازہ دم اور جوان محسوس کرنے لگتے تھے۔ گھنٹوں محفل جمتی تھی، دنیا بھر کے موضوعات زیر بحث آتے تھے۔ ہر قسم اور ہر ڈھنگ کی بات ہوتی تھی۔۔۔۔۔۔ اور اکثر وہ بات بھی ہوتی تھی جسے شروع کرنے سے پیشتر یوسفی صاحب بیڈروم کی ادھ کھلی کھڑکی سے باہر

دیکھتے تھے، گل داؤدی کے پودوں اور بلند و بالا عمارتوں سے آگے کہیں دور۔۔۔۔۔ بہت دور مشرق کی طرف۔۔۔۔ اپنی گم گشتہ جنت کی طرف۔ یہ پاکستان کی بات ہوتی تھی اور ہر دفعہ نئی لگتی تھی۔

اس روز بھی یوسفی صاحب نے وہی پرانی لیکن بہت نئی بات کی۔ انہوں نے کھوئے کھوئے لہجے میں پاکستان کو یاد کیا، لاہور کے گلی کوچوں کا ذکر کیا۔ دریاؤں اور کھیتوں کھلیانوں کی بات کی، میلوں ٹھیلوں، تہواروں اور رسموں رواجوں کی کہانی سنائی۔ پاکستان کے بارے میں بولتے ہوئے یوسفی صاحب کی آواز خواب ناک ہو جاتی تھی اور ان کا لہجہ شہد میں ڈوب جاتا تھا۔ اس روز یہ ذکر اتنا اثر انگیز ثابت ہوا کہ اسامہ خم ٹھونک کر بولا ''پاپا جانی! بس اب اور برداشت نہیں ہوتا، پلیز ہمارے تحمل اور ہماری بردباری کا اب اور امتحان مت لیں۔ براہ مہربانی اب ہمیں سیدھے سیدھے پاکستان لے جائیں۔''

زبیدہ اچک کر بولی ''ہاں پاپا جانی، پچھلے سال بھی آپ نے کہا تھا کہ کرسمس کی چھٹیوں میں پروگرام بنائیں گے، اور اس سے پچھلے سال بھی یہی کہا تھا۔''

یوسفی صاحب مسکرائے ''میں اپنی زبان پر قائم ہوں۔ میں اس سال بھی یہی کہہ رہا ہوں۔''

''لیکن اس سال ہم واقعی جا رہے ہیں۔'' زبیدہ ٹھنکی ''پلیز پاپا جانی۔ ہمارا بہت دل چاہ رہا ہے۔''

اسامہ نے بھابی سلیمہ کو ٹہوکا دیا۔ ''بھابی! آپ بھی کچھ بولیں ناں۔ تھوڑی بہت حب الوطنی تو آپ میں بھی ہونی چاہیے۔''

سلیمہ مسکرا کر رہ گئی۔ یوسفی صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے بھئی! میں اس جھگڑے کا فیصلہ سلیمہ پر چھوڑتا ہوں۔ یہ جو بھی کہے گی تم مان لینا اور میں بھی مان لوں گا۔ اگر یہ خود کو اس قابل سمجھتی ہے کہ پاکسان جا سکتی ہے تو پھر ٹھیک ہے۔''

یہ اعلان سن کر زبیدہ اور اسامہ کے چہروں پر گلاب کھل گئے۔ انہوں نے ہرّا کا نعرہ لگایا اور سلیمہ سے لپٹ گئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ کرسمس کی چھٹیوں میں پاکستان جانے کا اصولی فیصلہ ہو گیا ہے، اب صرف رسمی کارروائی باقی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ بھابی کو منائیں اور وہ نہ

مائیں۔

ٹھیک ایک ماہ بعد کرسمس سے چند روز پہلے وہ لوگ امریکا سے پاکستان روانہ ہو رہے تھے۔

☆☆☆

جہاز کے کیپٹن نے جب پاکستان کی فضاؤں میں داخل ہونے کا اعلان کیا تو یوسفی صاحب کے دل کی کیفیت عجیب سی ہوگئی۔ انہیں یوں لگا جیسے برسوں بعد انہیں ماں کی آغوش ملی ہو اور انہوں نے اس میں اپنا تھکا ہوا سر رکھ دیا ہو۔ ان کا دل چاہا کہ وہ باقی مسافروں کی پروا کیے بغیر اپنے بچوں کی پیشانیوں کو چومیں اور ان سے اس بات پر مبارک باد وصول کریں کہ وہ چوبیس سال بعد اپنے ملک کی فضا میں موجود ہیں۔ اسامہ ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ زبیدہ اور سلیمہ پچھلی نشست پر تھیں۔ یوسفی صاحب نے کن انکھیوں سے ان کے چہرے دیکھے، یقیناً وہ تینوں بھی اس بات پر مسرت محسوس کر رہے تھے کہ آخر کار وہ اس ملک کی فضاؤں میں ہیں جس کی خوبصورت باتیں انہوں نے بارہا یوسفی صاحب سے سنی ہیں۔ روشنیوں کا شہر کراچی، زندہ دلان کا شہر لاہور، شاہینوں کا شہر سرگودھا، پھولوں کا شہر اسلام آباد، ملکہ کوہسار مری، اور دنیا کی حسین ترین برف پوش چوٹیاں۔

ان کی منزل لاہور تھی۔ لاہور میں یوسفی صاحب کے بڑے بھائی عاطف صاحب رہائش پذیر تھے۔ ان کا کپڑے کا کاروبار تھا۔ دولت مند تو نہیں تھے لیکن آسانی سے گزر بسر ہو جاتی تھی۔ وہ ابھی تک اسی آبائی مکان میں رہ رہے تھے جس کے گوشے گوشے سے یوسفی صاحب کی ان گنت یادیں وابستہ تھیں۔ چند منٹ بعد جہاز کے کیپٹن کی آواز دوبارہ مائیک پر گونجی۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''خواتین وحضرات! ہم تکلیف کے لئے معافی چاہتے ہیں۔ لاہور میں ابھی تک دھند ہے اور ''وزی بیلٹی'' کی مطلوبہ حد میسر نہیں لہٰذا ہم اسلام آباد ائر پورٹ پر اتر رہے ہیں۔''

وہ اسلام آباد ائر پورٹ پر اترے۔ یوسفی صاحب نے نیچے جھک کر بے ساختہ وطن کی سرزمین کو چھولیا۔ وہ آبدیدہ تھے۔ زبیدہ اور اسامہ نے یوسفی صاحب کو کندھوں سے تھام کر اٹھایا۔ وہ گہرے سانس لینے لگے، ہر سانس کے ساتھ وطن کی مہک ان کے سینے میں اتر رہی تھی اور ان

کی رگِ جاں میں سرایت کر رہی تھی۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ ان کے پر لگ جائیں۔ وہ اپنے بچوں کو اپنے ساتھ اڑاتے پھریں۔ انہیں پاکستان کے حوالے سے وہ سب کچھ دکھائیں جو برسوں سے دکھانا چاہ رہے ہیں اور وہ سب کچھ بتائیں جو مدتوں سے بتانا چاہ رہے ہیں۔

انہیں لاؤنج میں پہنچا دیا گیا اور انتظار کرنے کو کہا گیا۔ یہ انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پتا چلتا تھا کہ ابھی تھوڑا اور انتظار کرنا پڑے گا۔ پھر معلوم ہوا کہ انہیں ہوٹل پہنچایا جا رہا ہے، وہ لاہور کے لئے کل روانہ ہوسکیں گے۔ اس وقت شام کے سات ساڑھے سات کا وقت تھا۔ یوسفی صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ ہوٹل جانے کے بجائے بذریعہ سڑک لاہور جائیں گے۔ وہ ائر پورٹ سے رخصت ہو کر سیدھے راولپنڈی صدر پہنچے۔ یہاں ان کا ایک پرانا دوست اشفاق باجوہ رہتا تھا۔ اشفاق باجوہ کو معلوم تھا کہ یوسفی صاحب چوبیس سالہ ''بن باس'' کے بعد وطن واپس لوٹ رہے ہیں اور ان سے ملاقات ہوگی، لیکن اسے یہ ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ پاکستان پہنچتے ہی سیدھے اس کے گھر آ جائیں گے۔

اشفاق باجوہ کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ انہیں ہر صورت ایک رات اپنے ہاں رکھنا چاہتا تھا لیکن یوسفی صاحب کو لاہور پہنچنے کی اتنی جلدی تھی کہ ان سے ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اشفاق باجوہ نے یوسفی صاحب کی بے تابیاں دیکھتے ہوئے فوراً اپنی کار ان کے حوالے کر دی۔ اصل ڈرائیور تو چھٹی پر تھا، باجوہ صاحب نے اپنے ایک سینئر ملازم کو ان کے ساتھ کر دیا۔ یہ شخص اکثر قائم مقام ڈرائیور کے فرائض انجام دیتا تھا اور اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ موجود تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ وہ راولپنڈی سے لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ نئی جدید موٹر وے پر ان کا سفر بڑا سہل اور آرام دہ تھا۔ پاکستان میں پہنچ کر انہوں نے سب سے پہلے حسین وجمیل اسلام آباد دیکھا تھا، پھر راولپنڈی کے صاف ستھرے علاقے سے گزرے تھے، اب وہ ایک خوب صورت شاہراہ پر سفر کر رہے تھے۔ اطراف میں خوش نما پہاڑیاں اور سرسبز نشیب وفراز تھے۔ اپنے بچوں کے چہروں پر خوشی اور دلچسپی کے تاثرات دیکھ کر یوسفی صاحب کا سر فخر سے بلند ہو رہا تھا۔ وہ اس بات پر خوش ومطمئن تھے کہ انہوں نے اپنے بچوں کے سامنے پاکستان کا جو خوب صورت تصور پیش کیا تھا وہ کم از کم ابھی تک تو مجروح نہیں ہوا۔ وہ جانتے تھے

کہ پاکستان کی جو تصویر ان کے بچوں کو نظر آ رہی ہے، اس کے کئی نیم روشن یا تاریک پہلو بھی ہیں۔ خوش حالی، تعلیم اور جدت کے ساتھ ساتھ غربت، جہالت اور پسماندگی بھی یہاں پائی جاتی ہے، لیکن یہ کوئی انوکھی یا انہونی بات نہیں تھی۔ دنیا کے قریباً ہر ملک میں طبقاتی فرق موجود تھا۔ جہاں جسم ہوتا ہے وہاں سایہ بھی ہوتا ہے اور تو اور پیرس، لندن اور نیویارک جیسے شہروں میں بھی محلات کے سائے میں جھونپڑیاں اور گتے کے کیبن نظر آتے ہیں۔ بہر حال یوسفی صاحب کی خواہش تھی کہ ان کے بچوں کی نظروں سے پاکستان کی تصویر کے یہ نیم روشن یا تاریک پہلو اوجھل ہی رہیں تو بہتر ہے۔ وہ جب اپنے چند روزہ قیام کے بعد امریکا واپس لوٹیں تو ایک خوش حال، جدید اور خوبصورت پاکستان کا تصور ان کے ذہنوں میں مزید اجاگر ہو چکا ہو۔

راولپنڈی سے قریباً ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ایک جگہ ان کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ انہوں نے گاڑی بائیں کنارے پر کھڑی کی اور ٹائر بدلنے میں مصروف ہو گئے۔ شاہراہ کے کنارے کنارے آہنی جنگلا تھا۔ اس جنگلے کی دوسری جانب کھیت تھے اور کچے پکے راستے تھے۔ ان راستوں پر کبھی کبھی کوئی متحرک وجود بھی دکھائی دے جاتا تھا۔ یہ وہ دیہاتی تھے جو اس علاقے کے مکین تھے۔ اسامہ حیرت سے ایک شخص کو دیکھنے لگا جو سر پر چارے کا گٹھا لئے جا رہا تھا۔ زبیدہ نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا اور چیخ کر بولی ''اسامہ! وہ دیکھو کیا؟''

اسامہ نے بہن کی نگاہ کا تعاقب کیا، اسے ایک ٹریکٹر نظر آیا جس پر کئی افراد چیونٹیوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔

زبیدہ بولی ''اتنی مختصر سواری پر اتنے زیادہ مسافر۔ ایسے کرتب تو سرکس میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔''

کچھ دیر بعد انہیں ایک گدھا دکھائی دیا۔ گدھے پر سامان کے علاوہ ایک ضعیف العمر عورت بھی سوار تھی۔ ایک نوجوان لڑکا گدھے کو ہانکتا ہوا جا رہا تھا، اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔

یوسفی صاحب کی بہو سلیمہ بولی ''ڈیڈی! کتنا فرق ہے اس جنگلے کے اندر اور باہر۔ یوں لگتا ہے کہ یہ جنگلا دو زمانوں کو ایک دوسرے سے الگ کر رہا ہے۔ ایک طرف جدید دور نظر آ رہا ہے، دوسری طرف قرون اولیٰ کا وقت۔''

اسامہ بولا ''کیا پاکستان میں اکثر ایسے مناظر نظر آتے ہیں؟''

''نہیں بیٹا۔'' یوسفی صاحب نے جلدی سے کہا ''دور دراز دیہات میں ایسا ہوتا ہے۔ اب سڑکیں بن رہی ہیں۔ یقیناً یہ تھوڑے بہت لوگ بھی زندگی کی سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔''

تین چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک دیہہ تھا۔ وہاں مدھم روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ سلیمہ نے کہا ''ڈیڈی، یہ بجلی کی روشنی تو نہیں ہے، کیا ابھی کچھ علاقے بجلی سے بھی محروم ہیں؟''

''نہیں بھئی، بجلی تو دور دراز دیہات میں بھی پہنچ چکی ہے۔ یہاں شاید برقی رو منقطع ہو گی۔''

کہنے کو تو یوسفی صاحب نے یہ بات کہہ دی تھی ورنہ دل میں وہ بھی سوچ رہے تھے کہ پتا نہیں یہاں بجلی پہنچی ہے یا نہیں۔

منقطع ہونے کی بات یوسفی صاحب کے تینوں بچوں نے قدرے حیرت سے سنی تھی۔ شاید انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ کبھی اس طرح برقی رو بھی منقطع ہوتی ہے اور آبادیاں اپنے مکینوں سمیت اندھیرے میں ڈوب جاتی ہیں۔

یوسفی صاحب چاہ رہے تھے کہ وہ جلد سے جلد روانہ ہو جائیں۔ انہیں بچوں کا جنگلے کی دوسری جانب دیکھتے رہنا اور ادھر کے مناظر میں دلچسپی لینا کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ انہوں نے ڈرائیور سجاد سے کہا کہ وہ ذرا جلدی جلدی ہاتھ چلائے۔

سجاد نے پھر بھی ٹائر بدلنے میں دس پندرہ منٹ لگا ہی دیے۔ گاڑی دوبارہ روانہ ہوئی تو یوسفی صاحب خود کھڑکی والی سمت میں بیٹھ گئے۔ شاید وہ لاشعوری طور پر چاہ رہے تھے کہ بچے جنگلے سے پار کے مناظر پر زیادہ توجہ نہ دیں۔ یہ یوسفی صاحب کا وطن تھا۔ یہاں کی ہر چیز انہیں پسند تھی لیکن بچے تو پہلی بار یہاں آئے تھے، ان کا پہلا تاثر ''بہت اچھا'' ہونا چاہیے تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ لب سڑک ایک ریسٹوران میں ٹھہرے۔ یوسفی صاحب نے یہاں عشاء کی نماز ادا کی۔ تینوں بچوں نے چاکلیٹ کھائی اور ادھر ادھر گھومنے لگے۔ اسامہ بہت جلد گھل مل جاتا تھا۔ وہ ایک پجارو میں سوار فیملی سے باتیں کرنے لگا۔ وہ لوگ کافی پی رہے تھے۔

اصرار کر کے انہوں نے سلیمہ، زبیدہ اور اسامہ کو بھی کافی پلائی۔ کافی پی کر تینوں جنگلے کی طرف چلے گئے۔ جنگلے کی دوسری جانب کھیتوں کے ساتھ ساتھ ایک نیم پختہ راستہ نظر آ رہا تھا۔ یہاں ایک بیل گاڑی کیچڑ میں پھنسی ہوئی تھی۔ گاڑی بان اور اس کی ساتھی عورت دو بچوں کے ہمراہ گاڑی کو دھکا لگا رہے تھے۔ گاڑی بان دھکا لگانے کے ساتھ ساتھ بیلوں کو چھڑی سے ہانک بھی رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ منہ سے مسلسل مخ مخ کی آواز نکالتا تھا۔ یہ نظارہ تینوں بچوں کے لئے دلچسپ تھا۔

زبیدہ بولی ''ایسی بیل گاڑی تو میں نے میوزیم میں دیکھی تھی۔ بلکہ وہ مجھے اس سے کچھ بہتر ہی لگتی تھی۔''

اسامہ نے جنگلے سے منہ لگا کر زور سے ہانک لگائی ''اے گاڑی والے''! اسامہ کی دوسری آواز پر گاڑی بان مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اسامہ زور سے بولا ''اس گاڑی پر کیا لاہور جا رہے ہو تم؟''

''کہاں؟'' گاڑی بان نے پوچھا۔

''لاہور'' اسامہ نے دہرایا۔

اس نے بتیسی نکال دی ''کیوں مجاق کرتے ہو جی۔ ہماری گاڑیوں میں اتنا دم خم کہاں کہ لاہور جا سکیں۔ لاہور تو آپ جاتے ہیں اڑتے ہوئے۔''

سلیمہ نے اسامہ کو ٹوکا ''کیوں مذاق کرتے ہو بے چارے کا۔''

اسامہ فوراً سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا ''کیا ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔''

''کس طرح جی؟'' گاڑی بان ذرا نزدیک آتے ہوئے بولا۔

''دھکا لگا کر۔''

''ہوہو'' گاڑی بان ہنسا ''آپ کیسے آ سکتے ہیں۔ بیچ میں جنگلا ہے۔''

''ہاں ہاں میں بھول گیا۔'' اسامہ بولا ''ہم تو بند ہیں۔''

''آپ نہیں جی۔ ہم بند ہیں۔ آپ تو ہواؤں میں اڑ رہے ہیں۔''

یوسفی صاحب نماز پڑھ رہے تھے لیکن ان کے کانوں سے یہ گفتگو بھی ٹکرا رہی تھی۔ وہ سلام پھیرتے ہی بچوں کی طرف چلے آئے اور انہیں لے کر گاڑی میں آ بیٹھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کم

سے کم وقت ضائع ہو اور وہ بارہ بجے تک لاہور پہنچ جائیں۔

گاڑی ایک بار پھر چکنی ہموار سڑک پر رواں ہو گئی۔ قریب سے گزرتی ہوئی خوب صورت اسٹیشن ویگن میں شاید کوئی برگر فیملی بیٹھی تھی۔ بچوں نے زبیدہ اور اسامہ کو دیکھ کر وش کیا۔ زبیدہ اور اسامہ نے جواب دیا تو ویگن میں بیٹھے سب چھوٹے بڑے وش کرنے لگے۔

اسامہ ترنگ میں تھا، اس نے اپنی پسندیدہ کیسٹ ''چلے'' کر دی، اور گاڑی میں مائیکل جیکسن کی مدھم آواز گونجنے لگی۔ تاہم جلد ہی اس نے یوسفی صاحب کے کہنے پر کیسٹ بدل دی۔ اب مہدی حسن کا گایا ہوا خوب صورت قومی نغمہ گاڑی میں گونجنے لگا ''یہ وطن ہمارا ہے، ہم ہیں پاسباں اس کے۔۔۔۔''

دفعتاً گاڑی کو زوردار جھٹکا لگا اور وہ دھماکے سے ایک طرف جھک گئی۔ جو پہلا خیال یوسفی صاحب کے ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ گاڑی کا اگلا ٹائر برسٹ ہو گیا ہے۔ یہ وہی ٹائر تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے بدلا گیا تھا۔ گاڑی کی رفتار 125 میل سے کم نہیں تھی۔ وہ جھکنے کے بعد ایک دم لہرائی اور پھر لہراتی چلی گئی۔ مہدی حسن کی آواز چیخوں میں دب گئی۔ سڑک کے کنارے سرخ کار کے قریب ایک شخص کھڑا تھا، گاڑی نے اسے کچلا۔۔۔ پھر ایک دم یوسفی صاحب کو لگا کہ وہ ہوا میں اڑ گئے ہیں۔ ان کی گاڑی ہوا میں تھی اور اس کی چھت زمین کی طرف تھی۔ اس کے بعد یوسفی صاحب کو کچھ یاد نہیں رہا۔

☆☆☆

یوسفی صاحب کو دوبارہ ہوش آیا تو ان کے کانوں میں کراہیں گونج رہی تھیں۔ شروع میں وہ بالکل نہ پہچان سکے کہ یہ کس کی آواز ہے۔ پھر انہوں نے پہچانا، یہ اسامہ کی کراہیں تھیں، ان کے لخت جگر کی۔۔۔۔ انہوں نے تڑپ کر اٹھنا چاہا لیکن بازو اور سر سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں۔ وہ اپنی جگہ سن رہ گئے۔ چند لمحے بعد انہوں نے پھر ہمت کی اور اپنی تمام تر تکالیف کو برداشت کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ صرف چند فٹ کے فاصلے پر اسامہ موجود تھا لیکن اس طرح کہ اس کا زیریں دھڑ گاڑی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ گاڑی پچک کر ناقابل شناخت ہو گئی تھی۔ سرخ مٹی والی پتھریلی زمین پر شیشے بکھرے ہوئے تھے اور تیل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یوسفی صاحب لڑکھڑاتے ہوئے اسامہ کی طرف بڑھے

اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ ہوش میں تھا اور درد کی شدت سے بے قرار ہو رہا تھا۔ یوسفی صاحب نے اس کا منہ سر چوما، پھر اضطراری حرکت کے تحت گاڑی کی طرف بڑھے۔ ان کا بازو شاید ٹوٹ چکا تھا۔ دوسرے بازو سے انہوں نے گاڑی کو جنبش دینے کی دیوانہ وار کوشش کی لیکن ناکام رہے ہاں صرف اتنا ہوا کہ گاڑی تھوڑی سی ہلی اور اسامہ کے حلق سے دل دوز چیخیں نکل گئیں۔

یوسفی صاحب سینے کی پوری قوت سے چلائے ''زبیدہ۔۔۔۔۔سلیمہ!'' انہوں نے کئی مرتبہ دونوں لڑکیوں کو پکارا لیکن جواب نہیں ملا۔ وہ دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں چلانے لگے۔ دفعتاً ان کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ انہوں نے جھک کر دیکھا، یہ ان کی بہو سلیمہ تھی۔ وہ پشت کے بل پڑی تھی۔ اس کے بال خون میں بھیگے ہوئے تھے۔ ایک بازو کمر کے نیچے آ گیا تھا اور ایک ٹانگ بڑے عجیب انداز سے مڑی ہوئی تھی۔ یوسفی صاحب سلیمہ پر جھکے اور اسے جھنجوڑنے لگے ''سلیمہ بیٹی! آنکھیں کھولو بیٹی! سلیمہ آنکھیں کھولو۔''

لیکن سلیمہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ یوسفی صاحب نے کان لگا کر اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی پھر ناک کے سامنے ہاتھ رکھ کر سانس کی آمد و رفت محسوس کی۔ سانس چل رہی تھی مگر بہت آہستہ اور رک رک کر۔۔۔۔۔وہ اسے ابتدائی طبی امداد دینا چاہ رہے تھے لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی میخ کی طرح ذہن میں گڑا ہوا تھا کہ زبیدہ کو دیکھیں یا سلیمہ کو ابتدائی طبی امداد دیں۔ ایک بیٹی تھی، دوسری بہو تھی لیکن بیٹی کی طرح عزیز تھی۔ وہ اس پر جھک گئے۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے، اسے آکسیجن دی۔ اس کی دھڑکنیں بحال کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ساتھ وہ زبیدہ اور ڈرائیور سجاد کو بھی پکار رہے تھے۔ ان کی آواز کسی نوحے سے مشابہ تھی اور رات کا سینہ چیر کر بھر بھرے پتھروں سے ٹکرا رہی تھی۔

''پاپا جانی!'' یک دم انہیں زبیدہ کی آواز آئی۔ وہ کہیں پاس سے ہی کراہ رہی تھی۔ یوسفی صاحب خود کو گھسیٹتے ہوئے اس تک پہنچے۔ وہ الٹی ہوئی گاڑی کی دوسری جانب ایک پتھر کے ساتھ نیم دراز تھی۔ گاڑی میں سے گرنے والے کچھ کاغذات اس کے پاؤں کے قریب بکھرے تھے۔ وہ سسک کر بولی ''پاپا جانی! بھائی جان اور بھابی کہاں ہیں؟''

''وہ ٹھیک ہیں۔'' یوسفی صاحب نے لرزاں آواز میں کہا اور اسے سینے سے چمٹا لیا۔

جسم کو جھٹکا لگا تو وہ زور سے چیخی۔ اس وقت یوسفی صاحب کو اندازہ ہوا کہ وہ جو ٹھیک نظر آ رہی ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی زخمی ہوئی ہے۔ زبیدہ کا ہاتھ اپنے پہلو پر تھا۔ یوسفی صاحب نے وہاں ہاتھ لگایا تو وہ خون سے تر بتر ہو گیا۔ زبیدہ وہیں بیٹھی بیٹھی یوسفی صاحب سے لپٹ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

یوسفی صاحب نے اسے بمشکل خود سے جدا کیا اور مدد کے لئے پکارنے لگے ''کوئی ہے، کوئی ہے۔'' پھر وہ ڈرائیور سجاد کو آوازیں دینے لگے ''سجاد۔۔۔سجاد'' ان کی آواز دور تک گونجی لیکن یہ لاحاصل گونج تھی۔

''ڈرائیور۔۔۔تو بھاگ گیا ہے۔'' زبیدہ نے اٹک اٹک کر کہا۔

''کہاں بھاگ گیا؟'' یوسفی صاحب کا لہجہ حیرت ناک تھا۔

'بس ڈر کر بھاگ گیا ہوگا۔۔۔۔۔اوپر۔۔۔۔روڈ پر ایک آدمی۔۔۔بھی تو نیچے آ گیا تھا۔''

یوسفی صاحب کا دماغ چکرا رہا تھا۔ ان کے گرد تین شدید زخمی موجود تھے، وہ خود بھی زخمی تھے اور لہولہان تھے۔ ان کی گاڑی شاہراہ سے قریباً چالیس فٹ نیچے کھائی میں گری تھی۔ یہاں نیم پختہ پتھر تھے اور جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ یوسفی صاحب کی سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا۔ وہ مدد لینے کے لئے سڑک کی طرف بڑھے۔ چڑھائی کافی مشکل تھی، خاص طور سے اس حالت میں کہ ان کا ایک بازو ٹوٹ کر قریباً لٹک رہا تھا اور ایک گھٹنا بھی شدید زخمی تھا۔ وہ گرتے پڑتے اور کراہتے ہوئے اوپر پہنچے۔ جہاں سے گاڑی کھائی میں گری تھی وہاں جنگلا ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ سڑک پر چلے گئے۔ سڑک پر دور تک ٹائر گھسٹنے کے نشان تھے لیکن سرخ کار کے قریب کھڑا جو شخص کچلا گیا تھا وہ وہاں نظر نہیں آ رہا تھا، نہ ہی وہ سرخ کار دکھائی دے رہی تھی۔ یوسفی صاحب نے فوراً جان لیا کہ وہ کار زخمی کو لے کر چلی گئی ہے۔

اب سڑک بالکل صاف تھی اور گاڑیاں ان کے قریب سے یوں فراٹے بھرتی گزر رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یوسفی صاحب سڑک کی بائیں لین پر چلے گئے اور گاڑیوں کو رکنے کا اشارہ کرنے لگے۔ انہیں یقین تھا کہ ابھی چند سیکنڈ میں کئی گاڑیاں رک جائیں گی اور اتنے لوگ اکٹھے ہو جائیں گے کہ نہ صرف الٹی ہوئی گاڑی سیدھی کر سکیں گے بلکہ زخمیوں کو اٹھا کر

سڑک پر بھی لایا جا سکے گا لیکن انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کوئی گاڑی ان کے اشارے پر ر
نہیں۔

وہ سڑک پر کچھ اور آگے چلے گئے، اور دونوں ہاتھ پھیلا کر گاڑیوں کو رکنے کا اشارہ کر
لگے۔ ان کی قمیض اور واسکٹ لہولہان تھی اور سر سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ تیز رفتار گاڑیو
کی ہیڈ لائٹس ان کے سراپا کو روشن کر رہی تھیں۔ یوسفی صاحب کو یقین تھا کہ گاڑیوں میں بیٹ
لوگ ان کا حلیہ دیکھ رہے ہیں۔ اگر وہ انہیں لہولہان دیکھ رہے تھے تو گاڑیاں کیوں نہیں روک
رہے تھے؟ یوسفی صاحب نہیں جانتے تھے کہ ان کے سوال کا جواب ان کے سوال ہی میں پوشی
ہے۔ وہ لہولہان تھے۔ اس لئے کوئی گاڑی ٹھہر نہیں رہی تھی۔ کون تھا جو رات کے اس پہر ا
گاڑی روکتا اور اَن دیکھی مشکلات و آفات کو دعوت دیتا۔ لہٰذا یوسفی صاحب کا ہاتھ ہلانا ا
پکارنا بےسود رہا۔ ٹریفک یوں بھی زیادہ نہیں تھی۔ اوسطاً ایک منٹ کے بعد ایک گاڑی گزر ر
تھی۔ زیادہ تر کاریں تھیں یا ویگن وغیرہ تھیں۔ ان گاڑیوں میں بیٹھے لوگ قریب سے گزر
ہوئے گاڑیاں آہستہ کرتے تھے اور باقاعدہ یوسفی صاحب کو دیکھتے تھے، وہ یوسفی صاحب ک
فریادی آواز بھی سنتے ہوں گے لیکن ایک دہشت زدہ تاثر کے سوا ان کے چہروں پر کچھ نمودا
نہیں ہوتا تھا۔ وہ جیسے کسی اور سیارے کی مخلوق تھے۔ یوسفی صاحب اور ان کے درمیان ہزاروں
لاکھوں میل کا فاصلہ تھا۔ یہ اسی قسم کے کارنشین تھے جو راستے میں یوسفی صاحب اور ان کے بچوں
کو دیکھ کر روش کرتے تھے، مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے تھے اور۔۔۔ ڈرنکس آفر کرتے تھے، اب و
یوسفی صاحب کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے فرشتہ اجل کو دیکھ رہے ہوں۔

ایکا ایکی یوسفی صاحب کی آس بندھی۔ انہیں ایک بس نظر آئی تھی۔ یقیناً بس میں زیاد
سواریاں تھیں۔ جب لوگ زیادہ ہوں تو ان کا حوصلہ بلند ہوتا ہے اور وہ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر
''مدد کے جذبے'' سے فوراً رک جاتے ہیں۔ یوسفی صاحب ہیجانی عالم میں بس کے قریباً سامنے
کھڑے ہو گئے تھے لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے بس کو پہلو بچا کر اپنے
پاس سے گزرتے دیکھا۔

یوسفی صاحب چیختے رہ گئے ''خدا کے لئے۔۔۔ خدا کے لئے رکو۔۔۔ میرے بچے م
رہے ہیں۔ خدا رسولؐ کے واسطے میری مدد کرو۔''

سڑک پر ایمرجنسی ٹیلی فون موجود تھے لیکن کام نہیں کر رہے تھے۔ یوسفی صاحب نے قریبی فون کو بہت ٹھونکا بجایا لیکن اس پر ڈائل نہ کر سکے۔ پھر انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کیا نمبر ڈائل کرنا ہے۔ پٹرولنگ پولیس بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ یوسفی صاحب نے سخت بےقراری کے عالم میں تین چار منٹ مزید سڑک پر گزارے لیکن جب کسی گاڑی کو روکنے میں ناکام رہے تو سڑک سے اتر آئے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کے بچے کس حالت میں ہیں۔ ڈھلوان پر گھسٹتے اور لڑھکتے ہوئے وہ جائے حادثہ پر پہنچے۔ نظارہ دردناک تھا۔ اسامہ اسی طرح کار تلے دبا ہوا تھا۔ اس کی بہن نہ جانے کس طرح گرتی پڑتی اس کے پاس پہنچ گئی تھی اور اب اس سے لپٹ کر رو رہی تھی۔

''پاپا جانی! کچھ کریں۔۔۔ نہیں تو بھائی کو۔۔۔ کو کچھ ہو جائے گا۔'' زبیدہ نے دہائی دی۔

وہ اپنے شدید زخمی بھائی سے لپٹی ہوئی تھی اور خود بھی شدید زخمی تھی۔ یوسفی صاحب نے جلدی سے دونوں بچوں کا معائنہ کیا۔ دونوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اسامہ اب نیم بےہوش ہو چکا تھا۔ اس کے حلق سے خرخر کی آواز نکل رہی تھی۔ یوسفی صاحب اپنی بہو سلیمہ کے پاس پہنچے۔ وہ اسی طرح بےحس و حرکت پڑی تھی۔ یوسفی صاحب کا دل گواہی دے رہا تھا کہ سلیمہ حالت نزع میں ہے۔ اس کے پیٹ میں بچہ تھا، جس کا نام وقار عرف وکی تھا، جس کے بال ہلکے براؤن اور جس کی ناک بہت خوب صورت تھی، جس کا پورا قد کسی طرح بھی سوا چھ فٹ سے کم نہیں تھا۔ وقار ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا لیکن اس کی معصوم مسکراہٹوں کے خواب دیکھے جا رہے تھے، اس کے لئے کھلونے خریدے جا رہے تھے۔ اب وہ وقار اپنی ماں کے ساتھ ہی دم توڑ رہا تھا۔

یوسفی صاحب نے سلیمہ کے سینے سے کان لگایا۔ دھڑکن کسی بہت گہرے کنوئیں میں چمکنے والے پانی کی طرح ہلکورے لے رہی تھی۔ یوسفی صاحب نے گاڑی میں سے تھرماس نکالی اور سلیمہ کے منہ میں پانی انڈیلنے کی کوشش کی لیکن پانی اس کی باچھوں سے بہہ گیا۔۔۔۔ یوسفی صاحب ایک بار پھر بےقرار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ زبیدہ نے دل دوز آواز میں پوچھا ''پاپا! کوئی آتا کیوں نہیں؟''

''وہ۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔'' یوسفی صاحب بولتے ہوئے رک گئے۔

''پاپا! کیا بات ہے، آپ کسی کو لائے کیوں نہیں؟''

''وہ بیٹی۔۔۔۔۔میں۔۔۔۔۔میں اوپر پہنچ ہی نہیں سکا۔ ڈھلوان بہت زیادہ ہے۔''

اس حالت میں بھی یوسفی صاحب کے ذہن میں خیال موجود تھا کہ وہ اپنے وطن اور وطن کے لوگوں کے بارے میں کوئی منفی تاثر نہ ابھاریں۔

بیٹی کو طفل تسلی دے کر وہ ایک بار پھر سڑک کی طرف لپکے۔ اس مرتبہ ڈھلوان پر چڑھنا انہیں پہلے سے مشکل محسوس ہوا۔ شاید وہ اپنے دم توڑتے بچوں کو دیکھ کر ان کے اندر توانائی مرتی جا رہی تھی۔ سڑک پر پہنچ کر وہ عین درمیان میں کھڑے ہو گئے، اور دونوں ہاتھ کھول کر چلانے لگے ''رکو۔۔۔۔۔خدا کے لئے رک جاؤ۔''

وہ ہر آنے والی گاڑی کا راستہ روکنے کی سعی کر رہے تھے۔ لیکن گاڑیاں ان سے کتراتی ہوئی گزرتی جاتی تھیں۔ یہ کیا تھا؟ کیا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے تھے، یا پھر کسی سامری نے اس شہر کے لوگوں کو پتھر کر رکھا تھا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوتا، ایسا تو شاید کہیں نہیں ہوتا۔

تین چار منٹ کی کوشش کے بعد ایک گاڑی رکی۔ یہ ایک ٹویوٹا کار تھی۔ یوسفی صاحب جھک کر کار کی کھڑکی تک پہنچے، کار میں دو خواتین موجود تھیں۔۔۔۔۔ڈرائیور کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ذرا تعجب سے اس ٹوٹے ہوئے جنگلے (آہنی جالی) کو دیکھ رہا تھا جہاں سے گاڑی کھائی میں گری تھی۔ یوسفی صاحب روتے ہوئے بولے ''بھائی صاحب، ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ گاڑی نیچے کھائی میں پڑی ہے، میرے بچے مر رہے ہیں۔۔۔۔۔ پلیز مدد کریں۔''

ادھیڑ عمر شخص کے چہرے پر سخت تشویش دکھائی دینے لگی تھی۔ پیچھے بیٹھی ہوئی عورتیں بھی ہراساں تھیں۔ ادھیڑ عمر شخص بولا ''مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے، لل۔۔۔۔۔لیکن میرے ساتھ عورتیں ہیں، میرے لئے رکنا ممکن نہیں، لیکن میں آپ کے لئے کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے آگے پوسٹ پر مجھے کوئی پولیس والا نظر آ جائے۔''

مگر میرا بیٹا مر رہا ہے۔ وہ گاڑی کے نیچے دبا ہے۔ یوسفی صاحب نے گھگیا کر کہا۔

ادھیڑ عمر شخص نے غالباً ڈرائیور کو ٹہوکا دیا تھا۔ یوسفی صاحب کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے

ہی گاڑی حرکت میں آ گئی تھی۔ آٹومیٹک شیشہ کھڑکی کو بند کر چکا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص نے یوسفی صاحب کو دیکھ کر تسلی آمیز انداز میں ہاتھ ہلایا اور گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

یوسفی صاحب سکتے کی سی حالت میں کھڑے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ تو انہیں معلوم تھا کہ پاکستان میں روڈ ایکسیڈنٹس کے بعد طبی سہولتیں کافی دیر سے مل پاتی ہیں اور انہیں یہ بھی پتا تھا کہ راہ گیر ایسے موقعوں پر رضاکارانہ خدمات پیش کرنے میں تامل سے کام لیتے ہیں مگر انہیں یہ پتا نہیں تھا کہ ایک نہایت خوفناک حادثے کے بعد ایسی بے حسی بلکہ سفاکی کا مظاہرہ بھی کیا جاتا ہے۔ اب تو امید کی ایک ہی کرن تھی کہ پٹرولنگ پولیس کا کوئی اہلکار وہاں پہنچ جاتا۔ راستے میں انہوں نے اِکا دُکا پولیس اہلکار موٹر سائیکلوں پر سوار دیکھے تھے لیکن بلا کی سردی میں شاید یہ لوگ بھی کہیں کونے کھدروں میں جا چھپے تھے۔ یا پھر سنگین حادثے کے بعد یہ سنگین ترین اتفاق تھا کہ ابھی تک کوئی پولیس والا یہاں سے نہیں گزرا تھا۔

بے قرار ہو کر یوسفی صاحب نے جائے حادثہ کا ایک اور چکر لگایا۔ سلیمہ آخری سانسیں لے رہی تھی، اسامہ کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ زبیدہ نے چیخ چیخ کر اپنا گلا بٹھا لیا تھا ''پاپا! کب آئے گی مدد؟'' اس نے بلک کر پوچھا۔

''مم۔۔۔۔۔میں کوشش کر رہا ہوں۔''

''کیا گاڑیاں نہیں رک رہیں؟''

''نن۔۔۔۔۔نہیں بیٹا'' وہ جلدی سے بولے ''میں۔۔۔۔۔اوپر پہنچ ہی نہیں پا رہا ہوں۔''

وہ پھر گرتے پڑتے اوپر پہنچے۔ وہ ہر گزرنے والی گاڑی کو رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ پانچ چھ گاڑیاں تو حسب سابق رفتار کم کیے بغیر گزریں لیکن پھر ایک گاڑی آہستہ ہوئی اور رک گئی۔ یہ ایک سوزوکی کار تھی۔ اس میں تین فیشن ایبل افراد موجود تھے۔ دو نوجوان تھے، ایک درمیانی عمر کا تھا۔ درمیانی عمر کا شخص پچھلی نشست پر لیٹا تھا، اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ ٹوٹا ہوا جنگلا اور یوسفی صاحب کی حالت دیکھ کر ان کے چہروں پر بھی ہراس نظر آنے لگا۔ یوسفی صاحب نے روتے ہوئے انہیں بتایا کہ ان کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ان کے دو بچے

اور بہو نیچے کھائی میں شدید زخمی حالت میں پڑے ہیں۔ ایک بچہ گاڑی کے نیچے دبا ہوا ہے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا نوجوان بولا'' انکل! آپ کو نہیں معلوم کہ رکنے والوں کو کتنا خوار ہونا پڑتا ہے، پولیس حشر خراب کر دیتی ہے۔۔۔۔۔ ہم تو۔۔۔۔۔ ہم تو ویسے بھی ایمرجنسی میں ہیں۔ اسپتال جا رہے ہیں۔''

دوسرا نوجوان بولا'' آپ پیچھے کی طرف جائیں۔ پچھلے پل کے نیچے میں نے دو پولیس والوں کو کھڑا دیکھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو فرلانگ کا فاصلہ ہوگا۔''

پہلا نوجوان بولا'' اگر ہمیں آگے کوئی پولیس والا نظر آیا تو اسے اطلاع دیتے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ یوسفی صاحب کو یقین نہیں آیا کہ اتنی دل دوز فریاد کے سامنے ساعت اتنی بے حس بھی ہو سکتی ہے۔ سخت سردی تھی مگر ان کا حلق اب سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی ان میں کہ یوں چھوڑ کر جانے والوں سے رحم کی اپیل کر سکتے۔ وہ چند لمحے ساکت کھڑے رہے پھر گلیوں میں گھومنے والے کسی دیوانے کی طرح ڈگمگاتے ہوئے شمال کی طرف چل پڑے۔ کار والوں نے اسی سمت میں پولیس والوں کی نشان دہی کی تھی۔ راستے میں جو گاڑی نظر آ رہی تھی وہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کبھی بھاگتے اور کبھی چلتے ہوئے وہ پل تک پہنچے تو وہاں کوئی متنفس نہیں تھا۔ اگر پولیس والے وہاں تھے بھی تو اب آگے روانہ ہو چکے تھے۔ یوسفی صاحب کا دل چاہا کہ وہ کسی تیز رفتار گاڑی کے سامنے آ کر خودکشی کر لیں۔ کم از کم اپنے بچوں کے مردہ چہرے دیکھنے سے تو بچ جائیں گے۔ لیکن یہ حرام عمل تھا۔ پھر ایک سوال یہ بھی تھا کہ وہ مر کر اپنے جاں بلب بچوں کا کیا بھلا کر سکیں گے۔

ایک بار پھر وہ اپنے پارہ پارہ جسم کو سمیٹتے ہوئے جائے حادثہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ٹوٹے ہوئے بازو میں درد کا دریا بہہ رہا تھا۔ انہیں آس تھی کہ شاید ٹوٹے ہوئے جنگلے کو دیکھ کر کوئی گاڑی سوار یا پولیس اہلکار موقع پر رک گیا ہو۔ لیکن وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ بس کچھ آوارہ کتے اردگرد گھوم رہے تھے اور تفتیشی انداز میں گاڑی کو سونگھ رہے تھے۔ رو رو کر زبیدہ کی آواز اب بیٹھ گئی تھی اور گلے سے صرف ''گیں گیں'' کی صدا نکل رہی تھی۔ یوسفی صاحب نے سب سے پہلے سلیمہ کو دیکھا۔ شاید اس کی تقدیر میں تھا کہ وہ آخری ہچکی اپنے پیارے سسر کے ہاتھوں

میں لے گی۔ یوسفی صاحب کے ہاتھوں میں اس کا جسم چند بار جھرجھرایا اور ساکت ہو گیا۔ یوسفی صاحب نے اس کی نبض دیکھی، وہ مر چکی تھی۔ وہ اس وقار احمد کی نبض نہیں دیکھ سکتے تھے جو اس کے پیٹ میں تھا لیکن یقینی بات تھی کہ وہ بھی مر گیا ہے۔ وہ معصوم ابھی اس قدر کمپوز ہی نہیں ہوا تھا کہ ماں کے بغیر رہ سکتا۔

یوسفی صاحب نے خاموشی سے بہو کی پیشانی چومی اور سینے میں بلند ہونے والے نوحے کو بمشکل ہونٹوں تک آنے سے روکا۔ انہوں نے سلیمہ کا سر گود سے نکالا اور اسے آہستگی سے زمین پر لٹا کر زبیدہ اور اسامہ کے پاس آ گئے۔ ایک دم ان کی ساری ہمتیں جواب دے گئی تھیں، وہ تھک کر چور ہو گئے تھے۔ بس۔۔۔ وہ گر جانا چاہتے تھے، کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ انہوں نے ایک نظر ویرانے کے تاریک درختوں کو دیکھا اور پھر اوپر اس شاہراہ کو دیکھا جہاں زندگی سو ڈیڑھ سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے رواں تھی۔ رواں زندگی سے صرف اور صرف ڈیڑھ سو فٹ کے فاصلے پر وہ ایک لق و دق ویرانے میں مر رہے تھے۔

وہ تھکے ہارے انداز میں اپنے دونوں زندہ بچوں کے قریب گر گئے۔ ان کا اپنا خون بھی بہت بہہ چکا تھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ دو قدم چلنے کی سکت بھی اب ان میں نہیں تھی۔ وہ اس ٹھٹھرے ہوئے تاریک ویرانے میں کسی آبادی کا سراغ لگانا چاہتے تھے مگر انہیں معلوم تھا کہ اب وہ پندرہ بیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی گر جائیں گے اور پھر شاید کبھی نہیں اٹھ سکیں گے۔

اسامہ کی کراہیں اب بند ہو گئی تھیں۔ وہ بے ہوش تھا۔ زبیدہ بھائی سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے خون آلود ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ چھوڑے تھے۔ گاہے گاہے ایک دل دوز ہچکی اس کے سینے سے اٹھتی تھی اور تاریکی میں مدغم ہو جاتی تھی۔ یوسفی صاحب نے دیکھا، زبیدہ کا پہلو ان کے اندیشوں سے کہیں زیادہ زخمی تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی پسلی قمیص پھاڑ کر باہر نکل آئی تھی۔ وہ جس جگہ لیٹی تھی وہاں سرخ پوٹھوہاری مٹی پر خون کا سیاہ دھبا سا بن گیا تھا۔ یہ ان کی بیٹی کا خون تھا۔ وہی بیٹی جو ایک گھنٹہ پہلے گاڑی میں ان کے ساتھ بیٹھی تھی اور بڑے چاؤ سے انہیں مشورہ دے رہی تھی کہ پاکستان آئے ہیں تو بھائی کے لیے اچھی سی دلہن ڈھونڈ کر جائیں گے۔

جواب میں بھائی نے کہا تھا'' اور ایک دلہا بھی۔''

اب وہ دونوں مر رہے تھے۔ ان کے سر پر ٹھہرا ہوا تاروں بھرا آسمان تھا۔ مثالی پیار تھا دونوں میں۔ اکٹھے جینے مرنے کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔ اب وہ اکٹھے تھے اور قدم قدم کسی انجانی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ زبیدہ کچھ کھوسی گئی تھی۔ یقیناً وہ سوچ رہی تھی کہ ابھی تک مسیحاؤں کے مہربان ہاتھ ان تک پہنچ کیوں نہیں پائے؟ یا پھر وہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ ڈھلوان کتنی خطرناک ہے جسے اس کے پاپا جانی کوشش کے باوجود عبور نہیں کر سکے اور سڑک تک نہیں پہنچ سکے؟

یوسفی صاحب ہچکیاں لیتے ہوئے اپنے دونوں بچوں کے قریب لیٹ گئے۔ انہوں نے دونوں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ زبیدہ نے باپ کی لاچاری محسوس کی تو اس کے رونے میں تیزی آ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اب امید ختم ہو گئی ہے، اب انہیں موت کا انتظار کرنا ہوگا۔ وہ اٹکی اٹکی سانسوں کے درمیان بولی ''پاپا جانی! کیا سڑک بہت دور ہے؟''

انہوں نے کہا ''ہاں بیٹا! سڑک بہت دور ہے، اور بہت بلندی پر بھی، ہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔''

زبیدہ کی سانسیں الجھنے لگیں۔ وہ باپ اور بھائی کے درمیان تھی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ بے ہوش بھائی اور دوسرا باپ کے سینے پر رکھ دیا۔ یوسفی صاحب نے بڑی ملائمت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس ''ملائم ہاتھ والی'' ننھی سی گڑیا پر غشی طاری ہوتی جا رہی تھی، پھر وہ بھی بھائی کی طرح بے ہوش ہو گئی۔

خبر نہیں کتنی دیر اسی طرح گزری۔ یوسفی صاحب بتدریج ٹھنڈک اور نقاہت کے گہرے سمندر میں اترتے چلے جا رہے تھے، شاید وہ بھی ڈوب رہے تھے۔

اچانک انہیں کہیں دور سے ٹخ ٹخ کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے اپنے ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا۔ یہ آواز انہوں نے کہاں اور کب سنی تھی۔ ایک دم ذہن میں جھماکا ہوا۔ یہ اس گاڑی بان کی آواز تھی جو تین چار میل پیچھے انہیں ملا تھا۔ ''ریفریشمینٹ پوائنٹ'' کے قریب کھیتوں میں اس کی بیل گاڑی پھنسی ہوئی تھی اور وہ اپنی بیوی کے ہمراہ اسے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوسفی صاحب کے مسمار جسم کے اندر توانائی کی لہر سی اٹھی۔ انہوں نے بمشکل سر اٹھا کر دیکھا۔ انہیں بیل گاڑی کا ہیولا نظر آیا۔ بیل گاڑی کے نیچے لالٹین جھول رہی تھی۔ وہ لحہ بہ لحہ

ان کے قریب آتی جا رہی تھی۔ ٹخ ٹخ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں ٹن ٹن بج رہی تھیں۔ پھر انہوں نے دیکھا بیل گاڑی رک گئی ہے۔ گاڑی بان جو ایک پنجابی گبرو تھا، انہیں اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں بیل ہانکنے والی چھڑی تھی۔ وہ چھلانگیں لگاتا ہوا ان کے قریب پہنچا، پھر اس نے اپنی بیوی کو آوازیں دیں ''رابعہ۔۔۔۔۔۔ رابعہ۔۔۔۔''
رابعہ دونوں نوعمر لڑکوں کے ساتھ لپکتی ہوئی آئی۔

تب یوسفی صاحب نے دیکھا کہ وہ سب لوگ الٹی ہوئی گاڑی کو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پنجابی گبرو کے حلق سے زور لگاتے وقت شیر جیسی دہاڑ نکل رہی تھی۔ اس کی توانا بیوی اور آٹھ نو سال کے دونوں بچے بھی زور لگا رہے تھے۔ یوسفی صاحب اپنی بچی کھچی توانائی جمع کر کے اٹھے اور انہوں نے بھی اپنے کمزور ہاتھ گاڑی کے چرمر فریم پر رکھ دیے۔ سب نے مل کر زور لگایا تو ڈھلوان پر پڑی گاڑی ایک طرف الٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ایک ہیڈ لائٹ پھر سے روشن ہو گئی اور اندر موسیقی کی مدھم آواز بھی سنائی دینے لگی۔ موسیقی اور موت ۔۔۔۔۔۔ کتنا بُعد تھا ان دونوں کیفیات میں۔

گاڑی بان کی بیوی بھاگ کر لالٹین لے آئی۔ سلیمہ تو دیر ہوئی ختم ہو چکی تھی لیکن اسامہ اور زبیدہ کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ خاص طور سے اسامہ کی حالت تو بہت خراب تھی۔ اس کا نچلا دھڑ شدید زخمی ہو چکا تھا اور خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔

گاڑی بان نے چلا کر کہا ''صاحب جی! آئیں، ان کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالیں۔ ہم ان کو اسپتال لے جاتے ہیں۔ تحصیل اسپتال یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ میں بیل بھگاتا ہوں۔ ہم آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔''

یوسفی صاحب نے اسامہ کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی، پھر دیوانوں کے سے لہجے میں بولے ''نہیں رہنے دو۔۔۔۔۔۔ مجھے اور میرے بچوں کو یہیں رہنے دو۔۔۔۔ ہمیں مرنے دو، ہم بڑے آرام سے مر رہے ہیں، یہ دیکھو۔۔۔۔۔ یہ میری بہو ہے۔ یہ پاکستان دیکھنے آئی تھی۔ اپنے بچے سمیت مر گئی۔ یہ میرا بیٹا ہے، یہ بھی بس مر رہا ہے۔۔۔۔۔ ہم بھی مر گئے تو کیا فرق پڑ جائے گا، تم۔۔۔۔۔ تم اپنا راستہ کھوٹا مت کرو۔ اگر یہاں رکے تو پھنس جاؤ گے۔۔۔ تھانے کچہری کے چکروں میں پڑ جاؤ گے۔۔۔۔ اور تمہیں پتا ہی ہے یہاں کی

پولیس۔۔۔۔یہاں کی پولیس۔۔۔۔۔۔آواز ان کے حلق میں پھنس گئی اور وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

گاڑی میں بہت مدھم آواز سے یہ بول گونج رہے تھے، زمیں کی گود رنگ سے امنگ سے بھری رہے۔ خدا کرے سدا یہ روشنی رہے۔ گاڑی بان نے یوسفی صاحب کی باتیں سنی ان سنی کردیں۔ شاید اسے اندازہ ہوگیا تھا۔۔۔۔۔کہ شدید صدمے نے صاحب کے ذہن پر اثر کیا ہے۔ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر پہلے اسامہ اور پھر زبیدہ کو بیل گاڑی میں ڈالا۔ بیل گاڑی میں رکھی پرال پر انہیں بڑے آرام سے لٹا دیا گیا تھا۔۔۔۔۔اپنے کندھوں سے گرم چادر اتار کر گاڑی بان نے سلیمہ کی لاش پر پھیلائی پھر اس نے یوسفی صاحب کو سہارا دے کر بیل گاڑی میں بٹھالیا۔

اس کے منہ سے ٹخ ٹخ کی زوردار آواز نکلی۔ اس کے ہاتھ کی چھڑی لہرائی اور بیل اپنے مالک کا اشارہ سمجھتے ہوئے تیزی سے ناہموار راستے پر بھاگنے لگے۔ بلند شاہراہ کے نیچے دھول سے اَٹے ہوئے راستے پر وہ بھاگتے چلے جارہے تھے۔ اسپتال کی طرف۔۔۔۔زندگی کی طرف۔

☆☆☆

ٹھیک دس روز بعد یوسفی صاحب امریکا واپس جارہے تھے۔ اسامہ کا زندہ بچ جانا معجزے سے کم نہیں تھا۔ اگر اسے خون ملنے میں پانچ دس منٹ کی مزید تاخیر ہوجاتی تو شاید اس کے لئے کچھ نہ کیا جاسکتا۔ اس کی ٹانگیں تین چار جگہ سے فریکچر تھیں، اس کے علاوہ بھی آرتھوپیڈک مسائل تھے۔ سب سے اہم بات یہی تھی کہ اس کی زندگی بچ گئی تھی۔ زبیدہ کے دو آپریشن ہوچکے تھے اب ایک آپریشن امریکا پہنچ کر ہونا تھا۔ وہ روبہ صحت تھے۔ پچھلے دس روز میں جو ناقابل برداشت صدمے انہیں جھیلنا پڑے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ سلیمہ کی آخری رسومات میں شرکت نہیں کرسکے تھے۔

زبیدہ اور اسامہ کو ایمبولینس پر ائرپورٹ پہنچایا گیا تھا۔ وہاں سے خصوصی اسٹریچرز پر انہیں بورڈنگ کے لئے روانہ کیا گیا۔ یوسفی صاحب دونوں بچوں کے ساتھ تھے، ان کا ایک بازو گلے میں جھول رہا تھا۔ ائرپورٹ کے اندرونی حصے میں داخل ہونے سے پہلے اسامہ کے

ہونٹوں پر ایک بہت پھیکی مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ بڑی نحیف آواز میں بولا'' پاپا جانی! ہم یہاں پاکستان دیکھنے آئے تھے لیکن چند شاندار سڑکوں اور دو اسپتالوں کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکے۔''

یوسفی صاحب کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ وہ چند لمحے خاموش رہے پھر کھوئی سی آواز میں بولے'' سارا پاکستان تو میں تمہیں نہیں دکھا سکتا لیکن تین چوتھائی پاکستان میں تمہیں اب بھی دکھا سکتا ہوں۔''

اسامہ کے ساتھ ساتھ زبیدہ بھی سوالیہ نظروں سے یوسفی صاحب کو دیکھنے لگی۔ یوسفی صاحب نے سامنے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں گاڑی بان فیض محمد، اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ چاروں معمولی قسم کے دیہاتی لباس میں تھے۔ ان کے چہروں پر سادگی اور ایک معصوم جھجک کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ سرتاپا غریب صورت تھے۔

زبیدہ نے کہا'' یہ کون ہیں؟''

یوسفی صاحب کہنے لگے'' یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس رات بیل گاڑی پر تمہیں اسپتال پہنچایا تھا۔ اسامہ کو خون دینے والی عورت گاڑی بان کی بیوی ہے۔'' پھر ذرا توقف سے بولے'' یہی تین چوتھائی پاکستان ہے۔ میں یہ پاکستان تم سے چھپانا چاہتا تھا، اب مجھے محسوس ہورہا ہے کہ میں غلطی پر تھا۔''

☆

وہم یا حقیقت

گلشن اقبال لاہور کی ایک خوب صورت تفریح گاہ ہے۔ اس کے بیچوں بیچ ایک مصنو
جھیل ہے جس میں ''پیڈل بوٹس'' چلتی ہیں۔ شام کے بعد جب جھیل کے کناروں پر نیلگو
بتیاں روشن ہوتی ہیں اور ان کا عکس پانی میں جھلملاتا ہے تو خوب صورت منظر وجود میں آ ج
ہے۔ وہ ایک ایسی ہی دل فریب شام تھی۔ طویل سردیاں گزر چکی تھیں اور گردو پیش چہکنے چ
بہار کا رنگ اوڑھنے لگے تھے۔ میں اور رضوان گلشن اقبال کی سیر کرتے کرتے جھیل کی طرف
نکل آئے تھے اور ''پیڈل بوٹ'' میں بیٹھے تھے۔

اچانک رضوان نے کہا ''یار طاہر! تمہاری فیملی میں کوئی محسن نام کا بندہ بھی ہے؟''

میں نے ذہن پر ذرا زور دیا اور کہا ''ہاں ۔۔ ہے تو ۔۔ میرے ایک ماموں کا لڑکا۔
۔۔۔ لیکن ۔۔۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بس یونہی ذہن میں ایک بات آ گئی تھی۔''

''بھئی ذہن میں بات آنے کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے۔''

''نہیں کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ تمہیں پتا ہی ہے میرے دماغ میں یونہی بیٹھے بٹھائے کو
بات آ جاتی ہے۔ مثلاً میں ابھی تم سے یہ بھی پوچھ سکتا ہوں کہ انڈیا میں کانگریس کتنی نشستو
سے ہارے گی یا سڈنی ہونے والے میچ میں آسٹریلیا نے کل تک کیا اسکور بنایا تھا'' رضوان ۔
بات ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی پھر ذرا توقف سے بولا ''ویسے یہ محسن صاحب کرتے کیا ہیں؟''

میں نے کہا ''اب یہ دوسرا سوال بھی ذہن میں بلا وجہ آیا ہے یا اس کی کوئی وجہ ہے؟''

رضوان ہنس دیا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ کسی بھی مشکل سوال کا جواب دینے سے پہلے

حسب موقع چھوٹا اور بڑا قہقہہ لگاتا تھا۔ اس قہقہے کے دوران میں ہی اسے کوئی اچھا سا جواب بھی
سوجھ جایا کرتا تھا۔ اس دفعہ بھی اس نے قہقہہ لگایا لیکن جواب دینے کی نوبت نہیں آئی، کیونکہ
ایک دوسری بوٹ زور سے ہماری بوٹ کے ساتھ ٹکرائی تھی۔ ہمیں ٹکر مارنے والا رضوان کا کوئی
پرانا کلاس فیلو تھا۔ پرانے دوست جب عرصے بعد ملتے ہیں تو ملاقات کے جوش میں اردگرد کے
ماحول کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں ۔۔۔ رضوان اور اس کے دوست نے بھی یہی کچھ کیا۔ ان کی
باتیں شروع ہوئیں تو پھر ختم ہونے میں نہیں آئیں۔ جو بات میں اور رضوان کر رہے تھے وہ بیچ
میں ہی رہ گئی۔

رات کو گھر آ کر جب میں بستر پر لیٹا تو ایک بار پھر رضوان کا سوال میرے ذہن میں
گونجنے لگا۔ اس کا سوال بظاہر معمولی تھا لیکن میرے لئے معمولی نہیں تھا ۔۔۔ اس کی وجہ یہ تھی
کہ میں رضوان کے رویے اور اس کی نفسیات کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس اندرونی
اضطراب کو بھی سمجھتا تھا جو ان دنوں رضوان کو لاحق تھا۔ اس اندرونی اضطراب کے بارے میں
بتانے سے پہلے بہتر ہے کہ میں اپنے اور رضوان کے بارے میں مختصراً بتا دوں۔

رضوان میرے بچپن کا دوست ہے۔ ہم نے ایف ایس سی کالج سے اکٹھے گریجویشن کیا
تھا۔ پھر رضوان تو اپنے بڑے بھائی کے ساتھ گارمنٹس کے کام میں شریک ہو گیا جبکہ میں نے
اپلائیڈ سائیکالوجی میں ایم ایس سی کیا اور کچھ عرصہ لندن میں بھی گزار کر آیا۔ اب میں ایک
مقامی کالج میں لیکچرار تھا۔ میری شادی ابھی نہیں ہوئی تھی جبکہ رضوان تقریباً ڈیڑھ برس پہلے
اس بندھن میں بندھ چکا تھا۔ اتفاقاً رضوان کی شادی ہماری ہی برادری کے ایک گھرانے میں
ہوئی تھی۔ دراصل رضوان کا ہمارے گھر آنا جانا تھا۔ میرے والد صاحب نے اسے دیکھا ہوا
تھا۔ انہی کے حوالے سے بات چلی اور یہ رشتہ طے پا گیا۔ لڑکی کا نام حسنات تھا۔ وہ میرے
ایک دور کے چچا کی بیٹی تھی۔ یہ لوگ لاہور ہی میں رہتے تھے۔ سمن آباد میں ان کا گھر تھا۔

اب میں اس اندرونی اضطراب کی بات کرتا ہوں جس نے پچھلے کئی ماہ سے رضوان کو گھیر
رکھا تھا۔ بطور سائیکالوجسٹ اور بطور دوست مجھے یقین تھا کہ رضوان اپنی خوب صورت اور سلیقہ
شعار بیوی سے بہت محبت کرتا ہے لیکن جہاں بہت ''محبت'' ہوتی ہے وہاں بہت سی الجھنیں بھی
ہوتی ہیں۔ انہی الجھنوں میں ایک تشویش ناک الجھن کا نام ''شک'' بھی ہے۔ رضوان کو بھی

یہی الجھن لاحق تھی۔ میں جانتا تھا کہ رضوان نے بعض چھوٹے چھوٹے واقعات کو اپنے ذ
میں ایک غلط ترتیب دے لی ہے اور اس ترتیب کی وجہ سے وہ حسنات کے ماضی کو شبے کی
سے دیکھنے لگا ہے۔ وہ باتوں باتوں میں حسنات کے ماضی کو کریدتا رہتا تھا۔ چبھتے ہوئے سو
پوچھنا، بے وجہ خفا ہونا، میکے آنے جانے پر خواہ مخواہ کی روک ٹوک اور اسی قسم کے او
اشارے تھے جن سے صاف پتا چلتا تھا کہ اس کی ذہنی رو کس رخ پر چل رہی ہے۔ حسنات
دل کی نبھا کرنے والی لڑکی تھی۔ اگر وہ بھی رضوان کی طرح تندمزاج اور بال کی کھال اتار
والی ہوتی تو معاملہ زیادہ بگڑ جاتا۔

میرے نزدیک رضوان کا رویہ کسی طرح بھی درست نہیں تھا۔ شادی کے بعد میاں بی
ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ اس زندگی کی بنیاد ہی باہمی اعتماد اور بھروسے پر ہوتی ہے
بھروسا ختم ہو جائے تو پھر کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ رضوان کو اس طرح ای
بے بنیاد واہمے کا شکار ہونا چاہئے۔۔۔۔۔ اور بالفرضِ محال اس واہمے کی کوئی بنیاد تھی تو بھ
رضوان کو کیا ضرورت تھی اتنی باریکی اور گہرائی میں جانے کی۔ حسنات ایک شریف گھرانے
تھی اور ایک شریف اور بے پناہ محبت کرنے والی بیوی بن کر رضوان کی زندگی میں آئی تھی۔ ا
ان کا ایک بچہ بھی تھا اور بظاہر وہ ایک پرمسرت اور آسودہ زندگی گزار رہے تھے۔

گلشن اقبال کی سیر کے دوران میں رضوان نے مجھ سے جو سوال کیا تھا وہ بہت معنی خیز
اور یہ سوال مجھے سمجھا رہا تھا کہ رضوان اور حسنات کی ازدواجی زندگی کے مدوجزر میں اضا
ہونے والا ہے۔ رضوان نے مجھ سے کسی ایسے فرد کے بارے میں پوچھا تھا جس کا نام محس
ہو اور جس کا شمار ہمارے دور یا نزدیک کے رشتے داروں میں ہو۔ یہ بہت گہرا سوال تھا اور اس
کی گہرائی صرف میں ہی سمجھ سکتا تھا۔۔۔۔۔ رضوان کے بیٹے کا نام بھی محسن تھا۔ یہ نا
حسنات نے خود رکھا تھا اور اصرار کے ساتھ رکھا تھا۔۔۔۔۔ اب رضوان کا سوال سننے کے بع
میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ رضوان کے ذہن میں اس نام کے حوالے سے بھی شکوک وشبہات
جنم لینے لگے ہیں۔ وہ سمجھنے لگا ہے کہ اس نام کا تعلق حسنات کے ماضی سے ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے
کہ محسن، حسنات کے اسی محبوب کا نام ہو جس کی یادیں وہ میکے سے ''سوغات'' کے طور پر لائی
ہے۔

اگلے دس پندرہ روز تک رضوان سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ بس ٹیلی فون پر دو تین
بار بات ہوئی۔ رضوان کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس پر بھی یاسیت کا دورہ پڑا ہوا ہے۔
اس کی گفتگو میں ربط تھا اور نہ لہجے میں شگفتگی۔ اس کی آواز سن کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بے
تحاشا سگریٹ نوشی کر رہا ہے اور خواب آور گولیاں بھی لے رہا ہے۔

ایک روز شام کو میں رضوان کے گھر پہنچا اور اسے اپنے ساتھ لمبی ڈرائیو پر لے گیا۔ لاہور
کے اندر سے گزرنے والی خوب صورت نہر کے کنارے کنارے چلتے ہم جلو موڑ کی طرف نکل
گئے۔ ایک پُرسکون مقام پر میں نے اپنی سوزوکی کار روکی اور چاروں دروازے کھول کر ہلکی
آواز میں میوزک لگا دیا۔

کچھ دیر ہم اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتے رہے پھر میں اصل موضوع پر آ گیا۔ یہ موضوع
ہمارے لئے بالکل نیا نہیں تھا۔ ایک بار پہلے بھی اشاروں کنایوں میں، میں رضوان کو سمجھا چکا تھا
کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی میں شکوک وشبہات کو جگہ دے رہا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔
اس مرتبہ ہمارے درمیان گفتگو شروع ہوئی تو بات اور زیادہ کھل گئی۔ ایک مرحلے پر رضوان
گہری سانس لے کر بولا ''یار طاہر! تم میرے لنگوٹیے دوست تو ہمیشہ سے ہو لیکن اب ایک
سائیکالوجسٹ کی حیثیت سے میرے ڈاکٹر بھی ہو۔ میں ایک دوست سے تو شاید کچھ باتیں چھپا
لیتا لیکن ایک ڈاکٹر سے نہیں چھپا سکتا۔''

میں نے کہا ''اسی لئے تو کہتا ہوں کہ آج اپنے دل کا سارا بوجھ ہلکا کر دو۔''

وہ بولا ''یار! کیا کروں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ سچ مچ ذہنی
مریض بنتا جا رہا ہوں۔ میں حسنات سے بہت محبت کرتا ہوں، شاید یہی وجہ ہے کہ اسے بہت
صاف اور اُجلا دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ اس کے دامن پر کوئی بھی نیا یا پرانا دھبا ہو،
میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟''

ہاں۔ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔

وہ بولا ''ممکن ہے تمہیں یہ بات اچھی نہ لگے کہ میں اس طرح حسنات کے بارے میں
معلومات اکٹھی کرتا رہتا ہوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کی گہرائی میں جانا چاہتا ہوں لیکن اگر تم
غور کرو تو اس میں تمہیں میرے علاوہ حسنات کی بھلائی بھی نظر آئے گی۔ اگر کوئی شک میرے

اندر ہی پھولتا رہے تو وہ خطرناک ہوگا لیکن جب اس کی تردید ہو جائے گی تو وہ اپنی موت آ
مر جائے گا۔''

''لیکن یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ میرا مطلب ہے کہ کب تک شک جنم لیتے ر
گے اور تم ان کی تردید یا تصدیق کرنے کے لئے سرگرداں رہو گے۔''

وہ بولا ''میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اب یہ سلسلہ ختم ہونے کو ہے۔ شاید یہ شک میرا آ
شک ہو۔ اس کے بعد میرا ہر شک یا تو یقین بن جائے گا یا اپنی موت آپ مر جائے گا۔''

''اور تمہارا آخری شک یہ ہے کہ محسن کسی ایسے شخص کا نام ہے جسے حسنات ماضی
چاہتی رہی ہے اور اب یہی نام اس نے تمہارے بیٹے کا رکھ دیا ہے؟''

رضوان کی نگاہیں جھک گئیں۔ اس کے چہرے پر اقرار کے علاوہ شرمندگی کا تاثر بھی
یہ وہی شرمندگی تھی جو اپنی ہی غلطی سے سرعام رسوا ہو جانے والے شخص کے چہرے پر نظر
ہے۔ وہ اپنے دوست کے سامنے اپنی محبوب بیوی پر شک کا اظہار کر رہا تھا اور یہ بیوی اس
بچے کی ماں بھی تھی۔ یقیناً وہ زبردست اندرونی ہیجان کا شکار تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے
واضح انداز میں مجھ سے بات نہ کرتا یا پھر وہ اس وقت واقعی مجھے ڈاکٹر کی حیثیت دے رہا تھا۔

میں نے کہا ''اچھا اب تم کیا چاہتے ہو؟''

وہ بولا ''تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری برادری میں محسن نام کا ایک لڑکا ہے، شاید ماموں
بیٹا ہے۔ کیا اس کے بارے میں مزید کچھ بتا سکتے ہو؟''

میں نے کہا ''بتا کیوں نہیں سکتا لیکن جو کچھ میں بتاؤں گا وہ تمہاری توقع کے مطابق
ہوگا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ جس محسن کی میں بات کر رہا ہوں وہ حسن و عشق کے معاملوں سے کو
دور ہے۔۔۔۔ وہ ''کے جی'' میں پڑھتا ہے اور روٹی کو ابھی توتی بولتا ہے۔ مشکل سے
سال کا ہوگا۔''

''اوہ''! رضوان نے ہونٹ سکیڑ لئے۔ میں چبھتی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا
ان نظروں سے متاثر ہوئے بغیر اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور بولا ''اس کے عا

کوئی اور محسن بھی تو ہو سکتا ہے۔''

میں نے کہا ''کم از کم میری نظر میں تو ہماری برادری میں اس کے سوا اور کوئی محسن نہیں ہے۔''

وہ بولا ''تمہاری نظر جاتی بھی کتنی دور ہے۔ کتابوں اور اپنے لیکچروں سے آگے تم اور کچھ دیکھ نہیں پاتے ہو۔ چچا یا چچی جان سے پوچھنا۔ وہ خاندان اور برادری کا پورا شجرۂ نسب جانتے ہوں گے۔''

''یعنی تم چاہتے ہو کہ میں اپنے دور یا نزدیک کے رشتے داروں میں کسی محسن نامی نوجوان کا کھوج لگاؤں اور تمہارے لعنتی شکوک کو ٹانک فراہم کروں؟''

''ٹانک نہیں زہر'' وہ تلملا کر بولا۔ ''میں ان شکوک کو مارنا چاہتا ہوں۔ ہمیشہ کے لئے اپنی ''بے یقینی'' سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا ''میں نہیں سمجھتا کہ تم ایسا چاہ رہے ہو۔۔۔۔۔ بہرحال اگر تمہارا اصرار ہے اور تمہارے دماغی خلل کا یہی علاج ہے تو میں کوشش کروں گا۔''

☆☆☆

اپنے اردگرد کے حالات پر میری نظر واقعی زیادہ گہری نہیں تھی۔ میری توجہ کا بیشتر حصہ میری کتابیں کھینچ لیتی تھیں۔ خاندان کے بہت سے افراد ایسے تھے جن کے بارے میں مجھے علم نہیں تھا۔ ویسے بھی ہمارا خاندان کافی وسیع تھا اور آئے دن اس کی وسعت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بہت سے ممیرے چچیرے، پھوپیرے اور دو لہے بھائی میری نظر سے اوجھل تھے۔ بہرحال میں رضوان سے وعدہ کر چکا تھا کہ اس ہجوم میں سے ''محسن'' کو ڈھونڈنے کی دیانتدارانہ کوشش کروں گا۔ میں نے ایک پوری دوپہر اپنی والدہ کے پاس بیٹھ کر گزاری اور یہ سراغ لگانے کی کوشش کی کہ ہمارے خاندان اور برادری میں کوئی زندہ یا مردہ محسن ہے یا نہیں۔ نتیجہ نفی کی صورت میں تھا۔ میرے پانچ سالہ ماموں زاد کے سوا ہمارے عزیز و اقارب نے ابھی تک کسی محسن کو جنم نہیں دیا تھا۔ اگلے روز میں نے یہ ''رپورٹ'' رضوان صاحب کے گوش گزار کر دی۔

میرا خیال تھا کہ وقتی طور پر رضوان کی تسلی ہو جائے گی لیکن وہ تو ایک بے چین روح تھا۔ ایک طویل آہ بھر کر کہنے لگا ''یار طاہر! پتا نہیں کیوں میرا دل نہیں مانتا۔ مجھے لگتا ہے کہ جس''

محسن'' کی مجھے تلاش ہے وہ کہیں نہ کہیں ہے ضرور۔۔۔۔۔۔۔ ممکن ہے کہ وہ حسنات کے ر
داروں میں نہ ہو، کہیں اور ہو۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میرا مطلب ہے کہ وہ ''محسن'' حسنات کے اڑوس پڑوس میں بھی کہیں ہو سکتا ہے یا
اس کے کلاس فیلوز میں، اس کے ملنے جلنے والوں میں''۔۔۔۔۔

میں نے کہا'' حکیم لقمان نے درست کہا تھا، وہم کا کوئی علاج نہیں۔''

وہ بولا'' میں بھی مانتا ہوں کہ وہم بری بلا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں اسے ختم کرنا چ
ہوں۔''

''لیکن میں تمہاری اس بلا کو ختم کرنے کے لئے گھن چکر نہیں بن سکتا۔ بہتر ہے اس
کے لئے تم کوئی اور شرلاک ہومز ڈھونڈ لو۔''

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کے آثار تھے۔ وہ کرب جو اس
دماغ کی چولیں ہلا رہا تھا اور اس سے خبطیوں جیسے افعال سرزد کروا رہا تھا۔ اب یہ خبط نہیں تو
اور کیا تھا کہ وہ ایک موہوم شک کو بنیاد بنا کر اپنے رقیب روسیاہ کو ڈھونڈنے نکل پڑا تھا۔ اس
صورت دیکھ کر مجھے ترس آنے لگا۔ میں نے اسے تسلی تشفی دی اور کہا کہ میں اسے اس الجھن
نکالنے میں پورا پورا تعاون کروں گا۔

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا'' کبھی کبھی تو مجھے یقین ہونے لگتا ہے طاہر! کہ میر
الجھن بے معنی نہیں ہے۔ میں حسنات کا وہ لہجہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا جس میں وہ محسن کو پکا
ہے، یوں لگتا ہے کہ اس ایک لفظ میں وہ ہزار معنی بھر دیتی ہے۔ اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں، ا
کا تلفظ سب کچھ ان لمحوں میں بدل جاتا ہے، یوں لگتا ہے کہ وہ اس لفظ کو ادا نہیں کر رہی
ایک پھول کی طرح اس کی خوشبو سونگھ رہی ہے۔''

میں نے کہا'' اب تم بہک رہے ہو، میں کچھ کہوں گا تو برا مناؤ گے۔''

''میں کیا کروں یار! وہ آزردگی سے بولا، میرا دماغ جوالا مکھی بن کر رہ گیا ہے۔''

میں پوری سنجیدگی سے اس معاملے پر غور کر رہا تھا۔ بحیثیت سائیکالوجسٹ میں اب ا
بات سے متفق ہونے لگا تھا کہ'' بچے کے نام'' کے حوالے سے رضوان کا شک رفع ہونا چاہئے

رضوان سے کئے گئے وعدے کے مطابق میں ایک روز سمن آباد کے این بلاک میں پہنچا۔ ایک
طرح سے یہ علاقہ حسنات کا میکا تھا۔ جس محلے میں حسنات کا گھر واقع تھا، اتفاق سے وہیں پر
ایک پراپرٹی ڈیلر سے میری دوستی بھی تھی۔ ایسے لوگوں کو علاقے کے رہائشیوں کے بارے میں
خاطر خواہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ میں اپنے اس دوست پراپرٹی ڈیلر کے پاس کوئی ایک
گھنٹہ بیٹھا رہا۔ بہت سی باتیں ہوئیں۔ ان میں مطلب کی بات بھی ہوئی۔ میں نے بہانے
بہانے سے معلوم کرنا چاہا کہ اس محلے میں کوئی محسن علی نام کا شخص بھی ہے؟ میرے دوست نے
لاعلمی کا اظہار کیا۔ میرے سر پر سے ایک بوجھ اُتر گیا۔ خانہ پڑی کے طور پر ہی سہی بہر حال میں
نے رضوان سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا تھا اور اس بات کی ''تحقیق'' کر لی تھی کہ حسنات کے اڑوس
پڑوس میں محسن نام کا کوئی شخص موجود نہیں یا کم از کم کسی ایسے شخص کا سراغ نہیں ملا۔ اگلے روز
میں کشاں کشاں رضوان کے گھر پہنچا اور اسے اپنی کارکردگی سنائی۔ تھوڑا سا مرچ مسالہ بھی لگا
دیا اور رضوان کو یہ یاد کرایا کہ پوری کوشش کے باوجود میں حسنات کے اڑوس پڑوس میں کسی محسن
نام کے شخص کا سراغ نہیں لگا سکا۔

میں جانتا تھا کہ رضوان خبط کا شکار ہے۔ اور یہ خبط آسانی سے دور نہیں ہوگا۔ بہر حال
میری اطلاع سے اس خبط کی شدت میں کمی آ سکتی تھی۔ ایک حوصلہ افزا بات اور بھی تھی۔ رضوان
نے اپنے طور پر بھی تحقیق جاری رکھی ہوئی تھی۔ اس نے محنتِ شاقہ سے کام لیتے ہوئے حسنات
کے ایک کلاس فیلو کا سراغ لگایا تھا۔ یوں اس نے کالج کے حوالے سے حسنات کے کردار کی
چھان بین کی تھی اور یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ کالج کے زمانے میں تو حسنات کے کسی ساتھی کا
نام ''محسن'' نہیں تھا۔ ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی اور رضوان کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

☆☆☆

ایک روز میں رضوان کے گھر گیا تو وہ حسنات کے بقول ابھی دکان سے نہیں لوٹا تھا۔
حسنات نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور چائے وغیرہ پلائی۔ وہ ملنسار اور با اخلاق لڑکی تھی۔
مجھے بے تکلفی سے بھائی جان کہتی تھی۔ ویسے بھی کسی دور دراز کے رشتے سے میں اس کا بھائی
جان بھی لگتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ حسنات روتی رہی ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ اور متورم
تھیں۔ میں نے اس کی افسردگی کی وجہ پوچھی تو وہ ایک دم بکھر سی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو

چمکے۔ وہ ہونٹ بھینچ کر آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی پھر اچانک رونے لگی۔

''کیا ہوا حسنات۔ کچھ بتاؤ تو سہی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی'' رضوان بہت غصے میں رہتے ہیں۔ بات بات پر ڈانٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ نہیں کیسے کیسے وہم پال رکھے ہیں انہوں نے اپنے اندر''۔

میں نے پوچھا'' کیا کوئی خاص بات ہوئی ہے؟''

وہ بولی'' خاص بات تو نہیں، وہی پرانی باتیں ہیں جو آپ بھی جانتے ہیں، ہر وقت چبھتے ہوئے سوال کرتے رہتے ہیں۔ کسی وقت میں بھی غصے میں آ جاتی ہوں اور ان سے پوچھتی ہو کہ کیا وہ مجھے ایسی لڑکی سمجھتے ہیں؟ کیا ان کی نظروں میں میری یہی عزت ہے؟ اس پر وہ ا بھڑک جاتے ہیں۔ جو منہ میں آتا ہے، بولتے چلے جاتے ہیں'' وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

میں نے کہا'' حسنات، میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ تمہارے بارے میں رضوان پریشانی، تشویش اور چھان بین دراصل اس کی محبت کے ہی مختلف روپ ہیں۔ وہ تمہیں ٹوٹ چاہتا ہے۔''

''اگر چاہتے تو پھر میری زندگی اجیرن کیوں کر رہے ہیں؟'' وہ اشک بار لہجے میں بو ''کیوں ہر وقت میرے ماضی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ کیا برائی نظر آئی ہے انہیں م میں۔''

''تم میں کوئی برائی نہیں ہے حسنات! اور نہ اس میں کوئی برائی ہے''۔ میں نے پور یقین سے کہا'' بس یہ ایک وقتی ہلچل ہے جو تمہاری ازدواجی زندگی میں داخل ہوئی ہے، بہ جلد یہ ختم ہو جائے گی اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ شادی دو مختلف افراد کا دائمی بندھن ہو ہے۔ اس بندھن کو اکثر ایڈجسٹمنٹ کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے''۔

وہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی۔ وہ ہر پہلو سے ایک شریف، گھریلو لڑکی تھی۔ ا کے والدین اور خاص طور سے والد بے حد دین دار تھے۔ وہ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود پردے کی پابند رہی تھی۔ میں نے شادی سے پہلے بھی اسے دیکھا تھا۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح لا ابالی نہیں تھی۔ اس کے کردار میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور متانت پائی جاتی تھی ایسی متانت جو مرد کو عورت سے دور رہنے پر اور اس کی عزت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ پتا نہیں

رضوان کیوں اتنی اچھی بیوی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی رضوان بھی واپس آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی حسنات کے چہرے پر افسردگی طاری ہوگئی۔ اس نے پرام میں سوئے ہوئے اپنے چھ ماہ کے بچے کو گود میں اٹھایا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ رضوان کے چہرے پر ہیجان کے آثار نظر آ رہے تھے۔ حسنات کے جانے کے بعد وہ بولا'' بہت افسوس ہے کہ تم نے مجھ سے سچ چھپایا ہے۔''

''کون سا سچ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو تمہیں ڈھونڈنا تھا'' وہ ذرا تلخی سے بولا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''میں ابھی حسنات کے گھر سے آ رہا ہوں۔ ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا کہ اس کی بیمار والدہ کی خیریت دریافت کرتا چلوں۔ گھر کے سامنے والی سڑک پر کھدائی ہو رہی تھی۔ میں پچھلی سڑک سے ان کی گلی میں پہنچا۔ پتا ہے میں نے کیا دیکھا؟''

''کیا دیکھا؟''

''وہی جو ہم ڈھونڈ رہے تھے۔ اس سڑک پر ''محسن ڈیکوریٹرز'' کے نام سے ایک دفتر موجود ہے۔ یہ دفتر ایک کوٹھی میں واقع ہے اور کوٹھی کے گیٹ پر بھی محسن کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی ہے۔''

''یعنی تم کہنا چاہ رہے ہو کہ تم نے اپنی سسرال کے آس پاس ایک محسن نامی شخص کا کھوج لگا لیا ہے؟''

''تو کیا میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں؟''

میں نے کہا'' تم خود بتا رہے ہو کہ یہ گھر اس سڑک پر نہیں جہاں تمہارے سسر کا گھر واقع ہے بلکہ یہ ایک پچھلی سڑک ہے اور تم اتفاقاً وہاں تک پہنچے ہو۔ پھر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نے سچ چھپایا ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہارے سسر ارشاد صاحب کے اڑوس پڑوس میں کسی محسن نامی شخص کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں پتا چلاؤں گا۔ میں نے اپنی ذمے داری پوری طرح نبھائی ہے لہٰذا تم مجھے الزام نہیں دے سکتے۔''

''اچھا زیادہ وکیل صفائی بننے کی ضرورت نہیں'' وہ ہیجانی انداز میں بولا'' اب یہ بتاؤ کہ

ہمیں کیا کرنا چاہئے۔''

میں نے کہا ''سر میں دھول ڈال کر کپڑے پھاڑ لینے چاہئیں اور خود ہی پاگل خانے پہنچ جانا چاہئے۔۔۔۔۔ بھائی میرے، تم اتنے زیادہ جنونی کیوں ہو رہے ہو۔۔۔۔۔ اگر تمہارا سسرال کے قرب و جوار میں ایک محسن نامی شخص کی رہائش گاہ واقع ہے تو اس کا یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ شخص تمہارا رقیب روسیاہ ہے اور تمہاری بیوی ماضی میں اسے چاہتی رہی ہے۔''

وہ بولا ''تم پھر اپنی وہی بکواس شروع کرنے والے ہو جو اس سے پہلے ہزار مرتبہ کر چکے ہو۔ میں تمہارے ان نفسیاتی لیکچروں سے عاجز آ چکا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے معاف کرو۔ اگر میری کوئی مدد کر سکتے ہو تو کرو ورنہ بھاڑ میں جاؤ۔''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے، میں بھاڑ میں چلا جاتا ہوں۔''

اتفاقاً اگلے پندرہ بیس روز تک ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ مجھے کالج کے اساتذہ کے ساتھ ایک تفریحی ٹور پر ایبٹ آباد جانا پڑ گیا تھا۔ جس روز میں واپس آیا اسی روز رضوان کا ٹیلی فون آ گیا۔ وہ مسلسل اپنے ہی چکر میں پھنسا ہوا تھا، کہنے لگا ''یار طاہر! تم پرلے درجے کے بے حس شخص ہو۔ میری کوئی مدد نہیں کر رہے ہو۔''

میں نے کہا ''اچھا بولو، کیا مدد چاہتے ہو؟''

وہ کہنے لگا ''میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟''

''محسن ڈیکوریٹرز کے دفتر میں۔۔۔۔۔ اس محسن نامی بندے سے کسی بہانے دو تین ملاقاتیں ہونی چاہئیں۔''

میں نے کہا ''بہانہ ڈھونڈنا تو زیادہ مشکل نہیں ہے۔ میرے بڑے خالو صاحب نے مکان بنوایا ہے۔ آج کل انٹیریئر ڈیکوریشن کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہم اسی بہانے محسن ڈیکوریٹرز کے دفتر جا سکتے ہیں بلکہ اگر بندہ معقول نظر آئے اور ٹھیک کام کرنے والا ہو تو اس سے واقعی ڈیکوریشن بھی کروا سکتے ہیں۔''

یہ بات رضوان کے دل کو لگی۔ اگلے روز ہم محسن ڈیکوریٹرز کے دفتر جا دھمکے۔

محسن اٹھائیس تیس سال کا ایک خوبرو جوان تھا۔ اپنی فیلڈ میں وہ ماسٹر کہلانے کا حق دار

تھا۔ وہ گھروں کے علاوہ دفاتر کی اندرونی ڈیکوریشن بھی کرتا تھا۔ اس حوالے سے اس کے پاس ایک متاثر کن ڈپلومہ موجود تھا اور ڈپلومے سے بڑھ کر اس کی خداداد صلاحیت تھی جو متاثر کرتی تھی۔ میں نے اس سے اپنے خالو کے گھر کے بارے میں بات کی۔ اس نے میرے استفسارات کے تسلی بخش جواب دیئے۔ جلد ہی ہم آپس میں گھل مل گئے۔ بے تکلفی کا ماحول پیدا ہوا تو محسن نے ہمیں اپنا گھر دکھانے کی آفر کر دی۔ یہ گھر اس نے بڑے چاؤ سے ''ڈیکوریٹ'' کر رکھا تھا اور نئے نئے آئیڈیاز اپنائے تھے۔

رضوان نے فوراً گھر دیکھنے میں دلچسپی ظاہر کر دی۔ وہ تو چاہتا ہی یہ تھا کہ محسن سے بے تکلفی بڑھے اور اسے زیادہ سے زیادہ جاننے اور پرکھنے کا موقع ملے۔ ہم محسن کے ساتھ اس کے گھر چلے گئے۔ اس نے ہمیں اپنے سجے سجائے خوب صورت ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ چائے کے دوران میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ محسن ہر لحاظ سے ایک سنبھلا ہوا باشعور شخص نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ مذہب کی طرف بھی اس کا رجحان تھا۔ رضوان اپنے خبط کے مطابق اس سے الٹے سیدھے سوالات کر رہا تھا۔ مثلاً وہ کب سے یہاں مقیم ہے۔ کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے، کس کالج سے کی ہے، شادی کب ہوئی ہے وغیرہ وغیرہ۔

محسن ان سوالات کے جواب خندہ پیشانی سے دے رہا تھا۔ یقیناً اس بے چارے کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پر کس طرح کا شک کیا جا رہا ہے اور کیوں کیا جا رہا ہے۔ اس دوران میں اس کی بیوی بھی آ گئی۔ وہ ایک پڑھی لکھی با اعتماد خاتون نظر آتی تھی۔ اس کی گود میں ایک ڈیڑھ سال کی بچی بھی تھی۔ رضوان اس کی موجودگی کی پروا کئے بغیر محسن سے الٹے سیدھے سوالات کرتا رہا۔ ایک دوست کی حیثیت سے مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا لیکن ایک سائیکالوجسٹ کی حیثیت سے میں اس کی مجبوری سمجھ رہا تھا۔

''آپ کبھی ارشاد صاحب سے ملے ہیں؟'' رضوان نے اچانک محسن سے سوال کیا۔ ارشاد اس کے سسر کا نام تھا۔

''کک۔۔۔۔۔ کون ارشاد صاحب؟'' محسن نے پوچھا۔

''وہی جو ساتھ والی لین پر سبز کوٹھی میں رہتے ہیں۔''

''سبز کوٹھی تو دیکھی ہے میں نے۔۔۔۔۔ لیکن ارشاد صاحب کے بارے میں نہیں جانتا۔''

’’حیرت کی بات ہے‘‘۔ رضوان نے کہا ’’وہ بڑے ملنسار آدمی ہیں، پھر آپ کے ان کا تعلق بھی ہے۔ آپ ڈیکوریشن کرتے ہیں، وہ پختہ لکڑی کی خرید وفرخت کا کام کرتے ہیں۔‘‘

’’ہاں سنا تو ہے شاید ان صاحب کے بارے میں ۔ ۔ ۔ ۔ایک دو دفعہ میرے کسی کار نے ذکر کیا تھا‘‘ محسن نے جلدی سے کہا۔

’’بھئی وہ کافی عرصے سے یہاں رہ رہے ہیں، قریباً دس بارہ سال سے۔ عجب بات کہ آپ نے صرف ایک دو بار ان کے بارے میں سنا ہے۔‘‘

محسن مسکرا کر بولا ’’لیکن آپ بھول رہے ہیں کہ ہمیں یہاں رہتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ مشکل سے تین چار سال ہوئے ہوں گے۔‘‘

’’تین چار سال کوئی کم وقت تو نہیں ہوتا، اڑوس پڑوس کو جاننے کے لئے‘‘ رضوان نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

مجھے اس کے ’’ایب نارمل‘‘ رویے پر پھر طیش آنے لگا۔ وہ اندھیرے میں تلوار گھما رہا اور کئی ماہ سے گھماتا چلا جا رہا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ اپنے خالو جان کو فون کر لینا چاہئے۔ اگر وہ گھر ہی ہوتے تو انہیں یہاں بلایا جا سکتا تھا اور ڈیکوریشن کے سلسلے میں محسن سے ان کی بالمشافہ ملاقات کرائی جا سکتی تھی۔

میں نے محسن سے فون کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ فون اوپر گیلری میں ہے۔ پھر ملازم کو آواز دے کر کہا کہ وہ مجھے گیلری میں لے جا کر فون کرا دے۔ میں ملازم کے ساتھ گیلری میں پہنچا۔ گیلری کی بیرونی کھڑکی کھلی تھی۔ اس کھڑکی میں سے جھانک کر مجھے اندازہ ہوا کہ محسن صاحب کا گھر رضوان کے سسر ارشاد صاحب کے گھر سے اتنا دور بھی نہیں ہے۔ دو مختلف سڑکوں پر ہونے کے باوجود دونوں گھروں کے درمیان صرف دو تین کوٹھیوں کا فاصلہ تھا۔ گیلری کی کھڑکی میں سے ارشاد صاحب کے گھر کی پوری چھت اور نصف صحن صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر نہ جانے کیوں ایک دم مجھے یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ رضوان کا وہم درست ہی ہو۔ اس گھر کے مالک مسٹر محسن اور رضوان کی شریکِ حیات حسنات کے درمیان ماضی میں کوئی تعلق موجود رہا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کھڑکی، یہ آنگن، یہ چھت کسی پرانی محبت کی یادگاریں ہوں اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حسنات کے بچے کا نام واقعی اسی محسن کے نام پر رکھا گیا ہو جو نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھا رضوان سے باتیں کر رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ٹیلی فون کے پاس کھڑا سوچتا رہا اور میری نگاہ کھڑکی سے باہر ارشاد صاحب کی سبز کوٹھی کا طواف کرتی رہی۔

دفعتاً ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ محسن کی بچی کی آواز تھی۔ وہ ایک خوب صورت میز کے نیچے سے اپنی گڑیا نکالنے کی کوشش میں میری ٹانگوں میں آ گھسی تھی۔ میں نے اسے گڑیا نکال کر دی اور گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ بچی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چاکلیٹ میرے منہ میں ٹھونس دی۔ میں نے تھوڑی سی چاکلیٹ کھائی۔ اتنے میں بچی کی ماں بھی پہنچ گئی۔ میں نے بچی اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا، بڑی پیاری بچی ہے کیا نام ہے اس کا؟

بچی کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا ’’حسنات‘‘

’’حس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حس نات! الفاظ میرے حلق میں اٹک سے گئے۔

’’ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا مختلف نام ہے لیکن اس کے ابو کو بہت پسند ہے۔ انہوں نے ہی رکھا ہے، محسن کی اہلیہ نے کہا۔‘‘

میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اتنے میں رضوان بھی زینے طے کر کے اوپر آ گیا۔ بچی اس کی طرف دیکھ کر بھی مسکرانے لگی۔ رضوان نے اس کا گال تھپتھپایا۔ ’’بڑی پیاری بچی ہے‘‘ اس نے کہا۔

غالباً رضوان کا اگلا جملہ یا سوال یہ ہونا تھا کہ ’’کیا نام ہے بچی کا؟‘‘

اس سوال کا جواب رضوان کی ازدواجی زندگی کے لئے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا یہ سوال رضوان کی زبان پر آنے سے پہلے ہی مجھے کھانسی کا ’’شدید دورہ‘‘ پڑ گیا۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور سینہ مسلنے لگا۔ رضوان کے علاوہ اہل خانہ بھی پریشان سے ہو گئے۔ ’’شاید چاکلیٹ گلے میں لگ گئی ہے‘‘، محسن کی اہلیہ کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

میں نے کھانستے کھانستے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ملازم پانی لینے دوڑا، رضوان میری پشت سہلانے لگا۔

میری یہ ’’طویل کھانسی‘‘ دو تین منٹ سے پہلے ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس ’’کھانسی‘‘ کے بعد

ہم صرف چند منٹ ہی محسن صاحب کے گھر ٹھہرے۔ میری کوشش تھی کہ رضوان کو جلد از ج
وہاں سے نکال لاؤں۔ میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا اور ہم محسن سے رخصت ہو کر واپ
آ گئے۔

اس بات کو اب چار پانچ برس گزر چکے ہیں۔ رضوان اب ناروے میں مقیم ہے اور ا
کے تین بچے ہیں۔ پہلے بچے کے نام کے حوالے سے رضوان کے شک کی تصدیق نہیں ہو
تھی۔ یہ بات رضوان اور حسنات کی ازدواجی زندگی کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ ایک
ڈیڑھ سال کے اندر ان کے تعلقات بتدریج معمول پر آ گئے۔ چھوٹی موٹی باتوں سے قطع نظ
اب وہ دونوں ایک نارمل زندگی گزار رہے ہیں۔ بہر حال میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں ک
رضوان کے پہلے بچے کا نام اسی محسن کے نام پر رکھا گیا ہے جس سے ہم ایک شام "محس
ڈیکوریٹرز" کے دفتر میں ملے تھے۔

☆

انوکھا انتقام

شاہد ملک سے میری دوستی کو صرف دس بارہ گھنٹے ہی ہوئے تھے لیکن مجھے لگتا تھا کہ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ ایک خوش لباس اور خوش گفتار شخص تھا۔ ادبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ عمر کوئی اٹھائیس برس رہی ہوگی، تاہم اس عمر میں ہی اس نے ترقی کی کئی منازل بڑی تیزی سے طے کی تھیں اور کافی بلندی پر کھڑا تھا۔ سیالکوٹ میں اس کے چار بڑے کارخانے تھے جن میں لیدر جیکٹس قسم کی اشیاء بنائی جاتی تھیں اور برطانیہ امریکا وغیرہ میں سپلائی کی جاتی تھیں۔ وہ اتنا کامیاب جا رہا تھا کہ اب پچھلے دو ڈھائی سال سے وہ صرف اور صرف ایکسپورٹ کوالٹی مال بنا رہا تھا۔

ہم دونوں امریکا سے براستہ فرینکفرٹ اور دوبئی، لاہور آ رہے تھے۔ میں وہاں ایک سیمینار میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ نیویارک سے لاہور تک یہ ایک طویل سفر تھا اور اس میں ایک اچھے اور ہم مزاج ہم سفر کا ہونا ضروری تھا جو شاہد ملک کی صورت میں مجھے مل گیا تھا۔ نیویارک سے فرینکفرٹ تک ہم مسلسل گفتگو میں مصروف رہے تھے اور اب فرینکفرٹ کے شاندار ائیر پورٹ پر نرم صوفوں میں دھنسے ہوئے اپنی رابطہ پرواز کا انتظار کر رہے تھے جو دھند کی وجہ سے کچھ لیٹ تھی۔ کہانی کی مجھے ہمیشہ تلاش رہتی ہے۔ کوئی اچھی روداد سنتے ہوئے وقت بہت آسانی سے کٹتا ہے۔ دھیرے دھیرے میں شاہد کو بھی اپنے ڈھب میں لے آیا۔ میں نے کہا
"شاہد صاحب! اپنی زندگی کا کوئی واقعہ سنائیں۔"
وہ مسکرایا "میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ مجھے کس طرف لے جا رہے ہیں۔ میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میرے ساتھ کوئی کہانی نتھی ہے۔"

میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا، اتنے ہینڈسم اور مال دار نوجوان کے ساتھ کوئی کہانی وابستہ نہ ہو یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔

''عجیب لگتا ہے لیکن ناممکن تو نہیں لگتا۔''

''ہاں ناممکن تو کچھ نہیں ہوتا۔''

وہ بولا ''چھوٹی موٹی کہانی تو ہر شخص کے ساتھ ہوتی ہے، میرے ساتھ بھی ہے۔ لیکن وہ خاصی مختصر اور غیر دلچسپ ہے۔''

میں نے کہا ''ویسے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ ضرور اپنی ہی کہانی سنائیں''۔

''یعنی آپ بیتی کے علاوہ جگ بیتی بھی چل جائے گی۔''

''بالکل چل جائے گی۔''

''تو پھر میں آپ کو ایک ایسی کہانی سنا سکتا ہوں جس کا میں چشم دید گواہ ہوں۔''

''بسروچشم''۔ میں نے کہا۔

شاہد نے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر ذرا نیم دراز سا ہو گیا۔ لاؤنج کے دیوار گیر شیشے سے باہر دسمبر کی دھند آہستہ آہستہ مناظر کو دھندلاتی جا رہی تھی۔ شاہد نے کہنا شروع کیا۔

''عارفہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ والد ایک گورنمنٹ اسکول سے ہیڈ ماسٹر ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ وہ بی ایڈ کر رہی تھی۔ اس کے بڑے بھائی عثمان نے کمپیوٹر میں ماسٹر کیا تھا اور ملازمت کی تلاش میں تھے۔ عارفہ اور اس کے بھائی عثمان میں کافی بے تکلفی تھی۔ اپنے بھائی کے دل کی باتیں عارفہ ایسے ہی جانتی تھی جیسے اپنے دل کی باتیں جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بھائی کسی سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں، اپنی چاہت کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی ان کے لئے محال ہے۔ وہ ان کے پڑوس کی ایک لڑکی تھی۔ اس کا نام صنم تھا۔ خوب صورت تھی، پڑھی لکھی تھی۔ یہ لوگ کافی خوش حال تھے۔ علاقے میں ان کی کوٹھی سب سے بڑی اور شاندار تھی۔ گیراج میں دو گاڑیاں بھی کھڑی رہتی تھیں۔ صنم اور عثمان کے تعلق کا آغاز کوئی پانچ برس بیشتر ہوا تھا۔ دونوں گھروں کی چھتوں کے درمیان بس تین چار گھروں کا فاصلہ تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور پھر روزانہ دیکھنے لگے تھے۔ دھیرے دھیرے یہ تعلق آگے بڑھا۔ پہلے

فون پر بات ہوئی پھر ایک دو ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ ان کا ملاپ آسان نہیں۔ ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ حیثیت اور مرتبے ہی کی تھی۔ صنم کے گھر والوں اور خاص طور سے اس کے والد کو اپنی حیثیت و مرتبے کا بہت احساس رہتا تھا۔ بے شک دونوں گھروں کے افراد ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے لیکن امیر اور غریب کے درمیان جو ایک فاصلہ سا ہوتا ہے وہ یہاں بھی برقرار تھا۔ ایک دوسرے کے ہاں کھانا بھیجا جاتا تھا۔ ایک دوسرے کی تقریبات میں شرکت کی جاتی تھی۔ صنم کے والد چوہدری بشیر اور عثمان کے والد ماسٹر اختر صاحب اکثر گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے، مگر اس قربت میں بھی وہ ایک لکیر سی ضرور موجود رہتی تھی جو امارت کو سفید پوشی سے علیحدہ کرتی ہے۔

عارفہ، صنم کی سہیلی بن چکی تھی۔ کبھی کبھار عارفہ، صنم سے اپنے بھائی کے حوالے سے بھی بات کر لیتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ صنم بھی اس کے بھائی سے بہت محبت کرتی ہے، مگر حالات اور معاشرے سے ٹکرانے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ بس موہوم سی امید تھی اس کے دل میں کہ شاید عثمان برسرِ روزگار ہو کر اپنے حالات کو بہتر بنا لے تو اس کے والدین اس رشتے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔ وہ اکثر عثمان سے کہتی رہتی تھی اور عارفہ کے ذریعے بھی پیغام بھیجتی تھی کہ عثمان جلد از جلد برسرِ روزگار ہونے کی کوشش کرے۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں وہ چاہتی تھی کہ عثمان کا معیارِ زندگی بلند ہو اور اس کے رشتے کے لئے اس کے والدین سے سر اٹھا کر بات کر سکے۔ اپنے بھائی کی رازداں ہونے کی حیثیت سے عارفہ یہ باتیں بھائی جان کے گوش گزار کر دیتی تھی۔ ایسے موقعوں پر عثمان بس اثبات میں سر ہلا دیتا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کروٹیں لیتا اور چہرے پر ڈرے ڈرے سائے لہرانے لگتے۔

اپنے بھائی کے چہرے پر لہراتے ہوئے یہ سائے عارفہ کو ہمیشہ بڑی اذیت پہنچاتے تھے۔ یہ اندیشوں کے سائے تھے، اور ان میں سب سے بڑا اندیشہ صنم کے کھو جانے کا تھا۔ یہ اندیشہ ہمہ وقت عثمان کو دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں وہ صنم کو کھو نہ بیٹھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گردشِ دوراں کی تیزی کا ساتھ نہ دے سکے اور وقت کی رفتار صنم کو اڑا کر کہیں سے کہیں لے جائے۔ عارفہ جانتی تھی کہ یہ اندیشہ کسی خونی جانور کی طرح بھائی کا پیچھا کرتا ہے۔ اس اندیشے کی خون خواری سے بچنے کے لئے بھائی جان اپنے ہاتھ میں اپنی ڈگریاں تھامے سارا سارا دن دفاتر

کے چکر لگاتے ہیں، نوکریوں کے لئے انٹرویوز دیتے ہیں اور اخباروں میں خالی آسامیوں کے اشتہار ڈھونڈتے ہیں ۔ یہ اندیشہ انہیں جلتی ہوئی دوپہروں میں تپتی ہوئی سڑکوں پر برہنہ پا بھگاتا رہتا تھا اور شاید اگر رات کو نیند آتی تھی تو وہ خواب میں بھی بھاگا ہی کرتے تھے۔ ہر صبح ان کی آنکھوں میں عارفہ کو طویل مسافتوں کی تھکن نظر آتی تھی۔

عارفہ کو بھی صنم بہت اچھی لگتی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ جھٹ پٹ دلہن بنا کر اسے اپنے گھر لے آتی۔ لیکن یہ اس کے بس میں نہیں تھا بلکہ ان کے گھر میں کسی کے بس میں نہیں تھا۔ عارفہ، صنم سے چھ سات برس چھوٹی تھی پھر بھی وہ صنم سے سہیلیوں کی طرح باتیں کرتی تھی اور ایک بار یہ باتیں شروع ہوتیں تو گھنٹوں جاری رہتیں۔ ایک عجیب سا انس تھا اسے صنم سے۔ وہ اکثر دل کی گہرائیوں سے صنم اور بھائی جان کے لئے دعا کرتی۔

---- پھر ایک دن اسے پتا چلا کہ صنم کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ عارفہ کے دل پر جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک دن اس نے صنم سے تصدیق چاہی۔ صنم نے پژمردہ لہجے میں کہا

''ہاں عارفہ! کچھ ایسی بات سن تو میں بھی رہی ہوں۔''

''پھر اب کیا ہوگا صنم باجی۔''

''میں کیا بتاؤں، میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہارے بھائی جان کے اسلام آباد والے انٹرویو کا کیا بنا؟''

عارفہ نے کہا ''مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔ اگر کچھ بنا ہوتا تو بتا دیتے۔''

''وہ تو اس انٹرویو سے بڑے پرامید تھے۔''

''وہ تو ہر دفعہ ہی بڑے پرامید ہوتے ہیں۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے بس امید ہی رہ جائے گی، باقی سب کچھ چلا جائے گا۔''

صنم سر جھکا کر خاموش ہوگئی تھی، عارفہ بھی چپ رہی تھی۔

عارفہ کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بھائی جان کو اس بارے میں بتائے۔ چند دن بعد صنم کے رشتے کا معاملہ بھی کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ لہٰذا عارفہ نے یہ بات اپنے تک ہی رہنے دی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہ بھائی جان پر ملازمت حاصل کرنے کے سلسلے میں زیادہ زور دینے لگی۔ اس کی رائے تھی کہ اگر ملازمت نہیں ملتی تو صرف انتظار کرتے رہنے کے بجائے بھائی جان کوئی ذاتی

کام شروع کر دیں۔ ہوسکتا ہے کہ قدرت اسی میں ہاتھ تھام لے۔

لیکن اس مصرعے کے مصداق کہ ''الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ----'' صنم اور عثمان بھی اپنی محبت کو بے رحم وقت سے نہ چھین سکے۔ کچھ عرصہ تعطل کا شکار رہنے کے بعد صنم کے رشتے کی بات پھر شروع ہوگئی اور پھر آنا فاناً یہ رشتہ طے ہوگیا۔ پہلے منگنی ہوئی اور پھر شادی کے دن مقرر ہوگئے۔ عثمان ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ گیا۔ عارفہ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی لیکن وہ کمزور لڑکی کیا کر سکتی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ عثمان بھائی پر جو کچھ بیت رہا ہے وہی کچھ خود اس پر بیت رہا ہے۔ صنم کی منگنی کے بعد وہ ایک روز اس سے ملنے گئی لیکن صنم کے والد اس کے ساتھ بہت رکھائی سے بولے۔ ان کے رویئے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اب اس گھر میں عارفہ کا آنا جانا پسند نہیں کرتے۔ عارفہ دل مسوس کر رہ گئی۔ اس کے بعد وہ کبھی صنم کے گھر نہیں گئی۔ دیگر گھر والوں نے بھی آنا جانا کم کر دیا تھا۔ پھر یہ تعلقات بالکل ہی ختم ہوگئے۔ جس روز صنم کے گھر شہنائیاں بجیں اور اسے کہیں دور لے جانے کے لئے کار سوار دولہا وہاں آیا، عارفہ چھت پر اکیلی بیٹھ کر بہت روئی۔ اتنا روئی کہ آنسو بھی خشک ہوگئے۔

اس روز یا شاید اس سے اگلے روز عارفہ نے ایک عجیب فیصلہ کیا تھا۔ اس جیسا فیصلہ عارفہ جیسی لڑکی ہی کر سکتی تھی۔ یہ ایک نوخیز لاابالی لڑکی کا فیصلہ تھا جو اس نے شدید کرب کا شکار ہونے کے بعد کیا تھا۔ عارفہ نے تہیہ کیا تھا کہ وہ اپنی بے بس غربت کا انتقام کسی کی پُرغرور امارت سے لے گی۔ جس طرح ایک اَپر کلاس کی لڑکی نے اس کے غریب بھائی کو ٹھکرایا تھا، وہ بھی کسی اپر کلاس کے لڑکے کو اپنی محبت میں الجھائے گی اور پھر حقارت سے ٹھکرائے گی۔ بظاہر یہ ایک جذباتی فیصلہ تھا لیکن اس کے دل کی گہرائی میں یوں اترا تھا کہ دن بدن پختہ تر ہوتا گیا اور رگِ جاں بن گیا۔ وہ خوب صورت تھی، دلکش تھی۔ اس کا شباب چودھویں کا چاند تھا کہ جوں جوں افق سے ابھر رہا تھا روشن تر ہو رہا تھا۔

☆☆☆

تین برس گزر گئے اور وہ یونیورسٹی پہنچ گئی۔ وہ یونیورسٹی کی دو تین خوبصورت ترین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی۔ دراز قد، متناسب جسم، لمبے ریشمی بال اور نہایت کالی آنکھیں جن

میں سچے موتیوں کی سی چمک تھی۔ عارفہ ابھی تک گلشن آباد کے اسی پانچ مرلے کے مکان میں
رہتی تھی۔ اس کے والد ایک سال پہلے دمے کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر چکے تھے۔ عثمان
بھائی کی شادی خاندان میں ہی ایک معمولی شکل وصورت کی عام سی لڑکی سے ہو گئی تھی۔ یہ کوئی
زیادہ کامیاب شادی نہیں تھی، بہر حال گزارہ ہو رہا تھا۔ عثمان اپنی ملازمت کے سلسلے میں کوئٹہ
رہتا تھا۔ چند ماہ پہلے وہ اپنی بیوی اور بچے کو بھی کوئٹہ لے گیا تھا۔ کبھی کبھی کوئٹہ سے اس کا فون آ
تھا اور وہ عارفہ سے اس کا حال احوال دریافت کر لیتا تھا۔ درحقیقت بچپن سے ہی وہ اپنا ہر دکھ
سکھ عارفہ کے ساتھ شیئر کرتا تھا۔ عارفہ کی ایک بڑی بہن کی شادی ہو چکی تھی، دوسری کے رشتے
کی بات چل رہی تھی۔ عارفہ کے والد دو دکانیں ترکے میں چھوڑ گئے تھے۔ ان دکانوں کا کرایہ
آتا تھا، اس کے علاوہ تھوڑی بہت پنشن بھی تھی۔ جیسے تیسے گھر کی گاڑی چل رہی تھی۔ کبھی کبھا
عثمان بھی کچھ رقم بھیج دیتا تھا۔

یونیورسٹی جانے کے چند ماہ بعد سہراب نامی ایک لڑکے سے عارفہ کا افیئر شروع ہوا سہراب
بلاشبہ یونیورسٹی کے گنے چنے لڑکوں میں سے تھا۔ مالی حیثیت کے حوالے سے دیکھا جاتا تھا تو
یونیورسٹی کا امیر ترین لڑکا تھا۔ ''ایس ایم انڈسٹریز'' میں اس کی فیملی کے شیئرز میں فی صد سے زائد
تھے۔ یہ ماڈرن گھرانا کافی پڑھا لکھا بھی تھا۔ سہراب، عارفہ کی زلفوں کا اسیر ہوا تو جیسے با
ہر چیز بھول گیا۔ وہ ہمہ وقت عارفہ کے اردگرد منڈلاتا نظر آتا۔ اسے خوش کرنے کا، اس سے
نزدیک ہونے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔

ایک روز یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں وہ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھولوں ا
تتلیوں کی باتیں، موسموں اور رنگوں کی باتیں، خوب صورت فلموں اور کتابوں کی باتیں۔ سہراب
نے اردگرد دیکھا پھر عارفہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا ''عارفہ! میں تمہیں اپنی والدہ
سے ملانا چاہتا ہوں۔ وہ تم جیسی نفیس اور خوب صورت لڑکی سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔''

عارفہ شوخی سے مسکرائی ''یہی بات اس سے پہلے کتنی لڑکیوں سے کہہ چکے ہیں۔''

سہراب کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی دوڑ گئی۔ وہ گہری سانس لے کر بولا ''عارفہ! پلیز
میری محبت کی توہین مت کرو۔ میں یہ تسلیم کر چکا ہوں اور اب بھی کرتا ہوں کہ ماضی میں لڑکیوں
سے میری دوستیاں رہی ہیں لیکن تم مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے سکتی ہو، تم سے ملنے کے بعد

سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ اب صرف تم ہو اور تم ہی رہو گی۔''

وہ زیرِ لب مسکرائی ''سوچ لیں، میرے اور آپ کے درمیان اسٹیٹس کی اونچی دیوار حائل
ہے۔ فی الحال آپ کا رویہ جذباتی ہے، آپ کو یہ دیوار نظر نہیں آ رہی، مگر دوسرے سب لوگ تو
یہ دیوار دیکھ رہے ہیں۔ خاص طور سے آپ کے اہل خانہ، میری اور آپ کی مختلف حیثیتوں کو
کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ آپ کے والدین کسی ہم مرتبہ گھرانے کی دلہن لانا چاہتے ہوں
گے، دیگر اہل خانہ کے دل میں بھی معلوم نہیں کیا کیا ارمان ہوں گے۔''

سہراب نے بے تابی سے عارفہ کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا ''عافی! ہمارے درمیان یہ باتیں
پہلے بھی ہو چکی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری حیثیتوں میں فرق ہے لیکن اگر پیار ایسے فرق نہ مٹا
سکے تو پھر وہ پیار ہی کیا ہے۔ میں یہ فرق مٹا کر دکھاؤں گا اور ثابت کروں گا کہ ہم صرف دو
انسان ہیں جو ایک دوسرے کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں۔''

اس قسم کی باتیں سہراب اکثر کیا کرتا تھا اور کبھی کبھی یہ باتیں عارفہ کو اچھی بھی لگتی تھیں لیکن
وہ تہیہ کر چکی تھی کہ ان باتوں کو دل میں جگہ ہرگز نہیں دے گی۔ وہ خود سے کیے گئے عہد کو کبھی نظر
انداز نہیں کرے گی۔۔۔۔ کسی بھی حال میں۔۔۔۔ کسی بھی وجہ سے۔ اور خود سے کیا ہوا عہد یہ
تھا کہ جیسے ایک امیر گھرانے نے اس کے سفید پوش بھائی کی جھولی میں زندگی بھر کا دکھ ڈالا تھا۔
وہ بھی کسی امیر گھرانے کی شان کو ٹھکرائے گی اور ان کے دلوں کو کبھی ختم نہ ہونے والی کسک دے
گی۔ بے شک سہراب خوب صورت اور پرخلوص باتیں کرتا تھا لیکن ایسی باتیں تو صنم اور عثمان
بھائی کے درمیان بھی بہت ہوئی ہوں گی۔ صنم نے بھی چاندی کی دیواروں کو توڑنے کی بات کی
ہو گی، سماجی رکاوٹوں کو پھلانگنے کا عزم کیا ہو گا۔ لیکن ہوا کیا؟ جب فیصلہ کن مرحلہ آیا تو وہ بتدریج
اپنے آپ میں سمٹتی چلی گئی۔ اس نے محبت کے کانٹوں بھرے راستے پر چلنے کے بجائے پھولوں
بھرے راستے کا انتخاب کر لیا۔ مصلحتوں کو اپنی مجبوریوں کا نام دے دیا اور اپنے اہل خانہ کے
ساتھ شانے سے شانہ ملا کر کھڑی نظر آئی۔ ثروت مندی اور مفلسی کے درمیان موجود ازلی خلا کو
اس نے بھی تہہ دل سے تسلیم کر لیا۔

وقت گزرتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ عارفہ اور سہراب کا تعلق بھی پروان چڑھتا رہا۔
پچھلے ایک برس میں سہراب نے خود کو حیرت انگیز طور پر بدلا تھا۔ تمام بری عادات ایک ایک کر

کے چھوڑ دی تھیں۔ اب کسی لڑکی کے ساتھ کبھی اس کی بات سننے میں نہیں آئی تھی۔ اس نے خود کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا جس میں عارفہ اسے دیکھنا چاہتی تھی، یا ظاہر کرتی تھی کہ دیکھنا چاہتی ہے۔ اس نے بے فکرے دوستوں سے دور رہنا شروع کر دیا تھا۔ دولت کی بے جان نمود و نمائش میں بھی نمایاں کمی واقع ہو گئی تھی، اس کے علاوہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی تعلیم پر بھی توجہ دیتا ہے۔ عارفہ کے دل میں جگہ بنانے کے لئے اس نے عارفہ کے ایک د
نجی مسائل حل کرنے میں بھی مدد کی تھی۔

عارفہ جانتی تھی کہ سہراب نے یہ سب کچھ اسی کی خاطر کیا ہے، وہ بظاہر ان تبدیلیوں کی ستائش کرتی تھی لیکن حقیقتاً اس کے دل میں اب بھی سہراب کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ و
ان تبدیلیوں کو کسی اور پہلو سے دیکھتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ سہراب کی محبت کی شدت صرف اس وجہ سے برقرار ہے کہ اسے محبت کا خاطر خواہ جواب نہیں ملتا۔ جس طرح ناقابل تسخیر قلعوں کو فت
کرنے کے لئے افواج زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ کرتی ہیں اور زیادہ قربانیاں دینے پر آمادہ ہو جاتی ہیں، اسی طرح سہراب بھی اسے تسخیر کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ و
ایک دو مرتبہ عارفہ کو اپنے گھر والوں سے بھی ملا چکا تھا۔ اس کے والدین خوش اخلاق اور ملنسا
تھے۔ بہن بھائی بھی تعلیم یافتہ اور نہایت شائستہ تھے لیکن عارفہ جانتی تھی کہ طبقہ اشراف نے ب
شائستگی اور نرم روی اپنے چہروں پر نقاب کی طرح چڑھا رکھی ہوتی ہے۔ اگر وہ عام طبقے کے لوگوں سے جھک کر ملتے ہیں تو صرف اس لئے کہ وہ خود کو بہت قد آور سمجھتے ہیں اور یوں ان کی خوش خلقی اور انکساری بھی تکبر کا ایک روپ بن جاتی ہے۔ صنم کے والدین بھی تو ان لوگوں کے ساتھ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اجنبی نہیں ان کے خونی رشتے دا
ہیں۔ مگر ان سے قریب ہونے کے باوجود وہ ان سے بہت دور کھڑے تھے۔ بہت دور اور بہ
اوپر۔۔۔ دوری مٹانا تو ناممکن نہیں ہوتا لیکن بلندی تک پہنچنا بے حد دشوار ہوتا ہے۔ ایک اد
شخص جو دولت کے پر لگا کر ہوا میں معلق ہو اس تک ایک بے مایہ شخص کیونکر پہنچ سکتا ہے اور اگر کسی طرح پہنچ بھی جائے تو ہمیشہ اس کے زمین پر پٹخے جانے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔

سہراب کی ایک بھتیجی پارو جو عارفہ سے کچھ ہی چھوٹی تھی، عارفہ کی دوست بن گئی۔ ایک عید کے موقع پر وہ عارفہ سے ملنے اس کے گھر آئی۔ وہ عید کیک لائی تھی۔ دو تین گھنٹے وہ عارفہ

کے ساتھ موجود رہی۔ وہ عارفہ کے گھر والوں سے گھل مل گئی۔ باتوں باتوں میں وہ عارفہ کو چھیڑتی بھی رہی ''آپ اتنی اچھی ہیں کہ اگر میں لڑکا ہوتی تو ضرور آپ پر عاشق ہو جاتی۔ پھر میرے اور چچا سہراب کے درمیان خون ریز لڑائی ہوتی۔ جو بچ جاتا وہ آپ کو اڑا لے جاتا۔''

عارفہ مسکرائی ''میرے خیال میں تو خون ریز لڑائی کی نوبت نہیں آنی تھی۔ تمہارے چچا نے تمہارے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر خاموشی سے پسپا ہو جانا تھا۔ چند ہفتے بعد میرے جیسی تمام خوبیاں انہیں کسی اور لڑکی میں نظر آ سکتی تھیں۔ وہ کیا کہتے ہیں یہ مرد حضرات۔۔۔۔ تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی۔''

''حیرت ہے کہ اتنے لمبے ساتھ کے باوجود آپ انکل سہراب کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پائیں۔ اوہ میں کیسے سمجھاؤں آپ کو۔۔۔ بائی گاڈ وہ جان دیتے ہیں آپ پر۔ ہی از ریئلی سیریس اباؤٹ یو۔ وہ آپ کے لئے آہستہ آہستہ گھر والوں کو راضی کر رہے ہیں اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو گرینڈ ماں تو مکمل طور پر راضی بھی ہو چکی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دو ہفتے تک آپ کے گھر بھی آئیں۔''

کبھی کبھی سہراب اور اس کے گھر والوں کا پیار دیکھ کر عارفہ کا دل لرز جاتا تھا لیکن اس کا آزادہ اس کے دل سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔ اس اداس شام کو جب پڑوس کے گھر میں شہنائیاں گونج رہی تھیں، عارفہ نے اپنے آپ سے ایک عہد کیا تھا۔ گزرے ماہ و سال کے باوجود یہ عہد آج بھی روز اول کی طرح عارفہ کے سینے پر نقش تھا۔ وہ مر تو سکتی تھی مگر اس عہد کو فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ اب قدرت نے یہ عہد بہترین طریقے سے نبھانے کا اسے ایک بہترین موقع عطا کیا تھا۔ سہراب ویسا ہی لڑکا تھا جیسا وہ چاہتی تھی۔ یہ ویسا ہی گھرانا تھا جیسا اس کے انتقام کے لئے ضروری تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے انتقام سے کسی کا بھلا نہیں ہو گا۔ حیثیتوں اور مرتبوں کا فرق اسی طرح برقرار رہے گا۔ ایک ہی آدم کی اولاد ہونے کے باوجود با حیثیت لوگ ہمیشہ کم حیثیت لوگوں کو روندتے رہیں گے۔ کھلونا سمجھ کر ان کے دلوں سے کھیلتے رہیں گے۔ اس جیسی لڑکیاں اور عثمان بھائی جیسے لڑکے اسی طرح سماجی ناہمواریوں کی بھینٹ چڑھتے رہیں گے۔ ٹھیک ہے کچھ نہ ہو گا، لیکن اتنا تو ہو گا کہ اس کا اپنا سینہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اس جان لیوا ٹھیس کا مداوا ہو جائے گا جو اس اداس شام کو عارفہ کی انا کو لگی تھی اور چھت پر بیٹھے بیٹھے

اس کی آنکھوں میں خون کے آنسو اتر آئے تھے۔ عارفہ کے انتقام کا نشانہ بننے والی صنم نہیں
اور نہ اس کا بہت مغرور باپ تھا لیکن تھا تو اسی اپر کلاس کا نمائندہ جو زمین پر ہوتے ہوئے بھی
کو آسمان پر سمجھتے ہیں۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ جس دن وہ سہراب کو حقارت سے ٹھکرائے
اس روز وہ اپنے پیارے بھائی جان کو کوئٹہ کے ایڈریس پر ایک طویل خط لکھے گی اور اس خط
سارا ماجرا بلا جھجک بیان کر دے گی۔ انہیں بتائے گی کہ اس نے اپنے لئے ایک امیر گھرانے
رشتہ اسی طرح ٹھکرایا ہے جس طرح ایک امیر لڑکی کے لئے ان کا رشتہ ٹھکرایا گیا تھا۔

وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگی جب سہراب باقاعدہ طور پر اس سے شادی کا خواہش
ہو اور اسے یقین تھا کہ بہت جلد ایسا ہونے والا ہے۔ سہراب اپنی آنکھوں میں آنسوؤں
چمک لے کر اس کے سامنے اپنا دست سوال پھیلانے والا ہے۔ وہ اس لمحے کا انتظار کر رہی
تاہم کبھی کبھی اس لمحے کے بارے میں سوچ کر کانپ بھی جاتی تھی۔ بے شک وہ سہراب
محبت نہیں کرتی تھی لیکن ایک قسم کا لگاؤ تو طویل رفاقت نے پیدا کر ہی دیا تھا اور اس لگاؤ سے
اہم عارفہ کے لئے سہراب کے اہل خانہ تھے۔ وہ عارفہ کو پسند کرتے تھے، اس سے مل کر خو
ہوتے تھے۔ جس لمحے عارفہ نے سہراب کو ٹھکرانا تھا اس لمحے یقیناً ان سب لوگوں کو بھی
حد مایوسی ہونا تھی۔ جب عارفہ اس انداز سے سوچتی اور اس کے دل میں ہلکا سا گداز پیدا
تو وہ فوراً اس بیکراں درد و کرب کو یاد کرنے لگتی جو چند سال پہلے ''اپر کلاس'' کی طرف سے
کلاس'' کے ایک لاچار نوجوان کی جھولی میں ڈالا گیا تھا۔ اس کا دل پھر سے پتھر کی طرح سخ
ہو جاتا۔

کسی وقت عارفہ کو واضح طور پر محسوس ہوتا کہ وہ اب نارمل انداز میں سوچ رہی ہے ایک
گھرانے کے غلط رویے کے سبب وہ پورے ایک طبقے سے بدظن ہو رہی ہے، مگر وہ اپنے دل
کیا کرتی وہ کسی طور مانتا نہیں تھا۔ وہ ایک پیار کرنے والی لڑکی تھی لیکن اپنے پیارے بھائی
محرومی اس کے دل میں ایک ایسی نفرت بن کر اتر گئی تھی جو نکالے نہیں نکلتی تھی۔

۔۔۔۔ اور پھر وہ لمحہ آ گیا جس کا عارفہ کو انتظار تھا۔ موسم گرما کی ایک خوب صورت شا
دریائے راوی کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے سہراب نے بڑے گمبھیر لہجے میں عارفہ سے کہا تھا'' عا
میں تمہارے دل میں تو نہیں جھانک سکتا لیکن اپنے بارے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں

میں تمہارے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہ میرے لئے ناممکن ہے۔''

''یہ کوئی نئی بات تو آپ نہیں کہہ رہے۔'' وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

''یہ اس لحاظ سے نئی بات ہے کہ میں اسے عملی صورت دینا چاہ رہا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ بھی سنجیدگی سے بولی۔

''اس اتوار کو میں اپنے امی ابو کو تمہارے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔ تمہاری کیا رائے ہے؟''

عارفہ کتنی ہی دیر خاموشی سے کنارے کی گیلی ریت کو گھورتی رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اس کے جذبات کا اندازہ لگانا قطعی مشکل تھا۔

''تم خاموش کیوں ہو عافی؟'' سہراب نے اپنا لرزاں ہاتھ عارفہ کے شانے پر رکھ دیا تھا۔

''کیا آپ مجھے تھوڑا سا سوچنے کی مہلت دیں گے؟''

''کیا ابھی بھی کچھ سوچنا باقی ہے؟''

''نہیں۔ میں آپ کے امی ابو کے آنے کے حوالے سے بات کر رہی ہوں۔''

''یعنی تمہارا خیال ہے کہ ابھی انہیں تمہارے گھر نہیں آنا چاہیے۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔''

''اگر کوئی بات ہے تو بتا دو پلیز۔'' سہراب کے لہجے میں سینکڑوں اندیشے لرزاں تھے۔

''نہیں۔۔۔۔۔ میں تو سوچنے کے لئے تھوڑی سی مہلت چاہ رہی ہوں۔'' عارفہ نے نگاہیں ملائے بغیر کہا تھا'' میں آپ کو کل فون پر بتا دوں گی۔''

عارفہ اور سہراب کی روداد سناتے سناتے میرے دوست شاہد ملک نے ایک گہری سانس لی اور نیا سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ لاؤنج کے دیوار گیر شیشے کے باہر دھند بدستور موجود تھی۔ لاؤنج میں موجود لوگ صوفوں پر نیم دراز تھے، کچھ اونگھ رہے تھے، کچھ میگزین وغیرہ پڑھ رہے تھے، کچھ ہم دونوں کی طرح طویل گفتگو میں مگن تھے۔ رابطہ پرواز بدستور لیٹ تھی۔

شاہد نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا'' عارفہ نے اگلے روز سہراب کو فون نہیں کیا۔ اس سے اگلے روز بھی نہیں کیا۔ تیسرا اور چوتھا روز بھی سہراب نے کانٹوں پر لیٹتے ہوئے گزار دیا۔ وہ

اس کی زندگی کے کٹھن ترین چار دن تھے۔ پانچویں روز عارفہ کا فون آ گیا۔ وہ لڑکی جس نے صرف انتقام کی خاطر ایک امیر زادے سے محبت کا کھیل شروع کیا تھا، اس کھیل کو صرف کھیل نہ رکھ سکی۔ اپنی بے پناہ خواہش کے باوجود سہراب کو وہ جواب نہ دے سکی جو وہ دینا چاہتی تھی۔ اس نے وہ جواب دیا جو وہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے سہراب کو آگاہ کیا کہ وہ اپنے والدین کو ان کے ہاں بھیج سکتا ہے۔ اس واقعے کے صرف ایک ماہ بعد یعنی پچھلے سال اکتوبر میں ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ آج کل وہ ہنسی خوشی رہ رہے ہیں۔''

کہانی کا انجام قطعی غیر متوقع تھا۔ میرے اور شاہد کے درمیان کافی دیر خاموشی رہی۔ پھر شاہد نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا ''آپ کے تاثرات کیا ہیں طاہر صاحب۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا بس اپنی سوچ میں کھویا رہا۔ شاہد بولا ''یقیناً آپ کو حیرانی ہوئی ہو گی کہ عارفہ نے ایسا کیوں کیا؟''

''نہیں کچھ زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ بلکہ میرا خیال تو شروع سے یہی تھا کہ اگر کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی تو اس کہانی کا یہی اختتام ہو گا۔''

''اس قیافے کی کوئی وجہ؟'' شاہد نے پوچھا۔

''عارفہ جیسی مڈل کلاس لڑکی کے لئے سہراب جیسے باحیثیت اور پُرخلوص لڑکے کی پیشکش رد کرنا آسان نہیں تھا۔ ٹھیک ہے کہ شروع میں وہ جذباتیت کا شکار تھی لیکن دھیرے دھیرے جب زخم مندمل ہوئے تو یہ جذباتیت کم ہوتی چلی گئی ہو گی۔ پھر عارفہ نے معروضی انداز میں سوچنا شروع کر دیا ہو گا۔ قسمت نے اس پر ایک نہایت خوش حال زندگی کے دروازے کھولے تھے۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کی بہو بن کر نہ صرف اپنا مستقبل سنوار سکتی تھی بلکہ اپنے بہن بھائیوں کے لئے بھی زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع پیدا کر سکتی تھی۔ بے شک وہ سہراب سے محبت نہیں کرتی تھی مگر بہتر زندگی سے تو ہر کسی کو محبت ہوتی ہے۔ اسی بہتر زندگی کی خاطر وہ اس عہد کو توڑنے پر آمادہ ہو گئی تھی جس کا تعلق سراسر ایک وقتی صدمے اور اُبال سے تھا۔''

وہ مسکرایا ''آپ بڑے نرم الفاظ استعمال کر رہے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ عارفہ کے حوالے سے آپ کے اصل خیالات کیا ہیں اور یہ کوئی آپ ہی کی بات نہیں۔ اگر میں ایک سو افراد کے سامنے یہ روداد بیان کروں تو ان میں سے 98 کے تاثرات کچھ اسی قسم کے ہوں گے۔

وہ عارفہ کو ایک نادان، جذباتی اور خواہش پرست لڑکی قرار دیں گے۔ لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی لڑکی جس کے لئے امیر شوہر، لمبی کار اور وسیع کوٹھی ہی زندگی کی اصل اقدار ہوتی ہیں۔ اسے یہ چیزیں جب اور جہاں مل جائیں وہیں وہ اپنی کمر ہمت کھول کر ڈیرے ڈال لیتی ہے اور باقی سب کچھ بھول جاتی ہے، پھر کوئی عہد رہتا ہے، نہ قسم اور نہ کوئی نصب العین۔''

میں خاموش رہا کیونکہ شاہد کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ عارفہ کی رُوداد سننے کے بعد یہ خیالات ذہن میں ضرور ابھرے تھے۔ ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ عارفہ نے منافقت آمیز مصلحت کا سہارا لیا اور خوش حال مستقبل کی خاطر ایک ایسے شخص کو اپنے جسم و جاں کا مالک بنا دیا جسے دل ہی دل میں وہ دشمن کا درجہ دیتی تھی۔ اس اعتبار سے اس نے بھی وہی کچھ کیا جو چند برس پہلے صنم نے کیا تھا۔

شاہد نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا ''حقیقت مختلف ہے مائی ڈیئر فرینڈ! عارفہ نے یہ سب کچھ دولت اور عیش و آرام کی خاطر نہیں کیا۔ اس نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تھا کہ وہ اندر سے ایک حساس اور گداز دل لڑکی تھی۔ بے رحمی کے ساتھ کسی کا دل توڑنا اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔ وہ چاہتی بھی تو ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک باحیثیت گھرانے کو ٹھکرا کر اپنی انا کو فتح یاب کر سکتی تھی لیکن اس کی نیک فطرت نے اسے ہارنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنا سر جھکا دیا اور چپ چاپ سہراب کی ہو گئی۔ مائی ڈیئر فرینڈ! اب میں آپ کو وہ ثبوت دوں گا جس کے بعد آپ کو یقین ہو جائے گا کہ عارفہ کے اس فیصلے میں کسی بھی طرح موقع پرستی یا لالچ کو عمل دخل نہیں تھا۔''

''کیسا ثبوت؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک جیتا جاگتا ثبوت۔'' شاہد نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے کہا۔

شاہد ایک طویل سانس لے کر بولا ''میں نے شروع میں آپ سے کہا تھا ناں کہ میری اپنی کہانی کچھ زیادہ طویل نہیں اور نہ دلچسپ ہے۔''

''ہاں کہا تو تھا۔''

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا" طاہر صاحب! سہراب اور عارفہ کی شادی سے چند ماہ پہلے میں بھی عارفہ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوگیا تھا۔ میں نے ایک سے زائد مرتبہ عارفہ کو شادی کی باقاعدہ آفر بے حد خلوص کے ساتھ کی تھی۔ مگر عارفہ نے یہ آفر قبول نہیں کی تھی۔ سہراب فیملی جس کمپنی "ایس ایم انڈسٹریز" میں تیس فی صد شیئرز کی مالک تھی وہ میری ہی کمپنی تھی۔ اس میں ساٹھ فی صد شیئرز میرے تھے۔ "ایس ایم" درحقیقت میرے ہی نام شاہد ملک کا مخفف ہے۔ یہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات ہوگی لیکن یہ حقیقت ہے کہ شکل وصورت، حیثیت، خاندانی نجابت غرض ہر لحاظ سے میں سہراب سے بہتر تھا۔" وہ چند لمحے خاموش نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا" میرے خیال میں اب آپ کے ذہن سے یہ بات صاف ہو جانی چاہئے کہ عارفہ نے صرف خوش حال مستقبل کے لئے سہراب کا ساتھ قبول کیا۔ وہ ایک اچھی فطرت کی لڑکی تھی اور اچھی فطرت کا مالک کسی سے برائی کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا، یہ اس کے بس میں ہی نہیں ہوتا۔"

☆

بعید از امکاں

جالندھر کے ایک دور افتادہ گاؤں پکی گڑھی کا واقعہ ہے۔ رات کا وقت تھا۔ تین لڑکیاں باتیں کرتی ہوئی مونجی کے کھیتوں میں چلی جا رہی تھیں۔ خشک ہوا میں پختہ چاولوں کی خوشبو کا بسیرا تھا۔ دور کہیں سے کسی ٹیوب ویل کی کوکو مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ تینوں لڑکیاں دیہاتی لباس میں تھیں۔ ان کے نام بنتو، سرجیت کور اور صاحباں تھے۔ سرجیت کور ان تینوں میں دراز قد تھی اور اس کا لباس بھی نسبتاً بہتر تھا۔ بنتو نے سرجیت کور سے کہا۔

"تجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا سرجیت۔ رب دی سوں، مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ جس بندے کی طرف بڑے بڑے پھنے خاں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تُو نے اسے تھپڑ مار دیا ہے۔ بس اب تیری خیر نہیں۔ میں تجھے آج ہی بتا دیتی ہوں۔ پربت سنگھ اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لے گا۔"

سرجیت تنک کر بولی۔" اس نے مجھے گالی دی تھی، مرے ہوئے باپ کی گالی۔ بتا میں کیسے چپ رہتی۔ تُو تھپڑ کی بات کر رہی ہے۔ واہگرو کی سوگند، میرے ہاتھ میں کرپان ہوتی تو وہ بھی اس کے سینے میں اتار دیتی۔"

"لیکن اس نے تجھے گالی یوں ہی تو نہیں دی ہوگی ناں۔ کوئی بات تیری طرف سے بھی تو ہوئی ہوگی۔" صاحباں نے کہا۔ وہ ان تینوں میں بڑی تھی اور خوبصورت بھی۔

"میں نے اسے ڈانگ تو نہیں ماری تھی۔ بس یہی کہا تھا ناں کہ اس کی وجہ سے ساری بستی پر مصیبت آئی ہوئی ہے نہ کوئی باہر جا سکتا ہے نہ اندر آ سکتا ہے۔ دن میں کئی بار گولی چلتی ہے۔ وہ خود کو پولیس کے حوالے کر دے تاکہ سب کی جان چھوٹے۔ بتاؤ، کیا غلط بات کہی تھی

میں نے؟''

''اتنی صحیح بھی تو نہیں تھی۔'' صاحباں نے جواب دیا۔'' تم جانتی ہو یہ اکیلے پربت کا معاملہ نہیں۔ گاؤں کے سارے ہی جوان مرد پکڑے جائیں گے اور کیا پتا بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی بھی بخشش ہوتی ہے کہ نہیں۔ سنا ہے وہ وڈا تھانے دار بڑا زہریلا بندہ ہے، کہتا ہے سارے پنڈ کی چتا جلا دوں گا؟''

سرجیت بولی۔'' تو پھر کیوں یہ پربت ہلا شیری دے رہا ہے پولیس مقابلے کی۔ میں تو کہتی ہوں سارا فساد اسی کا پھیلایا ہوا ہے۔ وہ نہ ہوتا تو یہ معاملہ اتنا بگڑتا ہی نہ۔ پولیس والے تلاشی ہی لینا چاہتے تھے ناں ایک دو گھروں کی۔۔۔ لے لیتے۔۔۔۔ کیا پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا؟''

صاحباں بولی۔'' ایک تو چار لفظ پڑھ کے تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ عورتوں کو ایسی باتوں میں بولنے کی ضرورت ہی کیا ہوتی ہے۔ دیکھ لینا، ایک دن اپنی ان چالاکیوں کی وجہ سے پچھتائے گی تو۔''

ایک دم کچھ فاصلے پر تڑ تڑ گولیاں چلیں۔'' ہائے ربا'' تینوں لڑکیوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ وہ بے ساختہ بوڑھے برگد کی اوٹ میں سمٹ گئیں۔ صاحباں بولی۔'' لو پھر ٹھاہ ٹھاہ شروع ہو گئی ہے۔ ہائے۔۔۔۔ میری بے بے تو ننگے پاؤں آ جائے گی مجھے ڈھونڈتی ہوئی۔۔۔۔ چلو گھر چلیں۔''

ان تینوں نے جلدی جلدی چادریں درست کیں اور گاؤں کی طرف چل دیں۔ گاؤں کے مکانات قریباً نصف فرلانگ کی دوری پر تھے۔ اس نصف فرلانگ میں چار پانچ چارے کے اور اتنے ہی گنے کے کھیت تھے۔ صاحباں سب سے آگے تھی۔ جیسے اپنی خوبصورتی سمیٹ کر وہ سب سے پہلے گھر پہنچ جانا چاہتی ہو۔ اس کے پیچھے سرجیت اور آخر میں بنتو تھی۔ شمشان گھاٹ کی طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ تینوں لڑکیوں نے کھیتوں میں قریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کیا تھا جب اچانک گنے کے کھیت میں سرسراہٹ ہوئی۔ تینوں نے بدک کر کھیت کی طرف دیکھا۔ ایک پرچھائیں اندر سے برآمد ہوئی اور کسی عفریت کی طرح سرجیت پر جھپٹی۔ تینوں لڑکیوں نے بیک وقت چیخنا شروع کیا۔ سرجیت کی چیخ سب سے دلدوز

تھی۔ اس نے دیوانہ وار کوشش کر کے خود کو چھڑانا چاہا لیکن پرچھائیں اسے دبوچتی اور گھسیٹتی ہوئی کھیت میں لے گئی۔ باقی دونوں لڑکیاں چلاتی اور بھاگتی ہوئی کریانہ فروش ماسٹر دلبر کی دکان تک پہنچ گئیں۔ دکان پر ماسٹر کے علاوہ تین چار افراد بھی تھے۔ لڑکیوں کی چیخ و پکار سنتے ہی وہ دکان سے باہر نکل آئے تھے اور خوف آمیز تجسس سے کھیتوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''کیا ہوا بیٹی؟'' موچی مہتے نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''وہ۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ چاچا۔۔۔ وہ پربت۔'' بنتو کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ وہ جیسے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

پربت کا نام سنتے ہی موقعے پر موجود افراد کو سانپ سونگھ گیا۔ لڑکی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

''کیا کیا ہے پربت نے؟۔۔۔۔'' آخر ماسٹر دلبر نے ہمت کر کے پوچھا۔'' اور۔۔۔۔ یہ وہ تمہارے ساتھ سرجیت بھی تو تھی۔''

''وہ۔۔۔۔ وہ سرجیت کو اٹھا کر لے گیا ہے۔'' صاحباں نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ ابھی۔۔۔۔ وہ ان کھیتوں میں گیا ہے۔ زیادہ دور نہیں نکلا ہو گا۔ خدا کا واسطہ اس کا پیچھا کرو۔ سرجیت کی جان بچاؤ۔''

اب ان کے گرد دس پندرہ افراد کا ہجوم ہو چکا تھا۔ اس واقعے میں پربت سنگھ کا نام نہ ہوتا تو اب تک لاٹھیاں، کلہاڑیاں نکل چکی ہوتیں اور ہر توانا بازو کی مچھلیاں پھڑک رہی ہوتیں لیکن اب مچھلیوں کے بجائے دل پھڑک رہے تھے۔ سب ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے اور خشک ہونٹوں پر زبانیں پھیر رہے تھے۔ گنے کے کھیت کی طرف ان کے دیکھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہاں پربت نہ گیا ہو، کوئی خون آشام درندہ گھسا ہو اور اب اس کھیت میں داخل ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہو۔ اتنے میں گاؤں کا چوہدری لج پال سنگھ اپنے تین چار رائفل بردار ساتھیوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ وہ چالیس پینتالیس برس کا ایک معتبر شخص تھا۔ صورتِ حال جان کر اس کے چہرے پر بھی تشویش کے سائے لہرانے لگے۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خود کو چکی کے دو پاٹوں میں محسوس کر رہا ہے۔ پربت سنگھ کی طرف جانے سے بھی کترا رہا ہے اور موقع پر موجود لوگوں کے سامنے سبکی بھی نہیں چاہتا۔ اس نے کڑک کر صاحباں سے پوچھا۔

''تو نے اندھیرے میں کیسے دیکھ لیا کہ وہ پربت ہے؟''

''وہ پربت سنگھ کے سوا اور کوئی نہیں ہے چوہدری جی''۔ صاحباں نے روتے ہوئے جواب دیا۔

بنتو نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بڑے لمبے قد کا ہے جی، پربت کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا''۔ ماسٹر دلبر نے طنز کے لہجے میں کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ پربت کے سوا لمبے قد کا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ کیا پتا وہ پولیس کا کوئی بندہ ہو۔''

''ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔ موچی مہتے نے ہاں میں ہاں ملائی۔

چوہدری لج پال سنگھ گرج کر بولا۔ ''بس کھڑے باتیں بنائے جاؤ، یہاں سے ہلنا نہ''۔ اس نے رائفل کندھے پر اتار کر ہاتھ میں لی اور ساتھیوں کی طرف گھوم کر بولا۔ چلو'' آؤ۔۔۔۔۔ دیکھ لیتے ہیں۔ کون حرامزادہ ہے۔''

چوہدری اور اس کے تینوں کارندے آگے بڑھے تو باقی لوگوں نے بھی جلوس کی شکل اختیار کر لی۔ آٹھ دس افراد کے ہاتھ میں لاٹھیاں تھیں اور دو تین نے لالٹینیں تھام رکھی تھیں۔ گنے کے کھیتوں کے پاس پہنچتے ہی چوہدری لج پال نے اپنی خودکار رائفل کی نال اوپر اٹھائی اور یکے بعد دیگرے کئی فائر کیے۔ تڑتڑ کی گونج ختم ہوئی تو چوہدری نے دایاں پاؤں کھیت میں رکھا اور پکار کر بولا۔

''کون ہے اوئے، باہر نکل، نہیں تو گولیوں سے بھون ڈالوں گا۔''

جواب میں مکمل خاموشی تھی۔ کوئی چیخ کوئی سرسراہٹ، کوئی آہٹ نہیں تھی۔ یوں محسوس ہوا کہ کھیت میں کوئی ذی روح موجود ہی نہیں۔ حوصلہ پا کر ایک اور شخص نے پستول سے ہوائی فائر کیے اور نادیدہ شخص کو پکارتا ہوا کھیت میں گھسا۔ دیکھا دیکھی سبھی لوگ پگڈنڈی سے اُتر کر کھیت میں گھس آئے۔ چوہدری کا ایک کارندہ ماکھا سب سے آگے تھا۔ وہ بار بار رائفل ہوا میں لہرا رہا تھا اور غلیظ گالیاں بک رہا تھا۔۔۔۔ جلد ہی گاؤں والوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ کماد کے کھیتوں میں کوئی موجود نہیں۔۔۔۔ لڑکی اور نہ اسے دبوچ کر لے جانے والا۔ بائیں طرف پولیس کی ناکہ بندی تھی اور دائیں طرف گاؤں۔ یقیناً وہ شخص سامنے کی طرف ہی نکلا تھا۔ اس جانب خشک برساتی نالا تھا اور نالے کے دوسری طرف شمشان گھاٹ کی خستہ چاردیواری تک سرکنڈے پھیلے ہوئے تھے۔۔۔۔ کماد کے کھیت سے مایوس ہونے کے بعد لوگوں کا رخ خود

بخود نالے کی طرف ہو گیا۔ چوہدری کے کارندے سب سے آگے تھے۔ ابھی ان لوگوں نے خشک نالے میں پاؤں ہی رکھا تھا کہ دور ایک بھاگتا ہوا ہیولا دکھائی دیا۔ یہ ہیولا دوسری جانب کے سرکنڈوں سے نکلا تھا اور اب لڑکھڑاتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ واضح طور پر یہ ایک لڑکی تھی اور لڑکی تھی تو سرجیت کور کے سوا اور کون ہو سکتی تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ لوگوں تک پہنچ گئی۔ گاؤں کے ایک بزرگ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ بزرگ کے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی وہ زمین پر گر پڑی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ لالٹینیں اس کے نزدیک پہنچیں وہ بہت بری حالت میں تھی۔ لمبے سیاہ بال منتشر، لباس تار تار اور چہرے سے خون رستا ہوا۔ اس نے لباس کی دھجیاں سینے کے سامنے سمیٹ رکھی تھیں اور کمان کی طرح دہری ہوتی جا رہی تھی۔ ماسٹر دلبر نے اس کے جسم پر اپنی گرم چادر ڈال کر سیدھا کھڑا کیا۔

''کون تھا وہ؟'' چوہدری نے سرجیت سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ سرجیت کے رونے میں اور تیزی آ گئی۔ چوہدری نے اپنا سوال دہرایا اور ماسٹر نے نرمی سے سرجیت کو دلاسا دیا۔ وہ بمشکل اپنی ہچکیوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''پربت سنگھ۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ وہ مجھے۔''

''ہاں۔۔۔ ہاں کیا ہوا؟'' چوہدری نے پوچھا۔

کوشش کے باوجود اس سے آگے کچھ نہ بول سکی۔ اصولی طور پر گاؤں والوں کو اسی وقت شمشان گھاٹ کی طرف جانا چاہئے تھا لیکن وہ پربت کا نام سنتے ہی ان کا تمام غیظ و غضب جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا تھا۔ وہ لاٹھیاں اور رائفلیں سونت کر پربت کے سامنے کیسے جا سکتے تھے۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ اس سے خوف کھاتے تھے۔ خوف کھانے والے تو چند ہی تھے اور جو تھے ان میں سے بھی تین چار ہی اس ہجوم میں موجود تھے۔ زیادہ تر لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ وہ ان کا ہیرو تھا، ان کا رہبر تھا اور جو ہیرو ہوتے ہیں، جن کے لئے دل کے نہاں خانوں میں جگہ ہوتی ہے ان کے لئے خود بخود معاشرتی اصولوں میں لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک نوعمر لڑکی کی بات پر اعتبار کر کے اپنے ہیرو کو آناً فاناً عرش سے فرش پر کیسے گرا سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ فی الحال رخ پھر گاؤں کی طرف موڑ لیا جائے اور صورت حال کو ٹھنڈے دل سے سوچا سمجھا جائے۔

☆☆☆

سر جیت کور کی عزت لٹنے سے بچ گئی تھی۔ جب پربت سنگھ نے سرکنڈوں میں جا کر
پر دست درازی شروع کی تو خوش قسمتی سے سر جیت کے ہاتھ میں ایک اینٹ کہیں سے آ گ
اس نے موقع تاک کر یہ اینٹ پربت کی پیشانی پر دے ماری اور خود کو اس کی آہنی گرفت
چھڑا کر بھاگ نکلی۔

سر جیت کی عزت بچ جانے سے یہ معاملہ کم سنگین ہو گیا اور یوں لوگوں کا غم و غصہ جو
ہی ماند پڑ چکا تھا، نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے پربت کو
معاملے سے صاف بری کر دیا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ واقعے سے صرف ایک روز پہلے سر
بھی پربت کی بے عزتی کر چکی تھی۔ اس نے کئی افراد کے سامنے اسے برا بھلا کہا تھا۔ یہاں
کہ اسے تھپڑ جڑ دیا تھا۔۔۔۔ پربت کے منہ پر تھپڑ جڑ دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ا
گاؤں بھر کی آنکھ کا تارا کہا جاتا تو بے جا نہ تھا۔ لڑکپن ہی سے وہ ہر دل عزیز تھا۔ سولہ سال ک
میں اس کا قد کاٹھ ایک بھرپور مرد جتنا تھا۔ اس نے تیس دیہات کے اکھاڑے میں اپنے
کہیں زیادہ تجربہ کار پہلوان کو دس سیکنڈ میں چت کر کے پورے علاقے میں شہرت حاصل
تھی پھر آنے والا وہ دن اس کی شہرت میں اضافے کا سبب بنا۔ وہ طاقت، شہ زوری اور د
میں نامور ہونے لگا۔ اس کی لٹھ بازی کی تو جالندھر تک دھوم تھی۔ سینے میں دم بھر کر جب وہ
کی میخوں والی لاٹھی گھماتا تو لگتا تو جیسے چکنے فرش پر رنگ دار لٹو پھسلتا جا رہا ہے۔ وہ
لاٹھیالوں کو ایک ہی ہلے میں چت کر دینا اس کے لئے معمولی بات تھی۔۔۔۔۔ پھر جب
مشرقی پنجاب میں سکھوں کی تحریک نے زور پکڑا تھا اور شہروں کے ساتھ ساتھ قصبوں
دیہاتوں میں بھی خالصتان کا نعرہ گونجا تھا۔ موضع کچی گڑھی میں پربت کو ایک اہم حیثیت
ل ہو گئی تھی۔ وہ اس تحریک کا سرگرم حامی بن کر ابھرا تھا اور ماں کی آشیرباد سے کئی
امرتسر کی یاترا بھی کر آیا تھا۔ اب یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ پربت سنگھ نے
خالصہ'' تحریک میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر رکھی ہے اور اکثر مسلح جتھوں کے ساتھ کارروا
کے لئے جاتا رہتا ہے۔

قرب و جوار کے کئی دیہاتوں کی طرح موضع کچی گڑھی میں بھی علیحدگی پسندوا
اکثریت تھی۔ بمشکل چند ایک گھرانے مختلف نظریہ رکھتے ہوں گے لیکن وہ بھی نمک کی کان

نمک کے مانند تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کچی گڑھی میں پربت کو ہیرو کی حیثیت حاصل تھی۔ گاؤں کے
کئی نوجوان اس کے نقش قدم پر چل رہے تھے اور عموماً پُراسرار طور پر گاؤں سے غائب رہتے
تھے۔ یہاں تک کہ چوہدری لج پال کے دو بیٹے بھی پربت سنگھ کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور خفیہ
مشورے کرتے تھے۔ پچھلے برس جب پربت دربار صاحب کے اندر سے پکڑا گیا تھا تو چوہدری
کے بڑے بیٹے نے ہی بھاگ دوڑ کر کے اس کی ضمانت کرائی تھی۔ جہاں تک چوہدری لج پال کا
معاملہ ہے اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لگتا تھا وہ اس معاملے میں غیر
جانبدار سا ہے۔ اس نے کبھی پربت کی کھل کر حمایت کی تھی اور نہ مخالفت۔ اس غیر جانبداری کی
ایک وجہ غالباً اس کی بڑھتی ہوئی عمر اور گرتی ہوئی صحت بھی تھی۔ وہ اپنے گاؤں کو علیحدگی پسندوں
کا گڑھ بنا کر کسی بڑی مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ہونی ہو کر رہتی ہے،
کچی گڑھی کی تقدیر میں بھی کچھ لکھا تھا سامنے آ کر رہا تھا۔

بات شروع میں ایسی سنگین نہیں تھی۔۔۔۔۔ پچھلے اتوار شام کوئی سات بجے قریبی چوکی کا
انچارج خشونت ڈھلوں اپنے آٹھ دس گھڑ سوار ساتھیوں کے ساتھ کچی گڑھی پہنچا۔ یہ لوگ
پربت کے ایک دوست تارا کے گھر کی تلاشی لینا چاہتے تھے۔ تارا کی بہن کی شادی تھی اور گھر
میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ پربت نے ایس آئی خشونت ڈھلوں سے کہا کہ وہ آج رات تارا
کے گھر کی تلاشی نہیں ہونے دے گا۔ اس بات پر ایس آئی خشونت اور پربت میں گرما گرمی
ہو گئی۔ اتنے میں چوہدری کے دونوں بیٹے ہرنام اور پرنام سنگھ بھی جیپ میں سوار موقعے پر پہنچ
گئے۔ انہوں نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی تو ایس آئی ان سے بھی الجھ گیا۔ گرما گرم بحث
کے دوران اس نے چوہدری کے بڑے بیٹے ہرنام کو دھکا دیا اور وہ نیچے گر پڑا۔ یہ منظر دیکھ کر
پربت سنگھ غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے ایس آئی کی ٹانگوں میں ہاتھ دے کر اسے اٹھایا اور سر
سے بلند کر کے جیپ کے بونٹ پر دے مارا۔۔۔۔ صورت حال بگڑتے دیکھ کر ایک ہیڈ
کانسٹیبل نے گولی چلا دی۔ جواب میں پرنام سنگھ نے گولی چلائی اور ہیڈ کانسٹیبل زخمی ہو کر گر
پڑا۔ صورت حال اچانک ہی بے حد سنگین ہو گئی تھی۔ ایس آئی ہانپتا کانپتا گھوڑے پر سوار ہوا اور
چلا کر بولا۔

''میں دیکھتا ہوں اب تم سب کو پھانسی چڑھنے سے کون بچاتا ہے؟''

جواب میں پربت سنگھ نے کہا۔ ''ہم بھی دیکھتے ہیں بیلے کے سور ہمارے گاؤں میں پاؤں رکھتے ہیں۔''

پولیس پارٹی اپنے زخمی ساتھی لے کر واپس چلی گئی اور اسی رات تقریباً دو بجے پورے گاؤں کی ناکہ بندی کر لی گئی۔ شروع میں پولیس کی نفری کم تھی اور اگر پربت وغیرہ کوشش کرتے تو یہ محاصرہ توڑ کر باہر نکل سکتے تھے لیکن برات کو رخصت کرنے کے بعد وہ دن چڑھے شراب کے نشے میں دھت پڑے رہے۔ دوپہر سے کچھ پہلے انہیں ناکہ بندی کا علم ہوا۔ اس وقت پولیس کو مناسب کمک مل چکی تھی۔ وہ قریبی تھانوں کی پولیس کیل کانٹے سے لیس آ گئی تھی اور اب گاؤں کی حدود سے باہر نکلنا ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی رات چند نوجوانوں نے شمشان گھاٹ کی طرف سے یہ محاصرہ توڑنے کی کوشش کی۔ جواب میں پولیس نے زبردست فائرنگ کر دی۔ اس فائرنگ سے یہ اندازہ ہوا کہ پولیس ہر وقت پر محاصرہ برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ پولیس کے ارادے دیکھتے ہوئے گاؤں کے نوجوان بھی پوری طرح مسلح اور تیار ہو گئے۔

یہ صورتِ حال پچھلے چار روز سے برقرار تھی۔ نہ پولیس نے گاؤں میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی اور نہ محاصرہ اٹھایا تھا۔ پتا چلا تھا کہ ڈی ایس پی بدروک سنگھ خود موقعے پر پہنچ چکا ہے اور وہ کچی گڑھی میں فیصلہ کن آپریشن کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ فیصلہ کن اقدام کے لئے اسے ہیڈ کوارٹر سے مزید نفری کا انتظار ہے اور اسی انتظار کے سبب ''پولیس ریڈ'' میں تاخیر ہو رہی ہے۔

☆☆☆

کچی گڑھی مختصر سا گاؤں تھا۔ بمشکل اسی پچاسی گھر ہوں گے۔ پورے گاؤں میں دس رائفلیں اور تین چار پستول تھے۔ اس محدود اسلحے اور مختصر تعداد سے پولیس کی بھاری جمعیت کا مقابلہ کیوں کر کیا جا سکتا تھا۔ جمعرات کی شام تک حالات پوری طرح واضح ہو گئے۔ بالکل یک طرفہ صورت حال تھی۔۔۔۔۔ ہیڈ کوارٹر سے پولیس کے تین ٹرک اور آ گئے۔ یہ نفری ہر طرح کے جدید اسلحے سے لیس تھی۔ انہوں نے بستی کو تین اطراف سے یوں گھیر لیا جیسے دشمن کی فوج کسی مضبوط مورچے پر قبضے کے لئے آگے بڑھنے والی ہو۔ طاقت کے نشے میں مست پولیس اس دور افتادہ گاؤں میں کیا قیامت نہیں مچا سکتی تھی؟ یہاں کوئی مظلوموں کی آہ بکا سننے والا نہیں تھا۔

لہٰذا جب چوہدری لج پال سنگھ نے بستی کو پولیس کے رحم و کرم پر پایا تو خود جا کر ڈی ایس پی بدروک سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ وہ چند معززین کے ساتھ گاؤں سے نکلا اور ڈی ایس پی بدروک کے پاس پہنچ گیا۔ چھ فٹ کے لمبے چوڑے ڈی ایس پی بدروک نے اپنے سیاہ رنگ میں دہکتے انگاروں کی سرخی چھپا رکھی تھی۔ وہ چوہدری کے ساتھ توہین آمیز سرد مہری سے پیش آیا اور اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ واپس جائے اور اپنے لڑکوں سے پولیس پر فائر کھلوائے تا کہ وہ اپنی ماں کا دودھ حلال کر سکیں۔ چوہدری نے گردن جھکائے رکھنے میں ہی عافیت سمجھی۔ وہ جہاندیدہ شخص جانتا تھا اس موقع پر زبان کھولنا، بپھرے سانڈ کو سرخ کپڑا دکھانے کے برابر ہے۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ہمیں شما کرو سرکار، قانون سے ٹکر لینے کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ تو تین چار کمی منڈوں کا گرم خون اچھالے مار رہا تھا۔ بہت سمجھایا لیکن باز نہیں آئے۔ اب تیل میں بھیگے چھتر کھائیں گے تو دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔''

بدروک زہریلے انداز میں مسکرایا۔ ''اب بات چھتروں تک نہیں رہے گی، جیل اور پھانسی تک جائے گی اور یاد رکھو، تمہارے دونوں بیٹے بھی لپیٹ میں آئیں گے۔''

لج پال جانتا تھا، سب کچھ بدروک کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اس دور دراز گاؤں میں تھانے دار بھی ہے، جج بھی اور جلاد بھی، اگر وہ ٹھنڈا ہو گیا تو سمجھو سارا معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس نے کوئی ایسی غلطی نہیں کی جو بدروک سنگھ کو مشتعل کرتی اور بڑی عاجزی و چاپلوسی کے ساتھ اسے گاؤں میں لے گیا۔ پربت سنگھ اور اس کے سرگرم ساتھیوں کو وہ پہلے ہی آمادہ کر چکا تھا کہ وہ پولیس کے سامنے ہتھیار نہیں اٹھائیں گے۔ اپنے لڑکوں کو بھی اس نے سمجھا بجھا لیا تھا۔ وہ بھی سمجھ گئے تھے کہ اب بات ایس آئی خشونت یا تھانے دار بھولا سنگھ تک محدود نہیں رہی۔ اوپر جالندھر تک گھنٹیاں بج گئی ہیں اور ڈی ایس پی بدروک سنگھ، عرف کالا چیتا بہ نفس نفیس ان کی سرکوبی کے لئے آ موجود ہوا ہے۔ یوں تو پربت نے بھی مزاحمت نہ کرنے کا وعدہ کر لیا تھا لیکن بستی کے بڑوں کو اس کا اعتبار نہیں تھا۔ انہوں نے پربت سنگھ کو بڑی احتیاط سے غیر مسلح کیا تھا اور اس کی ماں کو مستقل اس کے ساتھ لگا رکھا تھا تا کہ وہ آنسوؤں کی زبان میں اسے پُرامن رہنے کی تلقین کرتی رہے۔

قریباً بارہ بجے دوپہر پولیس کی جمعیت کسی شہر کے فاتحین کی طرح بستی میں داخل ہوئی۔ کواڑ بند اور گلیاں سہمی ہوئی تھیں۔ چوہدری کی حویلی میں وہ تمام مرد موجود تھے جو پولیس کو مطلوب تھے یا مطلوب ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ تمام لائسنس یافتہ رائفلیں اور پستول بمع گولیوں کے ایک چارپائی پر ڈھیر تھے۔ ڈی ایس پی بدروک نے مضحکہ خیز نظروں سے اس اسلحے کی طرف دیکھا اور پربت سنگھ کو ماں کی غلیظ گالی دے کر بولا۔

''یہ اسلحہ جو مجھے دکھایا جا رہا ہے، اس سے پچاس گنا اسلحہ اس۔۔۔۔۔ کے پاس موجود ہے۔ کیوں اوئے میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟ اس نے پربت سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

پربت ایک طرف بے پروائی سے کھڑا تھا۔ سخت سردی میں بھی اس کا لباس صرف ایک قمیص تہبند پر مشتمل تھا۔ قمیض کے نیچے سے اس کا ابھرا ہوا سینہ اور سڈول بازو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ شاندار کسرتی جسم کا مالک ایک پُرکشش سکھ تھا۔ اس نے ماتھے پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔ یہ پٹی دو روز پہلے کے اس واقعے کی طرف اشارہ کرتی تھی جب سرجیت کور نے اس پر اینٹ سے حملہ کر کے اپنی جان بچائی تھی۔ ڈی ایس پی کے منہ سے ماں کی گالی سن کر اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے لگا کہ وہ تمام اندیشے بالائے طاق رکھ کر ڈی ایس پی پر ٹوٹ پڑے گا اور اس وقت تک اس کی گردن دبائے رکھے گا جب تک وہ سور کا باشی نہیں ہو جاتا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود پر قابو پا لیا۔ بھنچی ہوئی مٹھیاں ڈھیلی ہو گئیں اور چہرہ پتھر کی طرح سپاٹ ہو گیا۔ چاروں طرف کھڑے مسلح سپاہیوں نے جب خطرہ ٹلتے دیکھا تو رائفلوں کے ٹرائیگر پر ان کی انگلیاں نرم پڑ گئیں۔ ڈی ایس پی نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ پربت کے منہ پر مارا اور دوسرے ہاتھ سے ریوالور کی نال اس کی پیشانی پر رکھ دی پھر زہریلے ناگ کی طرح پھنکار کر بولا۔

''بڑے سورما بنتے تھے۔۔۔۔ پولیس والوں کو گاؤں میں گھسنے نہیں دوں گا۔ یہ کر دوں گا، وہ کر دوں گا۔۔۔۔۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں پولیس کتنی با اختیار ہوتی ہے اور کہاں کہاں ''گھس'' سکتی ہے۔ پھر وہ چیخ کر اپنے انسپکٹر سے بولا۔ ''لے جاؤ ان سب بہن کے ویروں کو اور مشکیں کس کے باہر احاطے میں ڈال دو۔''

عملہ تو جیسے حکم کا منتظر تھا۔ ایک دم سپاہی مکھیوں کی طرح نوجوانوں پر ٹوٹ پڑے۔ ایک

ایک کو دس دس سپاہیوں نے دبوچ لیا اور مارتے پیٹتے گھسیٹتے احاطے میں لے گئے۔ یہاں ان کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ کر حویلی کی دیوار کے ساتھ ساتھ اوندھا لٹا دیا گیا۔

وہ دن کچی گڑھی والوں کے لئے قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھا۔ پولیس نے ہر مشکوک شخص پر زبردست تشدد کیا۔ گھروں میں گھس کر عورتوں کو بے پردہ گھسیٹا گیا۔ انہیں غلیظ گالیاں دی گئیں۔ گھریلو سامان کو تلاشی کے نام پر تہس نہس کیا گیا۔ پولیس نے گاؤں سے کم و بیش پچاس مردوں کو گرفتار کیا اور انہیں چوہدری لج پال سنگھ کی حویلی میں سخت تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس دوران ایک سب انسپکٹر ابل دیہہ کا ''ہمدرد غم خوار'' بن گیا اور انہیں وہ گُر بتانے لگا جن کی مدد سے وہ اپنے گرفتار شدگان کی جانیں بخشوا سکتے تھے۔ نتیجے میں کئی گھرانوں کا زیور اور جمع روپیہ سب انسپکٹر کی جیب میں جمع ہو گیا۔ ساری رات ایک ایک دو دو افراد کی رہائی کا سلسلہ جاری رہا اور اگلے روز دوپہر تک وہ تمام افراد رہا ہو گئے جو بے گناہ تھے یعنی پولیس کے نقطہ نظر سے بھی بے گناہ تھے۔ ظاہر ہے ان لوگوں کو صرف مال بنانے کے لئے پکڑا گیا تھا۔۔۔ اب پولیس کی حراست میں پربت سمیت کل پندرہ نوجوان تھے۔ ان میں سے پانچ کا تعلق تو براہِ راست چوہدری لج پال سنگھ سے تھا یعنی دو اس کے بیٹے، ایک بھتیجا اور دو ملازم خاص تھے۔ شام تک ان پانچوں کی رہائی بھی عمل میں آ گئی۔ باقی دس میں سے پانچ ملزمان کو سرکاری خانہ پُری کے لئے جالندھر روانہ کر دیا گیا۔ ایک نوجوان کی حالت رات گئے پولیس تشدد کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی لہٰذا اسے تحصیل اسپتال میں بھیج دیا گیا۔ یہ تارا تھا۔ اسی کی بہن کی شادی پر پولیس سے جھگڑا شروع ہوا تھا۔ یوں پولیس ریڈ کے اڑتالیس گھنٹے بعد حویلی کے اندر پولیس کی حراست میں کل چار افراد رہ گئے۔ ان میں بڑا ملزم ظاہر ہے پربت سنگھ ہی تھا۔

پولیس کو شک تھا کہ پربت سنگھ نے گاؤں کے اندر یا قریبی کھیتوں میں اسلحے کی ایک بڑی مقدار چھپا کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ انہیں پربت سے ان افراد کے نام، پتے بھی درکار تھے جو قریبی دیہات میں اس کے ساتھی تھے یا حکومت مخالف سرگرمیوں میں اس سے تعاون کرتے تھے۔ ڈی ایس پی بدروک سنگھ کے حکم پر حویلی کی بیٹھک کو گرفتار شدگان کے لئے عقوبت خانہ بنا دیا گیا اور سخت بے رحمی کے ساتھ ان سے پوچھ گچھ شروع کر دی گئی۔

پربت سنگھ کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ ایک سے زائد مرتبہ اس صورت حال کا

سامنا کر چکا تھا۔ جتنی اس کی چھاتی چوڑی تھی اتنا ہی بڑا اس میں دل بھی تھا۔ وہ تار چہ سے ٹوٹنے والا شخص نہیں تھا۔ اذیت سہہ کر اس کی قوت مزاحمت اور بڑھتی تھی۔ آنکھوں میں نشہ چھانے لگتا تھا اور چہرہ ہٹ دھرمی و بے حسی کی تصویر بن جاتا تھا۔۔۔۔۔ حویلی کی بیٹھک میں اس کے ہاتھ نیلون کی رسی میں کس کے ایک سلاخ دار کھڑکی میں باندھ دیئے گئے۔ کھڑکی کی بلندی اتنی تھی کہ پربت سنگھ کے پاؤں کی انگلیاں ہی فرش سے لگ پاتی تھیں یعنی وہ نہ تو کھڑا تھا اور نہ جھول رہا تھا۔ لباس کے نام پر اس کے جسم پر صرف ایک جانگیہ رہنے دیا گیا تھا۔۔۔۔۔ کبھی اسے برف کی سل پر کھڑا کیا جاتا، کبھی زخموں میں سرکہ ملی مرچیں بھری جاتیں، کبھی جسم کے نازک حصوں پر ضربیں لگائی جاتیں۔ وہ چوبیس گھنٹے میں قریباً چار دفعہ بے ہوش ہوا لیکن زبان سے ایک لفظ بول کر نہیں دیا۔۔۔۔۔ یہ حقیقت تھی کہ اس نے اسلحہ چھپا رکھا تھا۔ تاہم ڈی ایس پی جو مقدار بتا رہا تھا وہ درست نہیں تھی۔ ڈی ایس پی کا خیال تھا کہ یہ ملزم دو سو رائفلیں، پچاس پستول اور گولیوں کی دس پیٹیاں ہیں جب کہ پربت سنگھ کے پاس ”صرف“ تین سو رائفلیں اور سو پستول تھے۔ گولیوں کی تعداد بھی اسی حساب سے تھی۔ یہ سارا سامان شمشان گھاٹ کے پاس ایک کھیت میں دفن تھا اور اگر پربت زبان نہ کھولتا تو پولیس کے فرشتے بھی وہاں تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ پربت کے سوا اس اسلحے کے بارے میں کسی کو پتہ معلوم نہیں تھا۔

☆☆☆

منظر حویلی کے ایک کمرے کا تھا۔ ایک مرغن ڈنر کے بعد ڈی ایس پی بدروک اور انسپکٹر بھولا سنگھ کرسیوں پر ٹانگیں پسارے بیٹھے تھے۔ سامنے تپائی پر مے نوشی کے لوازمات تھے۔ بدروک نے اپنی خاردار مونچھیں سہلاتے ہوئے کہا۔ ”میرے خیال میں گھی نکالنے کے لئے انگلیاں کچھ اور ٹیڑھی کرنا پڑیں گی۔“

”کیا مطلب؟“ بھولا سنگھ نے قدرے بے تکلفی سے پوچھا۔

”یہی کہ یہ رانی خاں کا سالا یوں زبان نہیں کھولے گا۔ بڑا ڈھیٹ ہے۔۔۔ بہت بندے میں نے اس نقشے کے دیکھے ہیں۔“

بھولا سنگھ نے گلاس سے ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”میرا تو خیال ہے سر اس پر پانچواں طریقہ استعمال کریں۔ پانچ منٹوں میں ساری بدمعاشی نکل جائے گی۔“

”نہیں بھولا سنگھ“ ڈی ایس پی نے گلاس دونوں ہاتھوں میں گھمایا۔ ایسے بندوں کو سمجھنے میں میرا تجربہ تجھ سے زیادہ ہے۔۔۔۔۔ بکے گا تو یہ ضرور، لیکن ہمیں اپنا طریقہ تھوڑا تبدیل کرنا ہوگا۔“

”مثلاً۔“ بھولا سنگھ نے مثلاً کا حلیہ بگاڑتے ہوئے پوچھا۔

”مثلاً یہ کہ۔۔۔۔۔ یہ خط دیکھو“۔ ڈی ایس پی نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر بھولا سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

بھولا سنگھ نے ڈاک کا بوسیدہ لفافہ کھول کر اس میں سے دو خط نکال لیے، ایک سفید کاغذ پر تھا اور دوسرا نیلے پر۔ یہ دو محبت نامے تھے۔ ایک پربت سنگھ کی طرف سے ”چندا“ نامی لڑکی کو لکھا گیا تھا اور دوسرا چندا کی طرف سے پربت کو بھیجا گیا تھا۔ پربت سنگھ والے محبت نامے کی تحریر یونہی سی تھی لیکن چندا کے محبت نامے کی لکھائی صاف اور تحریر اچھی تھی۔

”یہ خط کہاں سے ملے آپ کو؟“ بھولا سنگھ نے پوچھا۔

”کپورتھلہ کو موضع رت پور سے“۔ ڈی ایس پی نے جواب دیا۔ ”پچھلے ہفتے وہاں سے پربت سنگھ کا ایک یار دانو پکڑا گیا ہے۔۔۔۔۔ اکالی دل کا بڑا سرگرم رکن تھا۔۔۔۔۔ دانو کے گھر میں پربت کا ایک اٹیچی کیس بھی رکھا تھا۔ اس تالا بند اٹیچی کیس میں پربت کی کچھ چیزیں تھیں اور یہ خط تھے۔“

بھولا سنگھ کے چہرے پر چمک سی آ گئی اور وہ دھیان سے خط پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ خط پڑھنے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور مسکراتی ہوئی نظروں سے ڈی ایس پی کی طرف دیکھنے لگا۔ ڈی ایس پی نے دونوں پاؤں سامنے والی کرسی پر رکھتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ جمائی اور افسرانہ شان سے بولا۔ ”ان خطوں میں کوئی ایسی خاص بات تو نہیں لیکن پھر بھی تین باتیں ہمیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ چندا نامی وہ لڑکی اسی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ نمبر دو پربت اس پر دل و جان سے فدا ہے اور اس کی ذرا سی تکلیف پر بھی تڑپ اٹھتا ہے اور نمبر تین ان دونوں کا ٹانکا آپس میں جڑے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے اب تمہیں میری بات کسی حد تک سمجھ میں آ گئی ہوگی۔“

بھولا سنگھ کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھر آئی۔ گردن ہلا کر بولا۔ ”نہ سمجھ

میں آنے والی کوئی بات نہیں سر۔ میرے کھیال میں آپ کا کھیال صحیح ہے۔ یہ لڑکی ہمارے ہتھے چڑھ جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پربت کی زبان تیز گام کی طرح نہ چلنے لگے۔''

''لیکن اس میں ایک مسئلہ ہے بھولا سنگھ''۔ ڈی ایس پی نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ ''چندا'' لڑکی کا اصل نام نہیں ہے۔ پربت نے اسے پریم سے ''چندا'' لکھا ہے۔ لڑکی نے بھی خط کے آخر میں ''تمہاری چندا'' لکھ کر اپنا نام چھپا لیا ہے۔ میں نے کل اس بارے میں تھوڑی سی پوچھ گچھ کی تھی۔ گاؤں کی دو چلتی پھرتی عورتوں کو بلا کر پوچھا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ گاؤں میں کسی لڑکی کا نام چندا نہیں ہے۔۔۔۔۔ نہ ہی وہ یہ بتا سکیں کہ پربت سنگھ کا یارانہ کسی لڑکی سے لگا ہوا ہے یا نہیں۔ ان کے مطابق ابھی تک پربت کے بارے میں کوئی ایسی بات مشہور نہیں ہوئی۔''

''ہوں''۔ مخمور بھولا سنگھ نے لمبی سی پُرسوچ آواز نکالی۔ لڑکی کے ذکر پر اسے اس کیس میں گوناگوں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ کافی دیر غور و فکر کے سمندر میں غوطہ زن رہنے کے بعد وہ بہت دور کی کوڑی لایا۔ ''اس کا مطلب ہے ہمیں تفتیش کرنی پڑے گی۔''

ڈی ایس پی نے برا سا منہ بنایا۔ ''ظاہر ہے کرنی پڑے گی۔ وہ خود آ کر تو نہیں کہے گی کہ میں پربت کی کچھ لگتی ہوں۔ پکڑ لو مجھے اور پوچھ لو میرے عاشق سے جو پوچھنا ہے''۔ بھولا سنگھ اپنا سر مسلسل اقرار میں ہلا رہا تھا۔ ڈی ایس پی نے ایک بیزار نظر اس کے مسلسل ہلتے سر پر ڈالی اور پہلو بدل کر بولا۔ ''میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔۔۔۔۔ تمہیں وہ لڑکی یاد ہے جس پر پربت نے مجرمانہ حملے کی کوشش کی تھی اور پرسوں جو ہمارے پاس شکایت لے کر بھی آئی تھی۔ کہتی تھی مجھے رپورٹ درج کرانی ہے۔''

''ہاں۔۔۔۔ ہاں۔'' بھولے نے تیزی سے سر ہلا دیا۔

وہ لڑکی ہماری بہت مدد کر سکتی ہے۔ ہم عمر لڑکیاں ایک دوسرے کے بارے جتنا جانتی ہیں بڑی عمر کی عورتیں نہیں جان سکتیں، پھر لڑکیاں ایک دوسرے سے بے تکلف بھی جلد ہو جاتی ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ اس معاملے کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتی ہوگی اور اگر نہیں جانتی تو جان لے گی۔''

''آپ کا کھیال تو بالکل صحیح کھیال ہے''۔ بھولا سنگھ نے پھر حامی بھری۔

ڈی ایس پی بولا۔ ''تم ایسا کرو۔۔۔۔۔ کل صبح اس سرجیت نامی لڑکی سے رابطہ قائم کرو بلکہ بہتر ہے اسے میرے پاس لے آؤ۔ میں خود اس سے بات کروں گا۔''

بھولا سنگھ نے کہا۔ ''بالکل صحیح کھیال ہے۔''

اگلے روز دس بجے کے قریب سرجیت حویلی میں ڈی ایس پی بدروک کے سامنے بیٹھی تھی موٹی اوڑھنی اور میلے لباس کے باوجود اس کا شباب نکھرا نکھرا نظر آتا تھا۔ چہرے پر ابھی تک دو نیلگوں نشان موجود تھے۔ یہ بدروک سنگھ سے اس کی دوسری ملاقات تھی۔ بدروک سنگھ نے اس کے لئے چائے منگوائی اور اس کی رہی سہی جھجک دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ باتوں ہی باتوں میں وہ سرجیت کا حدود اربعہ بھی دریافت کرتا جا رہا تھا۔ سرجیت نے اسے بتایا کہ اس گاؤں میں ایک خالہ کے سوا اس کا کوئی نہیں۔ والدین کی موت کے بعد وہ بے سہارا تھی۔ اس نے نرسنگ کا کورس کر لیا اور اب تحصیل اسپتال میں ملازمت کرتی ہے، اس کی رہائش بھی اسپتال کے ہاسٹل میں ہے۔ ڈیڑھ دو ماہ بعد گاؤں آتی ہے اور چند روز خالہ کے پاس رہ کر واپس چلی جاتی ہے۔ اس نے پربت سنگھ کے ساتھ ہونے والے جھگڑے کا پھر تفصیل سے ذکر کیا اور بتایا کہ کس طرح اس کی معمولی بات پر بھڑک کر پربت سنگھ نے اسے باپ کی گالی دی تھی اور کیسے پربت سنگھ نے تھپڑ کا بدلہ لینے کے لئے اسے راہ چلتے اٹھا لیا تھا۔ بدروک سنگھ معنی خیز خاموشی سے سنتا رہا۔ جب سرجیت کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تو وہ جان گیا کہ اب ضرب لگانے کے لئے لوہا گرم ہے۔ اس نے بات کا رخ بڑی صفائی سے اپنی من چاہی سمت موڑ لیا۔ اس نے سرجیت سے پربت سنگھ کے معاشقے کے بارے میں دریافت کیا۔ سرجیت نے اس بارے میں لاعلمی ظاہر کی، ہاں اتنا ضرور بتایا کہ پربت کا چال چلن درست نہیں ہے۔ وہ میلوں ٹھیلوں میں اکثر عورتوں کے ارد گرد نظر آتا ہے اور کئی دفعہ عورتوں کی وجہ سے اس کا جھگڑا بھی ہوا ہے۔ ڈی ایس پی بدروک سنگھ نے دونوں خط نکال کر سرجیت کور کے سامنے رکھ دیئے اور کہا کہ وہ انہیں دھیان سے پڑھے۔ سرجیت نے سر پر اوڑھنی درست کی اور سر جھکا کر پڑھنے لگی۔

وہ دونوں خط پڑھ چکی تو ڈی ایس پی بدروک نے پوچھا۔ ''کچھ اشارہ ملا ہے؟''

سرجیت کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ گاؤں میں کئی لڑکیاں ہیں لیکن چندا کسی کا نام نہیں۔''

بدروک نے کہا۔ ''نام کو چھوڑو۔ نام کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بتاؤ تحریر سے کچھ اندازہ ہوتا ہے؟''
سرجیت نے ایک بار پھر غور سے لکھائی کا معائنہ کیا۔۔۔ آخر گھٹے گھٹے لہجے میں بولی۔
''میرا دھیان۔۔۔ سرنوں کی طرف جا رہا ہے؟''
''سرنوں کون ہے؟'' ڈی ایس پی نے پوچھا۔
''یہ وہی لڑکی ہے جس کی شادی پر پچھلے ہفتے جھگڑا شروع ہوا تھا۔ یہ پربت کے یار تارے کی بہن ہے۔ دونوں ہمسائے بھی ہیں۔ میں نے اکثر سرنوں کو پربت کے گھر آتے جاتے دیکھا ہے۔ سرنوں پڑھی لکھی بھی ہے۔ ہو سکتا ہے پربت نے اسی کو چند الکھا ہو۔۔۔''
ڈی ایس پی کے کرخت چہرے پر امید کی کرن نمودار ہوئی۔۔۔ وہ لہجے کی بے پناہ سختی کو حتی الامکان چھپاتے ہوئے بولا۔۔۔۔ ''تو اب یہ کام تمہارے ذمے ہے سرجیت۔ کسی طرح پتا چلاؤ کہ سرنوں کا پربت سے کیا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ بھی جس لڑکی پر تمہیں شبہ ہو مجھے بتاؤ۔۔۔ میں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ اس دفعہ کچی گڑھی سے پربت سنگھ کی جڑیں کھود کر جاؤں گا۔''
بدروک کی بات سن کر سرجیت کور کے چہرے پر آسودگی چھا گئی۔

☆☆☆

گاؤں پوری طرح پولیس کے نرغے میں تھا۔ چوہیا کا بچہ بھی پولیس کی نگاہ میں آنے بغیر باہر نہیں جا سکتا تھا۔ گلی کوچوں میں دہشت خم ٹھونکے کھڑی تھی۔ اندھیرا گہرا ہوتے ہی انسپکٹر بھولا سنگھ نے سرجیت کے گھر کا رخ کیا۔ کچی گلیوں کو روڈ رولر کی طرح اپنے قدموں سے کوٹتا وہ ایک نیم پختہ مکان کے سامنے جا رکا۔ پورے گاؤں کی طرح اس گلی میں بھی کرفیو کی سی حالت تھی۔ کسی کے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بھولا سنگھ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ سرجیت کی ڈری سہمی ماسی نے دروازہ کھولا اور پرنام کر کے بھولا سنگھ کو اندر لے گئی۔ یہاں سرجیت کور برآمدے میں کھڑی تھی۔ اس کے سراپا کو تھانے دارانہ نظروں سے گھورنے کے بعد بھولا سنگھ ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ سرجیت کور نے دوسرا موڑھا سنبھال لیا۔ چائے غالباً پہلے سے ہی تیار تھی۔ سرجیت کی ماسی فوراً برتن میز پر لے آئی۔
بھولا نے کہا۔ ''نہیں جی''۔ اس تکلف شکلف کی جرورت نہیں، میں تو بس بی بی سے کام

کی بات کرنے آیا ہوں۔''
ماسی لڑکھڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ سرجیت کور نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولی۔ ''ہمارا اندازہ غلط نکلا ہے جی۔ میں نے ڈی ایس پی صاحب کو بتایا تھا، میں تو زیادہ تر گاؤں سے باہر رہتی ہوں۔ دو ڈھائی مہینے بعد آنا ہوتا ہے۔ یہاں کے حالات کی کچھ زیادہ سن گن نہیں رہتی۔''
''تمہارا مطلب ہے، سرنوں وہ لڑکی نہیں ہے۔''
''نہیں جی۔ میں نے کل سارا کھوج لگایا ہے۔ پربت نے اسے بہن بنا رکھا تھا۔ باقاعدہ راکھی باندھی تھی سرنوں نے اسے۔۔۔ میں نے سرنوں کی لکھائی بھی دیکھی ہے۔ وہ خط کی لکھائی سے بالکل مختلف ہے۔''
بھولا سنگھ نے ایک گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے بی بی! میں جا کر ایس پی صاحب کو بتا دیتا ہوں''۔ وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔
''چائے تو پیتے جائیں''۔ سرجیت نے کہا۔
''نہیں چاہی جا ہے۔ ملاقات ہوتی رہے گی''۔ بھولا سنگھ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ وہ صحن کی طرف بڑھا لیکن اچانک رک گیا۔ پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''اوہ'' ایک کھاص بات تو بھول ہی گیا۔ وہ دوبارہ موڑھے پر بیٹھ گیا تو سرجیت کو بھی بیٹھنا پڑا۔ بھولا سنگھ بولا۔ بی بی! وہ تمہاری لمبی سی سہیلی ہے نا، بھرے بھرے پنڈے والی، چٹے رنگ کی۔۔۔۔ کیا نام ہے اس کا صاحباں۔ اس پر بدروک سنگھ صاحب کو کچھ شک سا ہوا ہے۔ تم نے خط میں پڑھا ہوگا اس میں بادام رنگی آنکھوں کی بات ہے۔ اس لڑکی کی آنکھیں بھی تو نسواری نسواری ہیں۔ ویسے بھی گاؤں میں سب سے اچھی شکل وصورت والی وہی ہے۔ کہیں۔۔۔۔ میرا مطلب ہے وہ۔۔۔۔
بھولا بات ادھوری چھوڑ کر سرجیت کی طرف دیکھنے لگا۔ سرجیت کے چہرے پر سوچ کے سائے پھیل گئے۔ کچھ دیر بعد وہ کھوئی ہوئی آواز میں بولی۔ ''لگتا تو نہیں ہے ایسا۔۔۔ پر۔۔۔۔ کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔''
''کہا تو کسی کے بارے میں کچھ نہیں جا سکتا بی بی۔۔۔۔ یہ تو پوچھ پڑتال ہو تو پتے چلتے ہیں ناں۔''

''لیکن انسپکٹر صاحب، وہ تو چٹی ان پڑھ ہے۔''

''ان پڑھ ہے تو کیا ہوا۔ سوہنی تو ہے ناں اور جب رب سوہن دیتا ہے تو خط پتر لکھنے بھی آ ہی جاتے ہیں۔ خود نہ لکھے جائیں تو ہوروں سے لکھوا لیے جاتے ہیں۔ کیا سمجھتی ہو۔'' سرجیت کور خاموش رہی لیکن چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھولا سنگھ کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے۔ وہ بولا ''تو بس پھر ٹھیک ہے۔ کل صبح سویرے صاحباں کی کلا دباؤ اور پتا کرو کہ اس نے کوئی چن چڑھایا ہے کہ نہیں۔''

☆☆☆

ڈی ایس پی بدروک سنگھ ہاتھ پشت پر باندھے کسی کالے چیتے ہی کی طرح کمرے میں چکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جھلاہٹ اور بے قراری تھی۔ انسپکٹر بھولا سنگھ ایک کونے میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے چور نظروں سے ڈی ایس پی کا تمتماتا چہرہ دیکھا اور داڑھی کھجا کر بولا۔ ''پتا نہیں کم بخت کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ لگتا ہے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔''

''بولے گا'' ضرور بولے گا۔ ڈی ایس پی نے اپنے گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''بس کسی طرح اس حرامزادی کا پتا چل جائے۔''

اچانک دروازے پر سنتری نمودار ہوا۔ اس نے کھٹاک سے سلیوٹ کیا اور بولا۔ ''جناب عالی ایک بی بی ملنے کے لئے آئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک بڑی عمر کی بی بی بھی ہے۔''

ڈی ایس پی نے بھولا سنگھ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے سرجیت اور اس کی ماسی ہوں گی، جاؤ ان دونوں کو اندر لے آؤ۔''

بھولا سنگھ سنتری کے ساتھ باہر نکلا اور تھوڑی دیر کے بعد سرجیت اور اس کی ماسی کو لے آیا۔ سرجیت نے حسب معمول سر اور جسم ایک موٹی اوڑھنی سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ماسی بھی چادر پوش تھی۔

دونوں عورتیں پرنام کر کے ڈی ایس پی کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ڈی ایس پی نے بھولا سنگھ سے کہا۔ ''تمہیں جو کام کہا ہے وہ کرو۔'' بھولا سنگھ نے تن کر سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

مختصر تمہید کے بعد سرجیت اصل موضوع پر آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''جناب! میں کوشش کے باوجود ابھی تک آپ کے لئے کوئی کام کی بات معلوم نہیں کر سکی۔ میں نے صاحباں سے بہت کھل مل کر باتیں کی ہیں۔ لیکن اس نے کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا جس سے اندازہ ہو کہ ... ت

سے اس کا کوئی سمبندھ رہا ہے۔''

ڈی ایس پی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''کہیں سہیلی سے پیار تو نہیں نبھا رہی ہو؟''

سرجیت نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب! اور صاحباں میری کوئی خاص سہیلی بھی نہیں۔ بس جیسے گاؤں کی دوسری لڑکیوں سے بول چال ہے اس سے بھی ہے۔ میں تو رہتی ہی زیادہ تر گاؤں سے باہر ہوں۔ ایسے میں سہیلیاں کیا بنیں گی۔ ایک دو بچپن کی سہیلیاں تھیں ان کی شادیاں ہو چکی ہیں۔''

ڈی ایس پی نے گہری سانس لی۔ ''تو تمہارا مطلب ہے صاحباں سے کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی۔''

''جی نہیں۔۔۔ وہ مجھ سے بہت کھل کر باتیں کرتی رہی ہے۔ اس کے رشتے کی بات ساتھ والے گاؤں میں پٹواری کے لڑکے سے چل رہی ہے۔۔۔ اور وہ اس بات چیت سے بہت خوش ہے۔''

ڈی ایس پی بولا۔ ''تم نے کہا تھا کہ صاحباں کی سہیلی بنتو پڑھ لکھ سکتی ہے۔ اس کی لکھائی کا کوئی نمونہ لائی ہو؟''

''جی ہاں!'' سرجیت نے کہا اور اوڑھنی کے پلو میں احتیاط سے باندھا ہوا ایک کاغذ کھول کر ڈی ایس پی کے سامنے رکھ دیا۔ یہ کاپی سائز کا ایک ورق تھا اور اس پر چھوٹے قیمے کے کوفتے بنانے کی ترکیب درج تھی۔ ڈی ایس پی نے میز کی دراز سے چندا والا خط نکالا اور اس کی تحریر کا موازنہ ''کوفتوں'' والی تحریر سے کرنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے مایوسی سے سر ہلا دیا اور دونوں کاغذ واپس دراز میں رکھ دیے۔

قریباً آدھ گھنٹے تک سرجیت اور ڈی ایس پی صاحباں کے متعلق بات چیت کرتے رہے۔ اس دوران سرجیت کی ماسی ڈری سہمی خاموش بیٹھی رہی۔ وہ سیدھی سادی دیہاتن اس ماحول میں بڑی گھٹن محسوس کر رہی تھی۔ جب سرجیت اور اس کی ماسی ڈی ایس پی کے پاس سے اٹھنے کی تیاری کر رہی تھیں تو بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور بھولا سنگھ دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک لڑکی تھی اور لڑکی کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ دونوں بری طرح گھبرائے ہوئے تھے۔ ایک موٹا تازہ کانسٹیبل ان دونوں کو قریباً دھکیلتے ہوئے اندر لایا۔ سرجیت نے لڑکی اور بوڑھے کو دیکھا تو چونک گئی۔ وہ دونوں دادا پوتی تھے۔ دادا کا نام جیونا تھا

اور اسے بلاشبہ گاؤں کا غریب ترین مزارع کہا جا سکتا تھا۔ لڑکی مالتی کور تھی۔ وہ بمشکل اٹھا انیس برس کی رہی ہوگی۔ بوسیدہ لباس میں اس کا شباب ایسے ہی تھا جیسے چمکتی دمکتی نئی گاڑی شوروم کے احاطے میں گردوغبار سے اٹی کھڑی ہو۔ وہ جیسے رو دینے کے قریب تھی۔ بوڑھا شخص سچ مچ رو رہا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر بھولا سنگھ سے فریاد کر رہا تھا۔

''ہم بے قصور ہیں سرکار۔ ہمارا کوئی دوش نہیں۔ مجھ سے انگوٹھے لگوا لیں۔ مالتی کا قصور ثابت ہو تو ہم دونوں کو پھانسی لگا دیں۔''

ڈی ایس پی نے سوالیہ نظروں سے بھولا سنگھ کو دیکھا۔ وہ گردن پھلا کر بولا ''ہاں ۔۔۔۔ یہی ہے جیونا کی پوتری ۔۔۔۔ بڑی مشکل سے لایا ہوں جی ۔۔۔۔ اندر سے کرپان اٹھا لائی تھی۔ کہتی تھی مجھے ہاتھ لگایا تو آتما ہتھیا کر لوں گی۔''

ڈی ایس پی نے کڑی نظروں سے لڑکی اور بوڑھے کو گھورا۔ بوڑھا سرتاپا فریاد نظر آ رہا تھا۔ ڈی ایس پی نے لہجے میں نرمی سمیٹ کر کہا۔ ''تم ذرا باہر بیٹھو بابا۔ میں ابھی تمہیں بلاتا ہوں۔'' اسی شاہی فرمان پر بوڑھا سرتاپا لرز گیا لیکن احتجاج کی ہمت نہیں تھی، بس ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ بھولا سنگھ اور فربہ اندام کانسٹیبل اسے دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ سرجیت گم صم منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ مالتی کو کیوں یہاں لایا گیا ہے۔ کیا یہ بھی پربت سنگھ والا معاملہ ہے یا کسی اور شک کی بنا پر اسے یہاں پہنچایا گیا ہے ۔۔۔۔ ڈی ایس پی اب پوری طرح مالتی کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس کا حسب نسب پوچھ رہا تھا اور مختلف سوالات کر رہا تھا۔ سرجیت سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے یہاں رکنا چاہئے یا نہیں۔ وہ تذبذب میں تھی۔ یہی حال ماسی کا بھی تھا۔ آخر ڈی ایس پی نے خود ہی ان کی مشکل آسان کر دی۔ وہ سرجیت کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں تم سے پھر بات کروں گا۔''

اگلے چوبیس گھنٹے سرجیت سخت پریشان رہی۔ اسے پتا نہیں چل رہا تھا کہ مالتی کور کو کس شبے میں حویلی لے جایا گیا ہے اور وہاں کیوں رکھا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ مالتی کا ایک بھائی ''ببر خالصہ'' میں شامل تھا اور دو برس پہلے دربار صاحب کے قریب پولیس مقابلے میں ہلاک ہو گیا تھا لیکن اس گاؤں میں کم از کم ایک درجن نوجوان اس طرح ہلاک یا لاپتا ہو چکے تھے، پھر جیونا اور اس کی پوتی ہی کو کیوں تختۂ مشق بنایا گیا تھا۔

گاؤں بدستور سخت محاصرے میں تھا اور دہشت کی فضا ہر گزرنے والے دن کے ساتھ گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا اس اذیت ناک صورتِ حال سے کب جان چھوٹے گی اور جان چھوٹنے تک ان کا کیا حشر ہو چکا ہوگا۔ اگلے روز بھی سارا دن مالتی اور اس کا دادا جیونا حویلی سے واپس نہیں آئے تو سرجیت نے حویلی جانے کی ٹھانی۔ حویلی ایک طرح سے عارضی تھانے کا روپ دھار چکی تھی۔ چوہدریوں کے علاوہ صرف سرجیت ہی تھی جو حویلی جانے کی ہمت کر سکتی تھی۔ ورنہ عام لوگ تو چکر کاٹ کر دور دور سے گزر جاتے تھے۔ جب رات گئے اندر سے بدنصیب نوجوانوں کی لرزہ خیز چیخیں ابھرتیں تو سننے والے کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے۔ اب یہ بات پورے گاؤں کو معلوم ہو چکی تھی کہ پربت نے گاؤں کے اردگرد کہیں بڑی مقدار میں اسلحہ چھپا رکھا ہے اور پولیس یہ اسلحہ برآمد کرانے کے لئے اس پر تشدد کر رہی ہے ۔۔۔۔ ان کا شیر لوہے کے جال میں تھا۔ اس پر رات دن آتشیں کوڑوں کی بارش ہو رہی تھی۔ وہ دہاڑ رہا تھا، چیخ رہا تھا لیکن وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی مدد کرنا تو کجا انہیں اپنی مال و جان اور آبرو کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

اندھیرا ہوا تو سرجیت تن تنہا گھر سے نکلی اور حویلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ راستے میں دو تین جگہ اسے پولیس کے مسلح سپاہی نظر آئے۔ حویلی کے بڑے پھاٹک پر بھی دو سنتری چوکس ہو کر ٹہل رہے تھے۔ سرجیت کو پہچان کر انہوں نے اسے اندر جانے دیا۔ وہ حویلی کی بیٹھک میں پہنچی تو انسپکٹر بھولا سنگھ نشے میں دھت ٹانگیں پسارے لیٹا تھا۔ ڈی ایس پی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سرجیت کو دیکھ کر بھولا سنگھ جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ست سری اکال بی بی ۔۔۔ آؤ بیٹھو۔ بیٹھو۔ کوئی کھیر کھیریت کی کھبر لائی ہو؟''

''بڑے صاحب کہاں ہیں؟'' سرجیت نے پوچھا۔

''وہ اوپر آرام کر رہے ہیں۔''

''اور مالتی اور اس کا دادا؟''

''وہ دادا پوتری اس سامنے والے کمرے میں ہیں۔ زیرِ تفتیش ہیں دونوں۔''

سرجیت کرسی پر بیٹھ گئی۔ بھولا سنگھ نے ٹوپی میز سے اٹھا کر سر پر رکھ لی۔ ''تھانے دار صاحب، یہ مالتی کو کس شبے میں پکڑا گیا ہے؟'' سرجیت نے پوچھا۔

''وہی پربت والا معاملہ ہے بی بی۔ ایک مکھبر نے شبہ کیا ہے اس پر۔''

''کون مخبر؟''

''ہے ایک۔''

بھولا سنگھ کے گول مول جواب سے جھوٹ کی سیاہی ٹپک رہی تھی۔ سرجیت نے کہا ''شبے کی کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔''

''میرے کھیال میں، وجہ تو صاف ظاہر ہے، ان کا پورا کھاندان ایک نمبر کا بدماش ہے مالتی کا ایک بھائی تو پولیس مقابلے میں گزر چ بھی ہو چکا ہے۔''

''لیکن پربت سے مالتی کا کیا تعلق؟''

''ہے تعلق۔۔۔۔ ہم نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئیں۔ پورے پندرہ سال کھائی ہے انوسیکیشنوں میں، اس لڑکی کے طور مجھے شروع سے ہی کھترناک لگتے تھے۔ بڑ۔ عشق پیچے لڑانے والی اکھ ہے اس کی۔ ناول پڑھتی ہے۔ ریڈیو کے فرمائشی پروگرام میں کھ لکھتی ہے۔ سنا ہے کسی شہری باؤ سے بھی اکھ مٹکا ہوا تھا اس کا۔۔۔۔''

یہ بات سرجیت کی سمجھ میں اچھی طرح آ رہی تھی کہ بھولا سنگھ کے پاس مالتی پر لگانے کے لئے کوئی ڈھنگ کا الزام نہیں ہے۔ وہ اسے صرف اس لئے پکڑ لایا تھا کہ وہ گاؤں کے سب سے لاچار اور غریب شخص کی اولاد تھی اور۔۔۔ جوان تھی۔ سرجیت کے چہرے پر غصے کی سرخی پھیلتی چلی گئی۔ وہ بے دردی سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کچلنے لگی۔

''کیا سوچ رہی ہو بی بی؟'' بھولا سنگھ نے شرابی لہجے میں پوچھا۔

''سوچ رہی ہوں۔۔۔ پربت سنگھ سامنے ہو تو کرپان سے اس کا پیٹ پھاڑ دوں۔ سب کیا دھرا اسی کا ہے۔ اسی کی وجہ سے یہ ساری مصیبت آئی ہے گاؤں پر۔۔۔ آپ لوگوں کو موقع نہ دیتا تو کیوں آتے آپ یہاں۔۔۔ کیوں پکڑ دھکڑ کرتے اور بے گناہوں کو سر باز گھسیٹتے؟۔۔۔ اب جس لڑکی کو آپ نے پکڑا ہے کیا جرم ہے اس کا؟ اس کا جرم صرف یہ ہے وہ اس گاؤں میں رہتی ہے جس میں پربت سنگھ جیسا عقل کا اندھا رہتا ہے اور لوگوں کو اپنی چرب زبانی سے پیچھے لگا لیتا ہے۔''

بھولا سنگھ کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں میں کمینی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ پولیس کے بار۔

سرجیت کے ریمارکس نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ''سنا ہے پربت سنگھ سے تمہاری پرانی دشمنی ہے۔''

وہ بولی ''کمزور عورت کی مرد سے بھلا کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ دشمنی تو ان لوگوں میں ہوتی ہے جو ایک دوسرے کا وار سہہ سکیں اور وار کر بھی سکیں۔ ناتواں عورت تو صرف بددعا دے سکتی ہے اور میرا یقین ہے پربت سنگھ اس حال کو پہنچا ہے تو میری بددعا سے پہنچا ہے، بڑا دکھ دیا تھا اس نے مجھے۔'' سرجیت کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

بھولا سنگھ نے گلاس کی ہلکورے لیتی بدبو اپنے گلے میں انڈیل کر کہا۔ ''اگر اس سے بدلہ لینا چاہتی ہو تو یہ سنہری موقع ہے۔۔۔ جوتی۔۔۔۔ جوتی ہے تمہاری پاؤں میں۔'' وہ شرابیوں کے انداز میں جھک کر اس کے پاؤں میں جوتی تلاش کرنے لگا، پھر ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''ہاں ہے، اس سامنے والے دروازے سے اندر چلی جاؤ۔ کھبے ہاتھ کے کمرے میں اسے باندھ رکھا ہے ہم نے۔ بالکل چوہا بنا رکھا ہے۔ کچھ نہیں کہے گا تمہیں۔ اس جوتی سے اچھی طرح سر پولا کرو اس کا اور میری طرف سے اس پر دو دفعہ لعنت اور ایک دفعہ تھوک پھینک کر واپس آ جاؤ۔۔۔ چلو۔۔۔ شاباشے، جاؤ دلیر ہو کر۔''

بھولا سنگھ نے باقاعدہ ہاتھ سے دھکیل کر اسے اندر بھیج دیا۔

اندرونی کمرے میں پہنچتے ہی سرجیت نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے لباس سے کرپان برآمد کی اور پربت سنگھ کی طرف بڑھی۔ پربت کی خون آلود کلائیاں ایک مضبوط رسی سے بندھی تھیں اور رسی سلاخ دار کھڑکی سے منسلک تھی۔ پاؤں ایک علیحدہ رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ دونوں رسیاں کاٹنے میں سرجیت کو ایک منٹ سے زائد نہیں لگا۔ پربت ایک دفعہ لڑکھڑا کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے نیم برہنہ جسم کے ہر انچ پر تشدد کے نشانات تھے لیکن آنکھوں میں وہی تازگی تھی جو ساری رات پرسکون نیند سونے والے کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ یہ تروتازہ آنکھیں متجسس نظروں سے سرجیت کو دیکھ رہی تھیں۔ ان دونوں نے مل کر تین منٹ کے اندر اندر باقی تینوں نوجوانوں کی بندشیں بھی کاٹ ڈالیں۔

''کس طرف جانا ہے؟'' پربت سنگھ نے تیز سرگوشی کی۔

''مجھے کچھ پتا نہیں۔'' سرجیت نے جواب دیا۔

پربت سنگھ نے کرپان مضبوطی سے تھامی اور دیوار کے ساتھ لگ کر راہداری کا جائزہ لینے

لگا۔ راہداری خالی تھی۔ وہ پانچوں آگے پیچھے رہداری میں پہنچے۔ چند قدم آگے زینے نظر آئے۔ وہ دبے قدموں زینوں پر چڑھنے لگے۔ ابھی پربت نے دوسری منزل کے گرد آلود فرش پر پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ ایک بند کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھلا۔ انہوں نے اپنے سامنے ڈی ایس پی بدروک سنگھ کو پایا۔ اس کے کیس کھلے تھے اور زیریں جسم پر صرف ایک پاجامہ نظر آرہا تھا۔ زینوں کا منظر دیکھ کر اس کے تاریک جسم میں برق سی کوند گئی لیکن اس سے پہلے کہ واپس کمرے میں گھستا یا گلا پھاڑ کر چیختا، پربت سنگھ تڑپ کر اس پر گرا۔ اس کے ایک ہاتھ نے روک کا منہ دبایا اور دوسرے نے خم دار کرپان دستے تک اس کے سینے میں اتار دی۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ ڈی ایس پی بدروک معمولی قد کاٹھ کا شخص نہیں تھا لیکن وہ گرانڈیل پربت بغل میں بونا نظر آرہا تھا۔ جان لیوا زخم کھا کر اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل آئیں۔ بری طرح تڑپا مچلا لیکن اس کا بالائی جسم بدستور پربت کے آہنی شکنجے میں کس... خون بہہ کر سفید پاجامے اور خاکستری زینوں پر گلکاریاں کر رہا تھا۔ پربت اسے گھسیٹتا ہوا زینوں سے دور لے گیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے سرگوشی میں ایک ساتھی کو ہدایت کی کہ... بدروک کی وردی نکال لائے۔ یہ نوجوان لپک کر کمرے میں پہنچا۔ یہاں گیس لیمپ کی روشنی میں اسے ایک کھونٹی پر پولیس یونیفارم بمع ہولسٹر کے نظر آگئی۔ قریب ہی اسے ایک اور "چیز" بھی نظر آئی لیکن وہ اسے غور سے نہیں دیکھ سکا۔ کیونکہ غور سے دیکھنے کے لئے دوبارہ دیکھنے کی ضرورت تھی اور وہ دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ مالتی تھی۔ جو ڈری سہمی بالکل سکتے کی حالت میں کمبل لپیٹے مسہری پر بیٹھی تھی۔ نوجوان یونیفارم لے کر باہر نکلا تو بدروک عرف کالا چیتا پربت سنگھ کی گرفت میں آخری ہچکی لے چکا تھا۔ پربت سنگھ نے کپڑے سے اپنے بازوؤں اور عریاں ٹانگوں سے خون صاف کیا اور وہیں کھڑے ہو کر جلدی جلدی وردی پہننے لگا۔ اس کام میں منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوئے۔ اس دوران پربت کے دو ساتھی دوسری منزل کے صحن میں گھوم پھر کر نیچے اترنے کا راستہ تلاش کرتے رہے۔ تیسرا ساتھی چھت پر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد یہ تیسرا شخص ہانپتا ہوا نیچے آیا۔ اس نے بتایا کہ حویلی کے پچھلے احاطے میں پرال بھری ہوئی ٹرالی کھڑی ہے اور چھت پر سے اس ٹرالی پر چھلانگ لگانا زیادہ مشکل نہیں۔

وہ پانچوں چھت پر پہنچے۔ لوڈ ٹرالی خاصی اونچی تھی۔ انہیں چھلانگ لگانے میں زیادہ دشواری

نہیں ہوئی۔ ٹرالی کے قریب ہی ڈی ایس پی کی گرد آلود جیپ کھڑی تھی۔ ڈرائیور جیپ کے اندر اگلی نشست پر سو رہا تھا۔ پربت سنگھ ٹرالی سے اترا اور احتیاط سے چلتا ہوا جیپ تک پہنچ گیا۔

"واہگرو خیر۔" ٹرالی پر بیٹھی ہوئی سرجیت کے ہونٹوں سے نکلا۔

"ڈر کی بات نہیں بہن۔" پربت کے ایک ساتھی نے کہا۔ "یہ ڈرائیور بڑا بیبا بندہ ہے۔ سمجھو وردی میں واہگرو کا سیوک چھپا ہوا ہے۔"

پربت کے ساتھی نے ٹھیک کہا تھا۔ جیپ کے اندر ڈرائیور کے اٹھنے سے حرکت تو پیدا ہوئی لیکن کوئی ہلچل نظر نہیں آئی۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ پربت ڈرائیور سے باتیں کر رہا تھا، پھر پربت کے ہیولے نے ہاتھ کی حرکت سے ان چاروں کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑی احتیاط سے نیچے آئے اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے جیپ تک پہنچ گئے۔ پربت نے عقبی دروازہ پہلے سے کھول رکھا تھا۔ وہ سوار ہو گئے۔ پربت نے سرجیت سمیت ان چاروں کو جیپ کے عقبی حصے میں یوں لٹا دیا کہ فوراً ان پر نگاہ نہ پڑ سکے۔ اس کے بعد اس نے ڈرائیور کے ساتھ والی نشست سنبھال لی اور ڈیش بورڈ سے ایک خون آلود کپڑا اٹھا کر چہرے پر رکھ لیا۔ یہ وہی کپڑا تھا جس سے اس نے چھت پر بدروک سنگھ کا خون اپنی ٹانگوں سے صاف کیا تھا۔ چند لمحے ڈرائیور اور پربت نے آپس میں سرگوشیاں کیں پھر جیپ اسٹارٹ ہوئی اور ایک جھٹکے سے حویلی کے مین گیٹ کی طرف بڑھی۔

جیپ کو آتے دیکھ کر مین گیٹ پر کھڑے سنتریوں نے بھاگ کر گیٹ کھولا اور سیلیوٹ کیا۔ جیپ موڑ کاٹتی ہوئی گیٹ سے گزری اور کشادہ گلی میں آئی۔ یہ رات کے نو بجے کا عمل تھا۔ گاؤں کی گلیاں جو سارا دن ویران رہتی تھیں بالکل ہی سنسان تھیں۔ ایک دو چوراستوں پر پولیس کے سپاہی نظر آئے۔ جلد ہی وہ گاؤں سے نکل آئے۔ کھیت کھلیان خاموش تھے۔ یوں لگتا تھا قرب و جوار میں کوئی موجود نہیں اور وہ یونہی دندناتے ہوئے کچی گڑھی کی حدود سے نکل جائیں گے لیکن وہ جانتے تھے، ایسا ہوگا نہیں۔ جلد ہی ان کی پولیس سے مڈبھیڑ ہوگی۔۔۔۔۔

اور پھر یہی ہوا۔ جونہی وہ نہر پار کرنے کے لئے پل کی طرف بڑھے۔ مسلح سپاہی ان کے سامنے آ گئے۔ ان کے کندھوں پر بندوقیں اور ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔ وہ تعداد میں دس کے قریب تھے۔ ان میں سے بیشتر اٹین شن ہو گئے جبکہ دو یا تین ٹارچیں سنبھالے جیپ کی طرف بڑھے۔

ایک ٹارچ کا روشن دائرہ ڈرائیور کے چہرے پر آ رکا۔

''ڈی ایس پی صاحب ہیں'' ڈرائیور نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''حویلی میں گو[لی] چلی ہے، صاحب زخمی ہوئے ہیں۔''

پربت نے بڑی ہوشیاری سے خون آلود کپڑا یوں چہرے پر رکھا ہوا تھا کہ ایک رخسار کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ دھماکا خیز خبر سن کر ٹارچ بردار کی تفتیشی حس کھب سے اڑ گئی منہ کھولے ''ڈی ایس پی'' کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیور نے جھٹکے سے کلچ چھوڑا اور جیپ دھول اڑاتی پل کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

کچی گڑھی سے قریباً 20 میل جنوب کی طرف لدھیانہ کے ایک مضافاتی علاقے میں انہوں نے جیپ روکی۔ پربت سنگھ سمیت چاروں نوجوان بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ لگتا نہیں تھا کہ وہ پورے چار روز شدید قسم کی جسمانی اذیت برداشت کرتے رہے ہیں یا یہ کہ چ[ند] گھنٹے پہلے انہوں نے ایک سانڈ نما ڈی ایس پی کو قتل کیا ہے اور موت کی آنکھوں میں دھو[ل] جھونک کر فرار ہوئے ہیں۔ وہ بڑی بے پروائی سے ہنس رہے تھے اور ٹھٹھے کر رہے تھے۔ با[س] سرجیت کچھ اداس تھی۔ شاید مالتی کی بے بسی کا تصور ابھی تک اس کے ذہن کو چوکے لگا رہا اور وہ اس بے گناہ کو کالے چیتے کے جبڑوں میں تڑپتے سسکتے دیکھ رہی تھی لیکن اس کے غم کی لو مدھم کرنے کے لئے یہ احساس موجود تھا کہ مالتی کا مجرم اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ اس کی خونچکا[ں] لاش چوہدری لج پال کی حویلی میں عبرت نگاہ بنی پڑی ہے۔

سرجیت اور پربت سنگھ درمیانی نشست پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ سرجیت کور کو اداس دیکھ کر پربت نے اپنا وزنی بازو اس کے کندھے پر رکھا اور بولا۔

''جو ہو چکا اسے مت سوچو۔ جس راہ پر ہم چل رہے ہیں اس پر پیچھے مڑ کر دیکھنا جرم ہے۔ آگے کی جانب دیکھو چندا۔۔۔ آگے کی جانب۔''

پربت کے ہونٹوں سے ''چندا'' کا لفظ سن کر ڈرائیور کرنت سنگھ سمیت سب ہی چونک گئے۔ وہ مڑ کر حیرت سے سرجیت کور کو دیکھنے لگے۔ وہ ہونٹوں میں ایک آسودہ مسکراہٹ دبائے خاموش بیٹھی تھی۔ پربت کے ایک ہم عمر ساتھی دربارے نے ہکلا کر کہا۔

''پربت۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو۔ یعنی چندا۔۔۔''

''ہاں، یہی ہے چندا۔'' پربت نے کہا۔

''اور وہ خط۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔''

''ہاں، اسی کا خط تھا جس نے ڈی ایس پی کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔''

سرجیت شرم سے سرخ ہونے لگی۔ وہ سب آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ ابھی تک کسی کو اس معاشقے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا عشق تھا جس کی مشک ابھی ہواؤں میں بکھرنا شروع نہیں ہوئی تھی۔

پربت کے ساتھیوں کو اس بات کا پتا دو تین روز بعد چلا کہ ڈی ایس پی بدروک جیسا گھاگ ''چندا'' کا پتا چلانے اور نتیجے میں پربت کی زبان کھلوانے میں کامیاب کیوں نہ ہو سکا۔۔۔ یہ حقیقت تھی کہ چندا یعنی سرجیت پولیس کے ہتھے چڑھ جاتی تو سرجیت کے لئے زبان بند رکھنا ناممکن نہ ہو جاتا۔ وہ سرجیت کو کچھ ایسے ہی ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ جس وقت پولیس نے گاؤں کا محاصرہ کیا، سرجیت گاؤں ہی میں تھی۔ پربت یہ بھی جانتا تھا کہ چند روز پہلے اس کے ایک دوست کے گھر سے سرجیت کا ایک پریم پتر پولیس کے ہاتھ لگ چکا ہے۔ اس نے پیشگی اندازہ لگا لیا کہ گرفتاری کی صورت میں پولیس اس پر بے پناہ تشدد کرے گی اور یقینی بات ہے کہ سرجیت کو بھی اس معاملے میں گھسیٹ لے گی۔ ایسا ہو جاتا تو پربت کی جان شکنجے میں آ جاتی۔ یہی سبب تھا کہ اس نے گرفتاری سے چند روز پہلے سرجیت کو ایک ڈراما کرنے پر مجبور کیا۔ سرجیت نے اسے تھپڑ مارا اور نتیجے میں پربت اسے اٹھا کر لے گیا۔ اس واقعے کا اثر یہ ہوا کہ جب پربت کی گرفتاری کے بعد ڈی ایس پی نے اس کی محبوبہ کا کھوج لگانے کی ٹھانی تو سرجیت کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا۔ یہ چراغ تلے اندھیرے والی بات تھی۔ وہ پورے گاؤں کی لڑکیوں میں چندا کو تلاش کر رہا تھا اور چندا اس کے بالکل قریب موجود تھی بلکہ اس کی ہدایت پر ''چندا'' کو ڈھونڈ رہی تھی۔ نہ اس کی تحریر کا موازنہ کیا گیا نہ اس سے پوچھ گچھ کی نوبت آئی۔ وہ اپنے کیموفلاج میں محفوظ رہی۔ آخر یہی کیموفلاج پولیس کی ناکامی، ڈی ایس پی کی موت اور پربت کے ساتھیوں کی رہائی کا سبب بنا۔

☆

کریڈٹ

اسد باغ جناح کے گنگا رام والے گیٹ کی طرف سے باغ میں داخل ہوا۔ اپنی نئی ٹو
کار اس نے پارکنگ میں کھڑی کی اور چابی گھماتا ہوا سر سبز روش پر ٹہلنے لگا۔ اچانک اس کی ن
گھونگھریالے بالوں والے پر پڑی۔ وہ ایک پتھریلے بینچ پر دراز تھا۔ اس کا چہرہ بازوؤں م
چھپا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ سو رہا ہے۔

گھونگھریالے بالوں والا اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ پچھلے ایک ہفتے میں اسد نے ت
چار بار اس نوجوان کو یہاں باغ میں دیکھا تھا۔ کبھی گھاس پر خاموش بیٹھے ہوئے۔ کبھی درختو
کے نیچے یوں ٹہلتے ہوئے کہ اس کی نگاہ کہیں دور بہت دور دیکھ رہی ہوتی تھی اور کبھی کسی گو
میں نیم دراز۔۔۔ اس کے چہرے پر ایک پرانا گھاؤ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی تیز دہ
آلے کا زخم ہے۔۔۔۔ یہ گھاؤ نما زخم اس کی پیشانی سے شروع ہو کر اس کے رخسار کو بدنما ب
ہوا اس کی ٹھوڑی تک چلا گیا تھا۔ پیشانی پر یہ زخم زیادہ گہرا تھا جس کی وجہ سے پیشانی پچکی ہ
سی نظر آتی تھی۔ اسد نے اس نوجوان کے لباس سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ پڑھا لکھا ہے
پنجاب ہی کے کسی علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ شاید وہ یہاں نوکری ڈھونڈنے کے لئے آیا تھ
پھر اپنے کسی بچھڑے ہوئے کی تلاش تھی، یا پھر یونہی راستہ بھٹکا ہوا تھا۔ اس کی غم زدہ آنکھ
میں دیکھ کر پہلا خیال ذہن میں یہی آتا تھا کہ وہ کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔ اپنی متجسس طبع سے مجبور ہ
ایک دو بار اسد کا دل چاہا تھا کہ وہ اس سے بات کرے لیکن پھر وہ اپنے اس ارادے کو عملی ج
نہیں پہنا سکا تھا۔

آج اس نے گھونگھریالے بالوں والے کو یوں لیٹے ہوئے پایا تو متجسس انداز میں ا

کے قریب چلا گیا، ''ہیلو مسٹر! وقت کیا ہوا ہے؟'' اسد نے یونہی اسے مخاطب کرنے کے لئے
دریافت کیا۔

کوئی جواب نہیں ملا۔ اسد نے ذرا اور قریب جا کر قدرے بلند آواز میں اپنا سوال دہرایا
اس مرتبہ بھی جواب ندارد۔۔۔ حالانکہ اسد محسوس کر چکا تھا کہ وہ شخص سو نہیں رہا۔ اسد نے
تیسری مرتبہ اسے مخاطب کیا تو اس نے جیسے مجبوراً آنکھوں پر سے بازو ہٹایا۔ اس کی سرخ
آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان آنسوؤں کو اپنے بازو کی رگڑ سے پونچھنے کی ناکام کوشش
کرتے ہوئے اس نے خفا نظر سے اسد کو دیکھا، پھر ایک نگاہ اپنی رسٹ واچ پر ڈالی اور بولا
''سوا پانچ۔''

''کیا بات ہے بھئی، کوئی پریشانی ہے؟'' اسد اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

''نن۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ پپ۔۔۔۔ پریشانی تو کوئی نہیں''۔ اس نے کہا۔

اسد کو اندازہ ہوا کہ وہ ہکلاتا ہے۔

''میں کئی دن سے تمہیں یہاں دیکھ رہا ہوں۔ دل چاہتا تھا کہ تم سے بات کروں۔''

''مم۔۔۔۔ مجھ سے؟'' اس کی ڈری ہوئی آنکھوں میں حیرت بھی نظر آنے لگی۔

''کیوں؟ کیا تم سے بات نہیں کی جا سکتی؟'' اسد نے مسکرا کر پوچھا۔

''مم۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔ مم۔۔۔ مجھ سے آ۔۔۔۔ آ۔۔۔۔ آپ کو
بھلا کیا۔۔۔ کک۔۔۔ کام ہو سکتا ہے؟''

''بس میرا دل چاہ رہا تھا تم سے بات کرنے کو۔ تم مجھے بڑے دکھی لگے ہو، اس کے علاوہ
یہاں لاہور میں اجنبی بھی ہو اور شاید مصیبت زدہ بھی۔''

''نہیں۔۔۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے جی۔'' وہ ہر لفظ پر ہکلاتے ہوئے بولا۔
لیکن جب وہ یہ فقرہ بول رہا تھا اس کی آنکھوں میں تازہ آنسوؤں نے امڈنے کی کوشش
کی تھی، جنہیں اس نے پسینہ پونچھنے کے بہانے اپنی میلی آستین میں جذب کرا لیا۔

اسد نے اسے سگریٹ پیش کیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔ اسد بڑی
اپنائیت کے ساتھ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ ان باتوں کے دوران میں اسد کو اتنا تو پتا
چل گیا کہ اس نوجوان کا نام شاہ زیب ہے اور وہ راولپنڈی سے یہاں آیا ہے۔ وہ بی اے تک

تعلیم حاصل کر چکا تھا اور کام میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا، اس کا باپ راولپنڈی میں فیض آباد
کے علاقے میں پودوں کی نرسری چلاتا تھا۔ شاہ زیب نے ہکلاتے ہوئے بتایا کہ وہ یہاں
لاہور کی سیر کرنے کے لئے آیا ہے، تاہم اسد جانتا تھا کہ وہ اصل بات چھپا رہا ہے۔ وہ اسے
کہہ سن کر اپنے گھر لے آیا۔

اسد کا گھر باغ جناح کے قریب ہی واقع تھا۔ یہ پندرہ مرلے کی خوب صورت کوٹھی تھی۔
اسد یہاں اپنی بہت ضعیف والدہ اور دو ملازموں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں
بطور پی آر او کام کرتا تھا۔ معقول تنخواہ تھی، آسانی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔

اسد نے شاہ زیب کو پہلے تو نہانے پر مجبور کیا، پھر وارڈ روب میں سے اسے ایک مناسب
سائز کی پتلون قمیض پہننے کو دی۔ رات کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ دونوں نے اکٹھے ہی کھانا
کھایا۔ والدہ تو سوئی ہوئی تھیں۔ گھر کے نوکر مہمان کا بگڑا ہوا چہرہ دیکھ کر شروع میں تو خوف زدہ
ہوئے لیکن بتدریج ان کا خوف کم ہو گیا۔ شاہ زیب قطعی طور پر بے ضرر اور سیدھا سادہ بندہ نظر
آتا تھا۔ کھانا کھانے اور اچھی سی چائے پینے کے بعد دونوں اسٹڈی روم میں آ گئے اور باتیں
کرنے لگے۔

گفتگو کے آغاز میں تو شاہ زیب کھچا کھچا رہا مگر پھر اسد کے مہرباں رویے نے اسے متاثر
کیا اور اس نے اسد کو بتایا کہ وہ یہاں ایک لڑکی کی تلاش میں آیا ہے۔ اسے کسی کی زبانی معلوم
ہوا تھا کہ وہ لڑکی لاہور میں ہے اور اسی علاقے میں کہیں رہتی ہے۔

اسد نے شاہ زیب سے کہا، کیا میں اس لڑکی کے بارے میں کچھ پوچھ سکتا ہوں؟

شاہ زیب نے بے خیالی میں اپنی پیشانی کے زخم کو چھوا اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا
''پپ۔۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔۔۔ کک۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔ آ آ۔۔۔ آپ بڑے اپنے اپنے
سے لگ رہے ہیں۔۔۔۔۔ جج۔۔۔۔۔ جج۔۔۔۔ جی چاہتا ہے کہ آ آ آپ سے۔۔۔۔
کک۔۔۔ کک۔۔۔ کچھ نہ چھپاؤں۔''

اسد نے کہا'' مجھے بڑی خوشی ہو گی شاہ زیب! اگر میں تمہارے کسی کام آ سکا تو۔''

ہمدردی پا کر شاہ زیب کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چمک گئے۔ اس نے اپنے انداز
میں ہکلا ہکلا کر غم زدہ لہجے میں اسد کو جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا۔

''ہم شروع سے فیض آباد میں رہتے ہیں۔ میرے والد پہلے کوٹھیاں بنانے کا کام کرتے
تھے پھر انہوں نے ایک نسبتاً آسان کام اپنا لیا اور پودوں کی ایک نرسری بنالی جس سے معقول
آمدنی ہونے لگی۔ ہم تین بہن بھائی تھے، میں سب سے چھوٹا تھا اور سب سے لاڈلا تھا۔
ہمارے پڑوس میں ایک لڑکی شاہین رہتی تھی۔ ہم بچپن میں اکٹھے کھیلے تھے۔ لڑکپن کی حدود میں
قدم رکھا تو ہمارے درمیان ایک اور طرح کا لگاؤ پیدا ہونے لگا۔ جب تک ہم دونوں دن میں
ایک مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیتے ہمیں بے قراری رہتی۔ ہماری آنکھیں ایک دوسرے کی
تلاش میں بھٹکتی رہتیں اور کان آواز سننے کو ترستے رہتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ کیفیت
شدید ہونے لگی۔ میرا دل کہتا تھا کہ میں تنہائی میں شاہین سے کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن کیا کہنا
چاہتا ہوں یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ شاید وہ بھی کچھ کہنا چاہتی تھی اور اسے بھی معلوم نہیں کہ
کیا کہنا چاہتی ہے۔۔۔۔ پھر ایک روز ایسا واقعہ ہوا جس نے اچانک مجھے شاہین سے بہت دور
کر دیا۔ ان دنوں میں دسویں میں پڑھتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس روز اسکول میں موسم
سرما کی چھٹیاں ہوئی تھیں، میں بہت خوشی خوشی گھر آ رہا تھا۔ سڑک پار کرتے ہوئے ایک تیز
رفتار ویگن نے مجھے ٹکر ماری۔ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹی اور چہرہ شدید زخمی ہو گیا۔ مجھے اسپتال
پہنچایا گیا جہاں میں کئی روز بے ہوش پڑا رہا۔۔۔۔ میرا چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا اور بازو پر
پلاستر تھا۔ کئی روز بعد گھر آ کر میں نے آئینہ دیکھا تو میرے سینے کے اندر جیسے کوئی شے
چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ میں اب خوب صورت شاہ زیب نہیں رہا تھا۔ اپنا چہرہ دیکھ کر خود مجھے ہی
کراہت آ رہی تھی۔ اس کے بعد میرے لئے حالات بتدریج بدلتے چلے گئے۔ میں یاروں
دوستوں سے دور دور رہنے لگا۔ کھیل کود سے دل اچاٹ ہوتا چلا گیا، گھر میں بھی بس کسی گوشے
میں پڑا رہتا تھا یا پڑھتا رہتا تھا۔ سب کچھ ہی تو بدل گیا تھا میرے لئے، یہاں تک کہ شاہین بھی
بدل گئی تھی۔ وہ مجھ سے کم کم ملنے لگی تھی۔ اب مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک
نظر نہیں آتی تھی، بس ایک ہمدردی سی چھلکتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ہمدردی بھی کم ہونے لگی۔ اگر
وہ مجھے کہیں اکیلے میں دیکھتی تو ڈری سی جاتی۔ حادثے کے بعد میری زبان میں بھی لکنت آ گئی تھی
لہٰذا میں جو فیملی میں بہت باتونی مشہور تھا بالکل ہی گم صم رہنے لگا تھا۔ میرے لئے زندگی اس
قدر اور اتنی تیزی سے بدلی تھی کہ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے

زندگی کی اس نئی شکل کو قبول کر لیا۔ میرے دل و دماغ نے تسلیم کیا کہ اب میں وہ نہیں ہوں جو پہلا تھا۔ میرے لئے سب کچھ بدل چکا ہے اور اس ''سب کچھ'' میں شاہین بھی شامل ہے۔ میرا دل وہی تھا، دل میں پیار وہی تھا، ارمان اور خواہشیں وہی تھیں لیکن چہرہ وہ نہیں تھا اور جب چہرہ وہ نہیں تھا تو پھر کچھ بھی وہ نہیں تھا، کتنی عجیب بات تھی۔

دھیرے دھیرے ماضی کا سب کچھ آنسوؤں میں بہہ گیا مگر ایک چیز بہہ کر بھی نہ بہہ سکی اور وہ شاہین کی من موہنی صورت تھی۔ وہ میری یادوں میں زندہ رہی۔ کچھ عرصے بعد وہ لوگ راولپنڈی سے شفٹ ہو کر لاہور آ گئے۔ میرے دل کی اجڑی ہوئی دنیا کچھ اور بھی اجڑ گئی۔ میں شاہین اور اس کی دنیا سے دور اپنی زندگی کا سفر اپنے ڈھنگ سے طے کرتا رہا، میں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد کچھ عرصہ بیکار رہا آخر والد صاحب مجھے اپنے ساتھ نرسری پر لے جانے لگے۔ شاید وہ خود بھی سمجھ گئے تھے کہ میں زندگی کی دوڑ میں دوسروں کی طرح شریک ہونے کے قابل نہیں ہوں۔ اب میں پچھلے چار پانچ سال سے والد کے ساتھ ہی ہوں۔ والد اور والدہ کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن میں نے ہر مرتبہ سختی سے انکار کر دیا ہے۔ میں شادی کرنا نہیں چاہتا اور اس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ تو آپ کے سامنے ہی ہے، یعنی میری شکل۔۔۔۔۔۔۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی معقول لڑکی اپنی رضامندی اور دلی خوشی کے ساتھ میرے ساتھ نباہ کر سکے گی۔ وہ جو کچھ کرے گی اس کے پیچھے ہمیشہ ایک مجبوری رہے گی۔ میرے انکار کی دوسری وجہ شاہین ہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں لیکن ایک ادھوری خواہش ہمیشہ دل سے چمٹی رہتی ہے۔ ایک دو ان کہی باتیں ہیں جو پھانس بن کر میرے سینے میں چبھی ہوئی ہیں اور کبھی چین سے نہیں رہنے دیتیں۔

یہاں تک بتا کر شاہ زیب نے ذرا توقف کیا۔ اپنی آنکھوں میں چمکنے والے آنسوؤں کو آستین سے صاف کیا اور کتنی ہی دیر کھوئی کھوئی نظروں سے فرش کو گھورتا رہا پھر اس نے ہکلاتے ہوئے بتایا ''بس ایک بار۔۔۔۔ ایک آخری بار شاہین سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے پاس سے اچھی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میں خوفناک ضرور ہوں لیکن مجھ سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میرے سینے میں آج بھی وہی دل موجود ہے جو ایک ننھی سی لڑکی

سے پیار کرتا تھا اور اسے اپنا سب سے اچھا دوست سمجھتا تھا۔۔۔۔۔ میں اسے بڑی نرمی سے چھونا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ اور اگر۔۔۔۔ وہ اجازت دے تو اس کی پیشانی کو چومنا چاہتا ہوں اور دل کی گہرائیوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دل میں اس کی نسبت سے کوئی شکوا کوئی گلہ نہیں ہے۔ میرا دل اسے ایک کامیاب اور پر مسرت زندگی کی دعا دیتا ہے اور ہمیشہ دیتا رہے گا۔ اس کے بعد اسے بڑی خوشی اور بڑے سکون کے ساتھ ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہہ دوں گا۔''

شاہ زیب کی پوری روداد اسد نے دلچسپی اور توجہ سے سنی۔ شاہ زیب خاموش ہوا تو اسد سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے بولا ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ شاہین لاہور میں ہے اور اسی علاقے میں رہائش رکھتی ہے؟''

شاہ زیب نے کہا۔۔۔۔۔ ''میرا ایک دوست اطہر ہے، اس کی والدہ یہاں کچھ دن گنگا رام اسپتال میں داخل رہی ہے۔ وہ بھی والدہ کے ساتھ ہی چکوال سے یہاں آیا ہوا تھا اس نے شاہین کو دو تین مرتبہ اسی علاقے میں دیکھا ہے۔ اپنی سرخ واکس ویگن میں ایک مرتبہ وہ شادمان کے چوک کی طرف سے آ رہی تھی۔ دو مرتبہ وہ اپنی سرخ گاڑی میں ہی جناح باغ کے اوپن تھیٹر والے گیٹ کی طرف سے نکل رہی تھی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ میرا دوست تینوں مرتبہ گاڑی کا نمبر نوٹ نہ کر سکا۔''

''اوہ مائی گاڈ!'' اسد کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے ''تت۔۔۔۔ تم اس سرخ گاڑی والی کی بات کر رہے ہو جو وہاں ایڈمنسٹریشن کے آفس میں کام کرتی ہے۔''

''کس آفس میں؟'' شاہ زیب نے حیرت سے پوچھا۔

اسد اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ وہی لڑکی ہے ناں جس کے بال ڈیانا کٹ ہیں اور ہونٹوں کے بالکل پاس نمایاں تل بھی ہے؟''

''ہاں۔۔۔۔ ہاں یہ وہی ہو گی۔۔۔۔۔'' شاہ زیب کی آنکھوں میں اور آس امید کے سینکڑوں دیے جل اٹھے ''یہ وہی ہو گی۔ وہ ہمیشہ چھوٹے بال رکھتی ہے اور اس کے اوپر کے ہونٹ کے پاس تل بھی ہے۔''

''میں نے اسے دیکھا ہے۔ میں اس کی رہائش سے بھی واقف ہوں''۔ اسد نے پورے وثوق سے کہا۔

شاہ زیب کے ہونٹ لرزتے چلے جا رہے تھے اور چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس کی ''لکنت کا شکار زبان'' اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اسد نے تسلی بخش انداز میں اور بڑے جوش سے اس کا کندھا دبایا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے دوست! شاہین سے ملنے کی تمہاری یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے۔''

شاہ زیب رونے لگا۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے، اسد کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا ''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر فراموش نہیں کروں گا۔''

☆☆☆

اسد اور شاہ زیب ایک صاف ستھرے اسنیک بار میں بیٹھے تھے۔ سڑک کی دوسری جانب تھوڑا سا دائیں رخ پر وہ کوٹھی واقع تھی جہاں شاہین کی رہائش تھی۔ یہ جگہ باغ جناح سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اسد نے سرخ واکس ویگن کو کئی مرتبہ باغ جناح کی طرف سے آتے اور اس کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اسد کو یقین تھا کہ سرخ گاڑی والی یہ لڑکی شاہین ہی ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ وہ دونوں اس اسنیک بار میں بیٹھ کر جلد یا بدیر اس کی جھلک دیکھ سکیں گے۔ ممکن تھا کہ وہ گاڑی لے کر باہر نکلتی یا پھر ویسے ہی اپنی کوٹھی کے ٹیرس یا لان وغیرہ میں نظر آ جاتی۔ شاہ زیب بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا اور لگتا تھا کہ اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں مدت کی پیاس تھی۔

اچانک اسد کو چونکنا پڑا اور اس کے ساتھ ساتھ شاہ زیب بھی بری طرح چونک گیا۔ وہ دونوں اسنیک بار کے عین دروازے سے سڑک کے اس پار شاہین کو دیکھنا چاہتے تھے۔۔۔۔ اور انہوں نے اسے دیکھ لیا مگر اپنی کوٹھی میں نہیں، اسنیک بار کے اندر۔۔۔۔ وہ گیلری میں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔۔۔۔ اچانک شاہین کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہیں شاہ زیب پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے اپنی نگاہوں پر یقین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چند لمحے بعد اس کے حسین چہرے پر خوف نمودار ہوا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے دہشت زدہ نظر آنے لگی۔ اس کی نوجوان ساتھی شدید الجھن کے عالم میں کبھی شاہین اور کبھی شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی۔ شاہین نے اپنی ساتھی کا بازو پکڑا اور اسے تقریباً کھینچتے ہوئے اسنیک بار سے باہر

لے گئی۔ دونوں باہر کھڑی ایک سفید سوزوکی میں بیٹھ گئیں۔ اسد نے شاہ زیب کو تو وہیں چھوڑا اور خود باہر آ گیا۔ سفید سوزوکی پارکنگ لاٹ میں سے نکلی تو اسد کی ٹویوٹا کار بھی رینگتی ہوئی اس کے پیچھے نکل گئی۔ شاہ زیب اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا رہ گیا اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ اسے برسوں سے یہی اندیشہ تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ وہ جب کبھی بھی شاہین کے سامنے جائے گا، وہ خوف زدہ ہو جائے گی۔

اسد کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ اس نے مسکرا کر قدرے تسلی بخش انداز میں شاہ زیب کا کندھا تھپتھپایا، پھر دونوں باہر گاڑی میں آ بیٹھے اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسد نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا ''میں نے اس سے بات کی ہے۔''

''کس سے؟''

''ظاہر ہے کہ وہ شاہین ہی ہے، ورنہ ایک دوسرے کو دیکھ کر تم دونوں کا اتنا برا حال کیوں ہوتا۔''

''کک۔۔۔ کیا بات کی ہے آپ نے؟''

''میں نے اس کا بے معنی خوف دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے یہاں سے تھوڑی دور چوراہے میں اس کی گاڑی روک لی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ صرف دو منٹ کے لئے میری بات سن لے۔ وہ پہلے تو راضی نہیں ہوئی لیکن پھر شاید میری منت سماجت پر اسے ترس آ گیا۔ اس نے گاڑی سڑک سے اتار کر روک دی۔۔۔۔ میں نے کھڑے کھڑے دس پندرہ منٹ اس سے تبادلہ خیال کر لیا۔ میں کھڑکی پر جھکا رہا اور وہ گاڑی کے اندر بیٹھی رہی۔''

''کک۔۔۔ کیا کہا آپ نے؟''

''وہی جو میں نے محسوس کیا ہے اور جو مجھے کہنا چاہئے تھا۔۔۔۔ وہ اتنے برسوں بعد اچانک تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی، میرا خیال ہے کہ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا اس کا یہی ردعمل ہوتا۔''

''آپ میرا دل رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں''۔ شاہ زیب نے اٹک اٹک کر کہا ''میں جانتا ہوں وہ سخت ڈر گئی ہے۔ اس نے یہی سمجھا ہو گا کہ میں اسے ڈھونڈتا ہوا اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ گیا ہوں اور اب اس کے لئے سخت مشکلات پیدا کرنے والا ہوں۔''

''تم کسی حد تک ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن میں نے جو دس پندرہ منٹ اس کے ساتھ بات
ہے وہ کافی مفید ثابت ہوئی ہے۔ اس کی جھجک کافی حد تک کم ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے
زیب کہ اگر مجھے ایک آدھ مرتبہ مزید اس سے بات کرنے کا موقع مل گیا تو اس کے سار
اندیشے دور ہو جائیں گے اور وہ خود تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کرے گی۔''

''نہیں، یہ کبھی نہیں ہوگا اسد صاحب''۔ شاہ زیب سخت مایوسی کے عالم میں سر ہلاتے
ئے بولا ''میری صورت کی طرح شاید میری تقدیر بھی بگڑ چکی ہے۔۔۔۔ میں نے جب جب
جو کچھ سوچا ہے، ہمیشہ اس کے الٹ ہی ہوا ہے''۔۔۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار نمی تیر
گئی تھی۔

اسد نے گاڑی چلاتے چلاتے بڑی محبت سے اس کا شانہ تھپکا ''شاہ زیب، میں
تمہارے اندر تمہارے خوب صورت دل کو پہچان لیا ہے، شاہین بھی ضرور پہچانے گی۔ وہ تو
سے تمہیں اور تمہارے دل کو جانتی ہے۔ اس کے لئے پہچاننا تو اور بھی آسان ہے۔''

گھر آ کر اسد نے شاہ زیب کو وڈیو پر ایک فلم دکھائی اور دل بہلانے کے لئے اسے
تک پائیں باغ میں گھماتا رہا۔ شاہ زیب اس گھر میں خود کو کافی مطمئن محسوس کر رہا تھا۔ اس
وجہ یہی تھی کہ یہاں اسے دیکھنے والے اور اس کے جسمانی عیب پر آنکھوں میں کراہت آ
حیرت بھر لینے والے بہت کم تھے۔ اسد کی والدہ تھی اور دو ملازم تھے۔ اسد کی والدہ کو ویسے
بہت کم نظر آتا تھا۔ ملازمین نے پہلے پہل اسے تعجب خیز نظروں سے دیکھا تھا، بہر حال اب
اس کے عادی ہو گئے تھے۔ ان تین افراد کے علاوہ گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ اسد نے بتایا تھا
اس کی شادی ہو چکی ہے لیکن کسی معمولی نوعیت کی گھریلو ناراضگی کے سبب اس کی بیوی آج کل
اپنے میکے میں تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں اسد کی باگیں ڈھیلی تھیں۔ وہ اپنی مرضی سے گھر
آتا تھا، مرضی سے جاتا تھا اور کبھی گھر میں بے تکلف دوستوں کی محفل بھی سجا لیتا تھا۔۔۔
بہر حال شاہ زیب کی موجودگی میں ابھی تک کوئی محفل نہیں سجائی گئی تھی۔ شاید اسد کو خود بھی
احساس تھا کہ شاہ زیب تنہائی پسند ہے اور اپنے گرد اجنبی افراد کی موجودگی اسے الجھن میں مبتلا
کر دیتی ہے۔

تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ اس دوران میں اسد نے شاہین سے ایک اور ملاقات

کی تھی۔ اس ملاقات کا مکمل احوال تو اسد نے نہیں بتایا، تاہم یہ ضرور کہا کہ صورتِ حال بہتر
ہوئی ہے۔ شاہین نے توجہ سے اس کی بات سنی ہے اور اس کے خدشات بھی کم ہوئے ہیں۔

ایک رات دوسرے پہر اچانک شاہ زیب کی آنکھ کھل گئی۔ اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی
تھی۔ اس نے فریج سے پانی پیا۔ اچانک اسے باتوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس نے ذرا
آگے جا کر ایک ادھ کھلی کھڑکی سے کان لگائے یہ اسد کی آواز تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں کسی سے
فون پر بات کر رہا تھا۔ شب کے سناٹے میں اس کی آواز وضاحت سے شاہ زیب کے کانوں
میں پہنچ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا ''پلیز۔۔۔۔ ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ انسان کا چہرہ بدلنے سے
اس کا دل تو نہیں بدلتا۔ اس کا مزاج اس کا کردار اور اس کی خواہشات سب کچھ وہی رہتا ہے۔
اگر ہم اچانک اسے ایک اجنبی سمجھنے لگیں گے تو یہ بہت بڑی اخلاقی گراوٹ ہوگی۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ اسد دھیان سے سنتا رہا، پھر بولا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو شاہین
۔ وہ سب کچھ ماضی کا حصہ ہے لیکن وہ بھی تو کوئی مختلف بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ تم سے کچھ مانگ
نہیں رہا۔ اپنے دل پر جبر کر کے وہ تمہارا سب کچھ تمہیں لوٹا چکا ہے۔ وہ تو بس تمہاری زندگی
سے چند لمحے مانگنے کے لئے آیا ہے۔ ایک دوست کی حیثیت سے، دو چار ان کہی باتوں کا بوجھ
اپنے سر سے اتارنا چاہتا ہے شاید۔۔۔۔ تم سے ایک بار مل کر اور چند باتیں کر کے وہ بڑے
اطمینان سے واپس چلا جائے گا اور پھر شاید کبھی واپس نہیں آئے گا۔''

دوسری طرف سے پھر کچھ کہا گیا، جسے اسد سنتا رہا اور ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا، آخر
میں بولا ''وہ بڑا سادہ مزاج ہے شاہین۔۔۔۔ وہ ٹوٹے دل کے ساتھ یہاں آیا ہے، اگر ٹوٹے
دل کے ساتھ ہی لوٹ گیا تو مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔ پلیز۔۔۔۔ میں تم سے درخواست کرتا
ہوں۔۔۔۔''

اچانک کہیں پاس سے کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ شاید بلی تھی۔ شاہ زیب گھبرا کر اپنے
بستر پر واپس چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اسد کی آواز آنا بھی بند ہو گئی۔ اس نے فون رکھ دیا تھا۔

شاہ زیب کے دل پر بوجھ سا پڑ گیا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ اس کا میزبان کتنی مشکل
سے دوچار ہے۔ وہ اس کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈال رہا تھا۔ اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے
شاہین سے ملاقاتیں کر رہا تھا۔ اس کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی منت

ماجت میں مصروف تھا۔۔۔۔لیکن وہ شاید اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔ شاہ زیب کا دل سا گیا۔ اس نے سوچا کہ کل جس وقت اسد آفس میں ہوگا وہ بڑی خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلا جائے گا۔ شاہین کی پیشانی پر بوسہ دینا، اسے گلے سے لگانا تو دور کی بات تھی، وہ تو اس قابل بھی نہیں تھا کہ وہ اسے توجہ سے دیکھ ہی لیتی۔ اس سے ایک آدھ بات ہی کر لیتی۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ شاہین کے دیدار کی بھیک مانگنے کے لئے یہاں بن بلایا مہمان بن کر نہیں رہے گا۔ اپنی آخری ناتمام خواہش کا دکھ بھی اپنے ''دردخزانے'' میں جمع کرے گا اور یہاں سے چلا جائے گا۔

مگر اس روز عجیب بات ہوگئی۔ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اسد کو نجانے کیسے شک پڑ گیا کہ شاہ زیب یہاں سے چپ چاپ نکل جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آفس روانہ ہونے سے پہلے اس نے حسب معمول اپنی والدہ اور شاہ زیب کے ساتھ ایک ہی ٹیبل پر ناشتا کیا۔ اس کی والدہ تو چلی گئیں اور ٹیبل پر اسد اور شاہ زیب بیٹھے رہ گئے۔ اسد نے صاف گوئی کے انداز میں کہا ''شاہ زیب! آج میں تمہیں اپنے ساتھ ہی آفس لے جاؤں گا۔ میں تمہیں آفس دکھانا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ شک بھی ہے کہ تم کہیں خاموشی سے رفو چکر نہ ہو جاؤ۔ نہ میرے بھائی! اب کوئی ایسی حرکت نہیں چلے گی۔ میری ساری محنت برباد ہو جائے گی۔''

''لیکن۔۔۔۔''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' اسد نے تیزی سے اس کی بات کاٹی پھر پیار سے ڈانٹتے ہوئے بولا ''تمہارے دل کی مراد پوری ہونے والی ہے۔ شاہین مان گئی ہے اور سچ پوچھو تو اس کے اپنے دل میں بھی تم سے ملنے اور باتیں کرنے کی خواہش موجود ہے لیکن وہ عورت ہے اور تمہیں پتا ہی ہے کہ عورت کتنی مجبور ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے بالکل وہی کچھ اس کے دل میں بھی ہو، مگر اپنے جذبے کے اظہار سے پہلے اس بے چاری کو سو بار سوچنا پڑے گا۔''

''اس کی۔۔۔شش۔۔۔شش۔۔۔شادی ہو چکی ہے؟''

''ہاں۔ اس کا شوہر امریکا میں ملازمت کرتا ہے، اور پچھلے ایک سال سے وہیں پر ہے۔ وہ اپنے دفتر کی ایک کولیگ کے ساتھ اس کوٹھی میں رہتی ہے۔''

''کوئی بچہ ہے؟''

''نہیں۔''

''اور۔۔۔شش۔۔۔شاہین کے والدین؟''

''ان کے بارے میں تو معلوم نہیں۔ کل ملو گے تو خود ہی پوچھ لینا۔''

''کک۔۔۔کل؟'' شاہ زیب کی آنکھوں میں ڈر اور شوق یوں اکٹھے ہوئے کہ ایک چیز بن گئے۔ بدنما چہرے کے باوجود وہ بے حد معصوم نظر آنے لگا۔

☆☆☆

اگلا دن شاہ زیب کی زندگی کا حسین ترین اور یادگار ترین دن تھا۔ وہ شاہین کے گھر ان کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا اور شاہین صرف چند فٹ کی دوری پر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ یہ وہی سہانا خواب تھا جو وہ دس پندرہ برس سے دن رات دیکھتا چلا آ رہا تھا ''آپ کیسے ہیں'' شاہین کی دل نشیں آواز شاہ زیب کے کانوں سے ٹکرائی۔

''بب بالکل۔۔۔ٹھ۔۔۔ٹھیک۔۔۔اور۔۔۔آ۔۔۔آپ؟''

''میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ آنٹی اور انکل کیسے ہیں۔۔۔ اور آپ۔۔۔۔۔ آپ کیا کرتے ہیں آج کل؟'' وہ شرما رہی تھی اور چہرے پر قوس قزح کے رنگ لہرا رہے تھے وہ ب اب اس کے چہرے پر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا جو اسنیک بار میں نظر آیا تھا۔ اس دیرینہ خوف کی جگہ ایک طرح کی شناسائی اور انسیت نے لے لی تھی۔ آج شاہ زیب کو شاہین کے چہرے پر دوستی اور قربت کا وہی جذبہ نظر آیا تھا جو کبھی فیض آباد میں نظر آیا کرتا تھا۔ وہ چھتیں وہ منڈیریں وہ کوچے اور بازار سب اسی کومل جذبے کے کومل رنگوں میں رنگے رہتے تھے۔ اسی لئے تو وہ سبھی رنگین یادیں ابھی تک شاہ زیب کے دل و دماغ پر نقش تھیں۔

''آپ کہیں کھو گئے۔'' وہ ہولے سے مسکرائی اور اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں کو ایک ادا کے ساتھ پیشانی سے ہٹایا۔

''نن۔۔۔نہیں تو۔۔۔مم۔۔۔میں آپ کی۔۔۔۔بب۔۔۔بات سن رہا ہوں۔ مم۔۔۔مم۔۔۔میں نے پچھلے برسوں میں آ۔۔۔آپ کو بب۔۔۔بہت۔۔۔یا۔۔۔یا۔۔۔یاد کیا ہے شاہین۔۔۔مم۔۔۔مجھے لگتا تھا۔۔۔جج۔۔۔جیسے آپ مجھ سے روٹھ

---گُگ گئی ہیں---اور جب مجھے ایسے لگتا تھا تو پھر---مم---میں سوچتا تھا کہ مم--
میرا چہرہ بگڑا ہے---تت---تت تو یہ میری غلطی ہے۔ حالانکہ ایسا تو نہیں تھا ناں؟'' اس
گلا رندھ گیا۔

''نہیں شاہ زیب! میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ بس حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے کہ
آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔'' شاہین کے لہجے میں ندامت پوشیدہ تھی۔

''مم---میں سچے دل سے کہتی ہوں۔ خدا کی قسم مم---مجھے---آ آپ
کوئی شش---شش شکوا نہیں ہے۔ یہ مم---مم---میری قسمت تھی۔ بب---
---ایک بار---آ آ آپ سے ملنے کو دل چاہتا تھا---آ آپ سے چند---
---باتیں کرنے کو دل چاہتا تھا۔''

''سچ پوچھیں شاہ زیب تو میں بھی اکثر پرانے دنوں کو یاد کرتی رہی ہوں۔ انکل کو، آ
کو۔ آپ سب کو مس کرتی رہی ہوں۔''

اتنے میں ساتھ والے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ شاہین فون سننے کے لئے دوسر
کمرے میں گئی۔ اسد نے سرگوشی کے لہجے میں کہا'' شاہ زیب! میں نے کہا تھا ناں کہ اگر تم
کے بارے میں سوچتے رہے ہو تو وہ بھی ضرور سوچتی رہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ایک
تمہیں دیکھنا چاہتی ہو۔ اب قدرت نے تمہیں موقع دیا ہے اسے ضائع مت کرو۔ میں سگر
ڈھونڈنے کے بہانے تھوڑی دیر کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ تم اپنے دل کی باتیں کھل کر شا
سے کہہ سکتے ہو۔ دلیر بنو---اگر تمہارے دل میں کوئی چور نہیں تو پھر تمہیں گھبرانے کی بھی
ضرورت نہیں۔''

شاہ زیب روکتا ہی رہ گیا لیکن اسد اٹھ کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد شاہین فون سن کر
واپس آ گئی۔ اس نے اسد کے بارے میں پوچھا تو ملازمہ نے بتایا کہ وہ سگریٹ لینے کے
نکلے ہیں ابھی تھوڑی دیر میں آ جاتے ہیں۔ ملازمہ چائے وغیرہ بنانے چلی گئی تو شاہ زیب
شاہین کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ دونوں ماضی کی یادوں کو تازہ کرنے لگے۔ یہ سلسلہ چ
دونوں جیسے گزرے دنوں کے دھندلکے میں کھو سے گئے۔ ایک ایک بات ایک ایک واقعہ یا
گیا۔ جو سوال برسوں سے ذہن میں تھے ان کے جواب ملے، جو ان کہی باتیں دل و دما

الجھن میں مبتلا کرتی تھیں وہ کہہ دی گئیں۔ بس چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں، عام نوعیت کے سوال و
جواب تھے۔

شاہ زیب ایک صاف گو شخص کا نام تھا۔ اس نے اپنے اور شاہین کے حوالے سے کوئی
بات بھی دل میں نہیں رکھی۔ صاف بتایا کہ وہ اسے کیسے کیسے یاد کرتا رہا ہے۔ کس کس موقع پر
اسے کس کس طرح مس کرتا رہا ہے۔ وہ بے تکلفی سے بتاتا رہا اور وہ بے تکلفی سے سنتی رہی۔ وہ
خوابیدہ لہجے میں بولا'' شاہین! جن دنوں ہم بچھڑے، میں تمہیں پسند کرتا تھا۔ اس پپ---
پسند کو میں کوئی نن---نام پہلے دے سکتا تھا اور نن---نہ اب دے سکتا ہوں۔ بب---بس
تم مجھے پسند ہو، اور ہم---ہم---ہمیشہ رہو گی۔ جن دنوں ہم اکٹھے ہو---ہو---ہوتے
تھے---مم---میں اکثر سوچا کرتا تھا، اگر ہمیں ایک دو---دوسرے سے دور ہونا پڑا---
مم---میرا مطلب ہے کہ بب---بچھڑ کر زندہ رہنا پڑا---تت---تو میں تمہیں---
بب---بڑے اچھے طریقے سے رخصت کروں گا، اور---اور---اور ہنستے چہرے کے
ساتھ رخصت کروں گا۔ بب---بغیر کسی شش شکوے شکایت کے---ان دنوں ایک---
گگ---گیت اکثر مم---میرے کانوں میں گونجا کرتا تھا---وہ---وہ تمہیں بھی بہت
پسند تھا---یاد ہے ناں وہ نن---نن---نظم؟''

''ہاں۔'' شاہین نے اثبات میں سر ہلایا ''ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو۔ ہمیں تتلیوں کے
جگنوؤں کے دیس جانا ہے۔''

''ہاں---یہی نن---نظم'' شاہ زیب نے تصدیق کی۔ کھوئے کھوئے لہجے میں
بولا'' مم---میرا دل چاہتا تھا، جب کبھی تت---تم مجھ سے جدا ہونے لگو، میں اپنے انسوؤں
کے پیچھے سے مم---مسکرا کر تمہاری طرف دیکھوں---تت تمہاری پیشانی کو چوموں اور بب
---بڑے خلوص کے ساتھ ہمیشہ کے لئے خو---خو---خدا حافظ کہہ دوں۔''

شاہین کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے۔ ان آنسوؤں میں ندامت تھی اور
اس کے علاوہ ایک شکوا تھا۔ یہ شکوا اکثر اس کے ذہن میں ابھرا کرتا تھا۔ معلوم نہیں یہ شکوا کس
سے تھا؟ حالات سے؟ اپنے آپ سے؟ یا اس حادثے سے جس نے ان دونوں کو جدا ہونے پر
مجبور کر دیا تھا۔ جسم کی ثانویت اور روح کی اولیت کو سمجھتے بوجھتے بھی وہ شاہ زیب سے گریز پر

مجبور ہوگئی تھی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، لیکن ایسا ہوا تھا۔

''مم۔۔۔۔ میں۔۔۔ تمہیں چھونا چاہتا ہوں شاہین۔'' شاہ زیب کے ہونٹوں سے جذبات سے بوجھل آواز نکلی۔

شاہین کی پلکیں لرز کر جھک گئیں۔ ایک کرشماتی لمحے نے اس کے چہرے پر آمادگی اور خود سپردگی کا تاثر سجادیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوجے کے سامنے کھڑے تھے۔ درمیان میں صرف دو فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ نہایت جذباتی انداز میں شاہ زیب آگے بڑھا اور اس کے ہونٹ شاہین کی پیشانی پر ثبت ہوگئے۔ اس کی پیشانی چوم کر وہ پیچھے ہٹا تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ شاہین بے اختیار اس کے گلے سے لگ گئی۔ شاہ زیب کو دیکھا اور ایک بار پھر اس کے گلے سے لگ گئی۔ اس عمل کو کسی بھی رشتے۔۔۔ یا تعلق کے ساتھ منسلک نہیں کیا جاسکتا تھا، بس یہ خالص پیار کا عمل تھا۔

دونوں پیچھے ہٹ گئے ایک کہنہ سال، دیرینہ بوجھ تھا جو آنسوؤں کے ساتھ ہی ان کے دل و دماغ سے ڈھل گیا تھا۔ شاید وہ دونوں ہی اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگے تھے۔

''مم۔۔۔ میں بدنما ضرور ہوں شاہین۔۔۔ لل۔۔۔ لیکن خوفناک نہیں ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

شاہین کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ شاہ زیب کی بات سے مکمل اتفاق کر رہی ہے۔

☆☆☆

شاہ زیب واپس جا رہا تھا۔ اسد اسے الوداع کہنے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا۔ وقت رخصت شاہ زیب نے اسد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما اور جذباتی لہجے میں بولا ''مم۔۔۔ میں آپ کا یہ احسان۔۔۔ زند۔۔۔ زندگی بھر بھلا نہ سکوں گا۔ مم۔۔۔ میری دعا ہے کہ۔۔۔ جج جس طرح آپ نے مم۔۔۔ مجھے خوشی دی ہے، خو۔۔۔ خدا آپ کو بھی خوشی دے آپ کا دل اور گھر آباد ہوجائے۔''

اسد نے کہا ''میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ تمہاری خواہش ہے کہ میری روٹھی ہوئی بیگم گھر واپس آجائے اور میرے سائیں سائیں کرتے گھر میں پھر سے رونق ہو جائے۔''

شاہ زیب نے اثبات میں سر ہلادیا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی۔'' اسد نے کہا پچھلے دنوں اپنی بیگم سے میری دو چار ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ ان ملاقاتوں کی وجہ سے ہماری کشیدگی کافی حد تک کم ہوگئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اب وہ دو چار دن میں گھر آجائے گی۔''

''یہ۔۔۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ لل۔۔۔ لیکن یہ ہوا کیسے؟''

''دراصل ایک اتفاق کے تحت ہم دونوں کو اکٹھے ایک پروجیکٹ پر کام کرنا پڑ گیا تھا۔''

''پپ۔۔۔ پروجیکٹ؟''

اسد ہولے سے مسکرایا ''ہاں پروجیکٹ۔ یہ ایک بہت سادہ اور بہت پیارے شخص کی دل جوئی کا پروجیکٹ تھا، اسے ایک دیرینہ بوجھ سے آزاد کرانے کا پروجیکٹ۔''

شاہ زیب حیرت سے اس کی طرف دیکھتا چلا جارہا تھا۔ بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنا شروع ہوگئی تھی۔

اسد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''ہاں شاہ زیب! شاہین ہی میری روٹھی ہوئی بیوی ہے۔''

''آ۔۔۔ آپ نے تو۔۔۔ آ۔۔۔ آپ نے تو۔۔۔؟'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔

''شاہ زیب! میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ شاہین کا شوہر امریکا میں رہتا ہے۔ اس حوالے سے دیگر سب باتیں جھوٹ ہی تھیں۔ میں نے یہ جھوٹ اپنی اور تمہاری آسانی کے لئے بولے تھے۔ مجھے امید ہے کہ اس کے لئے تم مجھے معاف کردو گے۔''

''اوہ خدایا! آپ نے۔۔۔ مم میری خاطر اپنی بیوی کو۔۔۔ اپنی بیوی کو۔۔۔'' وہ ایک بار پھر ہکلا کر رہ گیا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا ہے میرے دوست۔ میں نے صرف تمہارے اندر کے خوب صورت انسان کو پہچانا ہے۔ اگر تم مجھے اس کا کریڈٹ دینا چاہو تو بخوشی دے سکتے ہو۔''

شاہ زیب حیرت سے اس کی طرف دیکھتا چلا جارہا تھا، پھر وہ بے ساختہ اس سے لپٹ گیا۔

☆

تاخیر

اسد اور اس کے تینوں ساتھیوں نے نقاب پہن رکھے تھے۔ ان کی کیڈلک کار کوٹھی کی عقبی دیوار کے سامنے رکی۔ انجن بند کرنے اور ہیڈ لائٹس بجھانے کے بعد وہ چاروں گاڑی سے اترے۔ اسد نے اپنے ساتھی ملک احمد عرف ملک الموت کو اشارہ کیا۔ اس نے پھرتی سے دیوار پھلانگی اور کوٹھی میں کود گیا۔ ذرا دیر بعد رکھوالی کے دو کتوں کے بولنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی سائلنسر لگے پسٹل سے تین گولیاں چلائی گئیں، کتوں کی آواز خاموش ہوگئی۔ دو سیکنڈ بعد عقبی دروازہ کھول دیا گیا اور اسد سمیت تینوں افراد دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ ان میں سے ایک کے پاس رائفل تھی جب کہ باقی تینوں سائلنسر لگے پستولوں سے مسلح تھے۔

سب سے پہلے دونوں چوکیداروں کو گولی ماری گئی پھر وہ لوگ اندرونی دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ ایک لحیم شحیم شخص چیختا ہوا ان کے سامنے آیا اس کے ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔ اسد کے اشارے پر ملک الموت نے اس کی کھوپڑی میں یکے بعد دیگرے تین گولیاں ٹھونک دیں۔ یہ گھر کا سربراہ سیٹھ انوار احمد تھا۔ اس کے بعد سیٹھ کے دو بیٹے اور ان کی بیویاں سامنے آئیں۔ مردوں کے چہرے تاریک تھے اور عورتیں ہزیانی انداز میں چلاتی چلی جارہی تھیں۔ پہلے دونوں نوجوانوں کو گولی ماری گئی۔ پھر ایک خاتون کی پیشانی میں سرخ بندیا نمودار ہوگئی۔ دوسری لڑکی غالباً ٹیلی فون استعمال کرنے کے لئے سیڑھیوں کی طرف دوڑی تھی۔ اسد نے اسے بھی ڈھیر کر دیا۔

باقی اہل خانہ کو کمروں سے گھسیٹ کر باہر نکالا گیا۔ وہ گڑگڑا رہے تھے، قدموں میں گر کر زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ جن بخشی کے عوض اپنا سب کچھ دینے پر آمادہ تھے، مگر اسد اور

س کے ساتھیوں پر یہ سب کچھ بالکل بے اثر تھا۔ وہ ایسے مناظر سیکڑوں مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ ان کے دل پتھر اور ضمیر مردہ ہو چکے تھے۔ وہ خطرناک دہشت گرد تھے اور قتل و غارت ان کا وڑھنا بچھونا تھا۔ اگلے چند سیکنڈ میں انہوں نے انوار احمد کے تمام اہل خانہ کو قتل کر ڈالا۔ کامن روم، ڈرائنگ روم اور بالائی منزل کو جانے والی سیڑھیاں مقتولین کے لہو سے سرخ ہو گئیں۔ رنے والوں میں دو بچے بھی شامل تھے۔

ان کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ آج رات انہیں یہی کام سونپا گیا تھا۔ ان کے گروہ کے سرغنہ نے انوار احمد اور اس کے اہل خانہ کی زندگی کی قیمت وصول کی تھی اور یہ قیمت دینے والا انوار مد کا ایک کاروباری رقیب تھا۔

"FINISH" اسد نے پسٹل کی نال میں پھونک مارتے ہوئے ملک الموت سے پوچھا۔

''یس ماسٹر فنش'' ملک عرف ملک الموت نے جواب دیا۔

مگر چند ہی سیکنڈ بعد اس کا جواب غلط ثابت ہو گیا۔ اسد کے ایک ساتھی نے ڑھیوں کے نیچے جھانکا اور ایک لڑکی کو بالوں سے گھسیٹ کر اسد کے سامنے پھینک دیا۔ لڑکی کی ر بائیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ اس کے لمبے ریشمی بال ں کے کولہوں تک پہنچ رہے تھے۔ وہ امیرانہ خدوخال والی ایک نرم و نازک اور خوبصورت شیزہ تھی۔ لیکن اسد صرف اور صرف ایک قاتل تھا۔ جس طرح کمان سے نکلنے والے تیر اور تول سے نکلنے والی گولی کی آنکھ نہیں ہوتی اسی طرح اسد بھی شاید اپنے مقتول کو دیکھتا نہیں تھا۔ صرف اسے مارتا تھا، لیکن نشانہ لینے کے لئے ایک بار تو دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ اسد نے بھی ایک لڑکی کو نظر بھر کر دیکھا تھا اس کے پسٹل کا رخ لڑکی کی پیشانی کی طرف تھا اور سفاک انگلی ٹریگر ی۔ یہی لحہ تھا جب اس کی نگاہیں لرزتی کانپتی لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائی تھیں۔ ڈری سہمی اور ی نگاہیں جن میں موت کا خوف اور زندگی کی خواہش منجمد سی ہوگئی تھی۔ وہ ایسی سحر کار آنکھیں ں کہ اسد کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس کی انگلی جو کبھی ٹریگر پر حرکت کرنے سے چوکی نہیں تھی ج چوک رہی تھی۔ اس نے بڑے بڑے معصوم جوان اور حسین لاشے گرائے تھے لیکن آج ی کی بلاخیز سفاکی کو نجانے کیا ہوا تھا، اسے محسوس ہوا کہ وہ رحم کا مرتکب ہونے والا ہے۔ اور چ مچ ایسا ہوگیا۔ رحم۔۔۔ جو اس کی لغت میں جرم تھا، اس سے سرزد ہو گیا تھا۔ اس کا پسٹل

والا ہاتھ، کونے میں سمٹی ہوئی نازک لڑکی کے سامنے جھک گیا۔ اس کے ساتھی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

☆☆☆

اسی ایک کمزور نازک سی لڑکی نے اسد کی کیمسٹری بدل کر رکھ دی۔ آناً فاناً اسد کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہو گیا۔ اس لڑکی کا نام عنبرین تھا۔ اس کی حسین دلکشی نے اسد کے سنگلاخ سینے میں محبت کی ایک سرسبز کونپل کھلائی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ کونپل ایک تناور درخت بن کر جھومنے لگی۔ سفاک مجرم اور بے رحم قاتل اسد کے دل میں یہ عجیب امنگ جاگی کہ وہ اس آہو چشم لڑکی کے سنگ ایک نئی زندگی شروع کرے۔ ایک ایسی زندگی جس پر جرم کا سایہ تک نہ ہو۔ جو ایک نارمل زندگی ہو۔ جس میں اسد ایک شوہر ہو اور عنبرین ایک بیوی۔ وہ محنت کر کے حق حلال کی روزی کمائے، شام کو تھکا ہارا گھر آئے، عنبرین ایک دلنشیں مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرے۔ ان کے آنگن میں چہکارتے ہوئے پھول کھلیں اور ایک خوبصورت کائنات ان کی پرسکون چاردیواری میں سمٹ آئے۔

یہ خواہش ایسے تندوتیز ریلے کی طرح اسد کے دل سے ٹکرائی کہ وہ چٹان صفت ہونے کے باوجود تنکے کی طرح اس بہاؤ میں بہہ گیا۔ کچھ بھی اس کے بس میں نہ رہا اور وہ ایسا کچھ کر گزرا جس کا اس نے یا اس کے کسی ساتھی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔۔۔ اسد کے لئے ایک نئے روپ میں عنبرین کے سامنے آنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ جس وقت اس نے عنبرین کے والد کی کوٹھی میں واردات کی تھی وہ نقاب میں تھا۔ پھر جب وہ لوگ عنبرین کو کوٹھی سے اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لائے تھے اس وقت بھی اسد اور اس کے ساتھیوں نے نقاب نہیں اتارے تھے۔ عنبرین اب اسد کے ڈیرے پر تھی لیکن اس کی صورت سے قطعاً ناواقف تھی۔ ایک دن اسد نے اپنے ساتھی ملک احمد کو اپنا ہم راز بنایا اور وہ سب کچھ کر گزرا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے دیگر دو ساتھیوں کو کسی کام سے لاہور سے باہر بھیج دیا پھر اس نے بازار سے اپنے لئے بڑے مناسب سے کپڑے خریدے۔ حجامت وغیرہ کروائی، نہایا دھویا اور اپنے ہی ڈیرے پر ایک نئے روپ میں پہنچ گیا۔ اس نے چابی لگا کر اس کمرے کا دروازہ کھولا جہاں عنبرین کو محبوس رکھا گیا تھا۔ خوف زدہ عنبرین اپنے سامنے پینٹ شرٹ والے ایک عام سے نوجوان کو دیکھ کر حیران رہ

گئی۔

اسد نے ہیجانی لہجے میں کہا ''چلو آؤ، میں تمہاری مدد کے لئے آیا ہوں۔ وہ ڈاکو یہاں سے بھاگ گئے ہیں انہیں پولیس کے چھاپے کا ڈر تھا لیکن پولیس ابھی تک نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس کے آنے کی اطلاع غلط ہو اور وہ پھر آ جائیں۔''

''لل۔۔۔ لیکن۔'' عنبرین ہکلائی۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر دیر کرو گی تو پھر پھنس جاؤ گی۔ مجھ پر بھروسا کرو۔''

اسد عنبرین کو اپنی ہی حراست سے نکال کر لے آیا تھا۔ باہر آ کر دونوں نے ایک ٹیکسی پکڑی تھی اور سیدھے اسٹیشن پہنچے تھے۔ اسد کسی نہ کسی طرح عنبرین کو راولپنڈی لے آیا۔ یہاں ملک احمد سارا انتظام پہلے ہی کر چکا تھا۔ ایک غیر معروف علاقے میں اس نے ایک مناسب سا مکان کرائے پر لے لیا تھا اور وہاں روزمرہ ضروریات کی اشیا بھی جمع کر لی تھیں۔ اسد نے ملک احمد کا تعارف اپنے دیرینہ دوست کے طور پر کرایا۔ ایسا دوست جو اس مشکل وقت میں ان دونوں کی مدد کے لئے تیار تھا اور ہر طرح قابل بھروسا بھی تھا۔

چند دن وہ تینوں وہاں اکٹھے رہے۔ عنبرین اس دوران میں اسد پر خاطر خواہ بھروسا کرنے لگی۔ اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ اسد اسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اسد نے عنبرین کو اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ اس چاردیواری سے باہر اس کے لئے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ ان لوگوں کا خطرہ جنہوں نے اس کے والد اور پورے خاندان کو قتل کیا تھا۔ کرپٹ پولیس کی طرف سے خطرہ اور بگڑے تگڑے معاشرے کی طرف سے خطرہ۔ ویسے بھی عنبرین کا بچا کون تھا جس کی پناہ میں جانے کی اسے آرزو ہوتی، والد، بھائی، بھابیاں، چچا سب ہی تو اس منحوس رات کو جان ہار گئے تھے۔ اسے اسد کی ''مہربان'' ذات کی شکل میں ایک پناہ گاہ اور ایک حفاظتی حصار نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ اسد کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔

اسد نے عنبرین سے شادی کر لی اور ایک بالکل نئی زندگی کا آغاز کیا۔ اس زندگی میں ملک احمد بھی اس کا شریک سفر تھا۔ ایک باوفا دوست کی طرح وہ قدم قدم پر اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اسد نے محنت کر کے حق حلال کی کمائی سے ایک گمنام علاقے میں جنرل اسٹور کھول لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ جنرل اسٹور ایک چھوٹے پیمانے کا ڈپارٹمنٹل اسٹور بن گیا۔ عنبرین کی محبت اور

دلنشیں قربت نے اسد کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی خوب صورت داڑھی بھی تھی اپنے لباس اور وضع قطع سے وہ نہایت نفیس نظر آتا تھا۔ ایک خون خوار انسان کے اندر سے ایک ایسا خوب صورت انسان برآمد ہوا تھا کہ کبھی کبھی اسد کو بھی اپنے اوپر تعجب ہونے لگتا تھا۔ عنبرین بھی اسد کے ساتھ خوش تھی۔ تاہم اکثر وہ بیٹھے بیٹھے کہیں گم ہو جاتی تھی۔ اسد سے اور اردگرد کے ماحول سے کہیں بہت دور چلی جاتی تھی۔ ایسے میں اس کی خوب صورت آنکھوں میں کچھ خونچکاں مناظر کا عکس نظر آنے لگتا تھا۔ والد کا خون آلود جسم، بھائیوں اور بھابیوں کے چھلنی لاشے، گولیوں کے شعلے اور نقابوں کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی خوفناک آنکھیں۔ وہ کون تھا؟ جس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کے ہنستے بستے گھر پر شب خون مارا تھا اور سب کچھ ملیا میٹ کر دیا تھا۔ کاش وہ اس کو بھی مار ڈالتا۔ وہ اسے موت کے بالکل قریب لے جا کر واپس لے آیا تھا۔ ساری زندگی اپنے پیاروں کی یاد میں تڑپنے کے لئے اسے زندہ درگور کر گیا تھا۔

اسد نے چند بار اس حوالے سے عنبرین سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ ذکر چھیڑتے ہی عنبرین کی حالت غیر ہونے لگتی تھی۔ اس کا جسم کانپتا تھا، ہونٹ نیلے سے ہو جاتے تھے اور حسین آنکھوں میں دنیا جہاں کا کرب سمٹ آتا تھا۔ ایک دن اس نے ہاتھ جوڑ کر اسد سے کہہ دیا تھا" پلیز اسد! مجھ پر ترس کھائیں۔ میرے سامنے یہ بات نہ چھیڑا کریں۔ میں آپ کی محبت کے سہارے وہ سب کچھ بھولنے کی کوشش کر رہی ہوں، آپ یہ ذکر چھیڑتے ہیں تو میرے زخموں سے خون نکلنے لگتا ہے۔"

کہنے کو تو وہ کہہ رہی تھی کہ وہ یہ سب کچھ بھولنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن اسد جانتا تھا کہ تنہائی ملتے ہی وہ اپنے پیاروں کی تصویروں کا خیالی البم نگاہوں کے سامنے سجا کر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ ان لوگوں کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی جنہوں نے اس کے گھرانے کو خون میں نہلایا تھا۔ وہ افراد یقیناً اس کے لئے دنیا کے سب سے قابل نفرت انسان تھے۔ اس واقعے کے حوالے سے کچھ ایسی ہی کیفیت اسد کی بھی تھی۔ وہ بھی کوشش کے باوجود کچھ بھی بھول نہیں پا رہا تھا۔ اس نے بڑی بے دردی سے بے شمار قتل کیے تھے لیکن یہ آخری چند قتل اس کے دل کا داغ بن گئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان مقتولوں کا تعلق اس ہستی سے تھا جو اسد کو دنیا میں سب سے

زیادہ پیاری تھی، یعنی عنبرین! گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اسد کے دل و دماغ پر بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ کئی بار اس کے دل میں یہ آئی کہ وہ سب کچھ عنبرین کے گوش گزار کر دے۔ اس کے سامنے اپنا ہر جرم قبول لے اور پھر فیصلہ اس پر چھوڑ دے، لیکن ہر بار جب اس نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانا چاہا ایک بلند و بالا دیوار اس کے سامنے آ گئی۔ وہ ریزہ ریزہ ہونے کے بعد جڑا تھا، اس میں اب اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ عنبرین کی محبت سے محروم ہو کر پھر سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ وہ بڑا سخت دل تھا، اس نے مشکلات کی بڑی بڑی چوٹیاں سر کی تھیں مگر اعتراف جرم کی یہ چوٹی سر کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اس نے ارادہ کیا کہ پہلا بچہ پیدا ہو جائے تو پھر وہ عنبرین کو سب کچھ بتا دے گا مگر پہلا بچہ پیدا ہونے کے بعد بھی وہ اپنے اندر یہ ہمت پیدا نہ کر سکا پھر اس نے یہ کام دوسرے بچے کی پیدائش تک کے لئے اٹھا رکھا، دوسرا بچہ پیدا ہوا لیکن اسد اعتراف جرم کی گھاٹی پھر بھی سر نہ کر سکا۔ دو بچوں کے بعد بھی عنبرین سے اس کی محبت روز اول کی طرح قائم تھی بلکہ شاید اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ وہ اس کی صورت اور سیرت کا شیدائی تھا اور اس کی محبت کی شدت اسے طوفانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ دے رہی تھی۔ اس کا کام پھل پھول رہا تھا۔ گھر میں خوش حالی تھی۔ اس کے علاوہ اس پر خدا کا ایک اور احسان ہوا تھا۔ وہ اب تک پولیس کے علاوہ اپنے گروہ کی نظروں سے بھی محفوظ تھا۔ اس کا طوفانی ماضی اس کے پرسکون حال کو گزند پہنچانے میں ناکام رہا تھا۔ درحقیقت اسد نے اپنی زندگی کو ایک غیر معروف علاقے کی چند غیر معروف گلیوں تک محدود رکھا تھا۔ وہ کہیں آتا جاتا نہیں تھا اور نہ اس کے بیوی بچے کہیں آتے جاتے تھے۔ ان دونوں کو آنے جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عنبرین کی طرح اسد کا بھی کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔ وہ ایک تنہا شخص تھا اور اس نے تنہا عنبرین کے ساتھ مل کر ایک ایسی دنیا آباد کی تھی کہ جو محدود ہونے کے باوجود اپنی جگہ بے حد بارونق اور مکمل تھی۔

ہاں ملک احمد کی بات مختلف تھی۔ وہ خود کو اس نئی صورت حال میں ایڈجسٹ نہیں کر پایا تھا۔ شروع میں تو اس کا خیال تھا کہ جوانی کا جوش ہے جو جلد ہی اتر جائے گا۔ اسد کا دل عنبرین سے بھر جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ سال دو سال لگ جائیں گے۔ آزاد فضاؤں میں اڑنے والا عقاب، محدود زندگی کے پنجرے سے اکتا کر پھر آزاد فضاؤں میں لوٹ جائے گا

۔۔۔لیکن آہستہ آہستہ ملک احمد پر اصل صورت حال واضح ہونے لگی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اسد اپنی نئی زندگی میں گم ہوتا چلا جارہا ہے۔ عنبرین جس کی حیثیت داشتہ کی ہونی چاہیے تھی "محبوب شریک حیات" کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور محبت کا بھوت اسد کے سر سے اترنے کے بجائے اس کے جسم کے ہر ہر ریشے میں سرایت کرتا چلا جارہا تھا۔ اس نے اپنے طور پر اسد کو سمجھانا بجھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اسے بڑی بے تکلفی سے کنویں کا مینڈک کہنے لگا تھا اور کنویں سے نکل کر حسین وجمیل پر ہنگام زندگی کی طرف لوٹنے کے مشورے دے رہا تھا۔ ان مشوروں کے جواب میں اسد اسے شادی کرنے کا مشورہ دے رہا تھا اور اس کی طرح ایک پرسکون دنیا بسانے کی تلقین کر رہا تھا۔ کئی ماہ یہ کشمکش جاری رہی۔ دونوں دوست اپنے اپنے موقف پر قائم تھے۔ دھیرے دھیرے اسد کو محسوس ہونے لگا کہ ان دونوں کے راستے بدل رہے ہیں۔

پرعیش وپرہنگام ماضی ملک احمد کو اپنی طرف کشش کر رہا تھا۔ اور یہ کشش اتنی شدید تھی کہ کسی عنبرین جیسی سحر کار ساتھی کے بغیر اس کی مزاحمت ناممکن تھی اور پھر ایک روز ایک طویل بحث کے بعد اسد اور ملک احمد میں تلخ کلامی ہوئی۔ اس واقعے کے ٹھیک دو روز بعد ملک احمد نے بڑی خاموشی سے اپنا راستہ جدا کر لیا۔ اسد جب رات گئے اپنے اسٹور سے واپس آیا تو عنبرین کی زبانی اسے پتا چلا کہ ملک احمد گھر چھوڑ کر جا چکا ہے۔

اسد کی زندگی ایک بار پھر زبردست اتھل پتھل کا شکار ہوگئی۔ ملک احمد کے جانے کے بعد وہ شدید عدم تحفظ کا شکار ہو گیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ ملک احمد جرم کی اسی پرانی دنیا میں لوٹا ہوگا جہاں سے ڈھائی تین سال پہلے آیا تھا۔ اس کا یوں لوٹنا کئی طرح سے اسد کے لئے خطرے کا باعث تھا۔ اسد نے فیصلہ کیا کہ وہ فوری طور پر یہ جگہ چھوڑ دے گا۔

اس نے جتنی تیزی سے فیصلہ کیا تھا اتنی ہی تیزی سے اس پر عمل بھی کیا۔ تین چار دن کے اندر وہ راولپنڈی کے اس محلے سے اٹھا اور ایبٹ آباد پہنچ گیا۔ وہاں اندرون شہر اس نے ایک مکان کرائے پر لیا اور ساتھ ہی دکان بھی خرید لی۔ جمی جمائی زندگی کو چھوڑ کر نئی جگہ آباد ہونا جان جوکھم کا کام تھا مگر عنبرین اور بچوں کی محبت نے اسد میں حوصلے کا پہاڑ کھڑا کر رکھا تھا۔ اس پہاڑ کے سامنے ہر مشکل اسے حقیر نظر آتی تھی۔ دو تین ماہ میں وہ اس نئی جگہ پر بھی سیٹ ہو گیا۔ بعض اوقات بظاہر حوصلہ پست کرنے والے واقعات انسان کے لئے غیر معمولی بہتری کا باعث بن

جاتے ہیں۔ ایبٹ آباد میں گو بہت سی دشواریاں پیش آئیں لیکن جلد ہی حالات موافق ہونے لگے۔ اس نئی جگہ پر اسد کا کاروبار زیادہ تیزی سے پھلنا پھولنا شروع ہوا۔ وہ ایک ٹھیک ٹھاک ڈپارٹمنٹل اسٹور کا مالک بن گیا۔ اسی دوران میں اس کے ہاں تیسرے بچے کی ولادت بھی ہو چکی تھی۔ اسد نے عنبرین کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دینے کا مشکل ترین کام تیسرے بچے کی ولادت تک کے لئے اٹھا رکھا تھا لیکن جس طرح وہ دو مرتبہ پہلے ناکام ہوا تھا، تیسری مرتبہ بھی ناکام رہا۔ وہ جب بھی اس بارے میں سوچتا تھا اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگتی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہ خوفناک سچ بول کر اپنا بہت کچھ گنوا دے گا اور اس کے ساتھ ساتھ عنبرین کے مندمل زخموں سے بھی کھرنڈ اس طرح اتریں گے کہ وہ سرتاپا زخم بن جائے گی۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ سچ بولنا چاہتا تھا لیکن یہ سچ اس سے جو بھاری قیمت طلب کر رہا تھا وہ اس کے لئے ادا کرنا ممکن نہیں تھی۔ عنبرین اور بچوں کے بغیر ایک دن بھی گزارنا اس کے لئے مشکل تھا۔ درحقیقت جب سے عنبرین اس کی زندگی میں آئی تھی، دونوں ایک رات کے لئے بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ اب اگر اسد کسی شدید مجبوری کے تحت کہیں آنے جانے کا سوچتا بھی تو عنبرین اور بچوں کی جدائی کا تصور ایک دیوار بن کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔

اس کا بڑا بچہ حمزہ اب چار سال کا ہو چکا تھا۔ اسد نے اسے ایک بڑے اچھے اسکول میں داخل کروایا تھا، گھر میں اس کے لئے قاری کا انتظام کروایا تھا اور اس کی تربیت پر بھرپور توجہ دینے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ اپنے گناہوں کا کفارہ کسی حد تک اسی طرح ادا کر سکتا ہے کہ اپنے بچوں کو شریف شہری اور نہایت اعلیٰ انسان بنانے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دے۔ فرصت کے لمحات میں اپنے نئے گھر کی خوبصورت بالکونی میں بیٹھ کر اسد اور عنبرین اکثر اس موضوع پر بات کیا کرتے تھے۔ یہ دس مرلے کا گھر اسد نے حال ہی میں خریدا تھا اور میاں بیوی نے بڑے ذوق وشوق سے اس کی آرائش کی تھی۔ خاص طور سے اسد تو ہر وقت اس گھر کو زیادہ آرام دہ اور زیادہ خوبصورت بنانے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا لیکن ان ساری مصروفیات کے دوران بھی وہ عذاب اپنی جگہ برقرار تھا۔ "جھوٹ" ایک بہت بڑا بوجھ بن گیا تھا اور یہ بوجھ ہر وقت اس کے سینے میں اس کے دل کو مسلتا رہتا تھا۔

آخر ایک روز سب کچھ اسد کے بس سے باہر ہو گیا۔ ایک طویل سوچ بچار کے بعد ا
نے ایک دن اچانک فیصلہ کر لیا کہ وہ اب کچھ بھی عنبرین سے نہیں چھپائے گا۔ اس روز ا۔
ڈپارٹمنٹل اسٹور کاؤنٹر کے عقب میں بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہ اخبار کے بیرونی صفحہ پر پڑی تھی
وہاں سیٹھ انوار کی پانچویں برسی کا اشتہار موجود تھا۔ یہ اشتہار ہر سال ان کی کمپنی کے چ
دوستوں کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ دنیا سے چلے جانے والے کو یاد رکھنے کا یہ ایک بہانہ تھا۔ ا
اشتہار نے اسد کو یاد دلایا کہ آج سیٹھ انوار احمد کو قتل ہوئے پانچ برس ہو گئے ہیں۔ اپنے با
اور دیگر اہل خانہ کی برسی کا دن عنبرین کو ہمیشہ اداس تر کر دیا کرتا تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں
سوج جاتی تھیں۔ وہ گھر میں قرآن خوانی کا انتظام کراتی تھی اور ایک ہی دن میں ہفتوں کی بیـ
نظر آنے لگتی تھی۔

اسد نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آج رات وہ عنبرین سے اپنی زندگی کی اہم ترین گفتگو کرے
رہے گا۔ وہ ایک تاریک کمرے میں اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر اپنے سینے سے لگائے گا او
پھر آنسوؤں کے درمیان وہ سب کچھ کہہ ڈالے گا جو کہنا چاہتا ہے۔

لیکن اس شام وہ گھر گیا تو سب کچھ بدلا ہوا سا نظر آیا۔ نہ عنبرین نے سوجی ہوئی آنکھوں
کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ نہ گھر میں قرآن خوانی کے لئے جمع ہونے والی عورتوں کی جھلک
نظر آئی۔ نہ حمزہ، شعیب اور ننھی آمنہ کے چہرے دکھائی دیے۔ گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا
اندرونی دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔ ایک چابی اسد کے پاس بھی موجود تھی، وہ دروازہ کھول کر
اندر داخل ہوا اور شدید پریشانی کے عالم میں ادھر اُدھر پھرنے لگا۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی
نہایت بری خبر کی اطلاع دے رہی تھی اور اس کا دل جیسے اندر سے رونا شروع ہو گیا تھا۔ ایک
میز پر ایک بند لفافہ اس کا منتظر تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا اور صوفے پر بیٹھ
کر پڑھنے لگا۔

لکھا تھا "تمہارے گھر اور تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں۔ میں تمہیں
یقین دلاتی ہوں کہ تم کبھی میری یا بچوں کی صورت نہیں دیکھ سکو گے۔۔۔ اور میرے خیال میں
یہ تمہاری کم سے کم سزا ہے۔ آج سے دو سال پہلے تمہارا دوست ملک احمد تمہیں چھوڑ کر چلا گیا
تھا۔ وہ تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن تم نہیں گئے۔ اس نے تمہاری اس بے وفائی

کا بدلہ یوں لیا کہ جاتے جاتے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا گیا۔ ہاں اسد۔۔۔ پچھلے
دو سال سے مجھے یہ بات معلوم ہے کہ میں ایک انسان کے ساتھ نہیں سفاک درندے کے ساتھ
زندگی گزار رہی ہوں۔ وہ درندہ جس نے میرے والد، میرے بھائیوں، بھابیوں اور ان کے
معصوم بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور اس سے پہلے بھی وہ نجانے کتنے بے گناہوں کا خون
اسی طرح بہا چکا ہے۔ میں نے کہا ہے ناں اسد! کہ یہ تمہاری کم سے کم سزا ہے کہ تم زندگی بھر
میری اور بچوں کی صورت کو ترستے رہو۔۔۔ میں نے کوشش کی تھی کہ تمہیں قدرے بہتر سزا
دے سکوں لیکن اپنی فطری کم ہمتی کی وجہ سے اس فیصلے پر عمل نہ کر سکی۔ میری الماری کی دراز میں
وہ زہر ابھی تک موجود ہے، جو کتے مارنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ میں اس زہر کو تم پر
استعمال نہ کر سکی لیکن اگر کبھی تمہیں اپنے "قابل فخر" ماضی پر بے تحاشا پیار آئے تو تم اس زہر کو
استعمال کر سکتے ہو۔ خط ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور۔۔۔ شاید تمہارے ذہن میں یہ سوال
ابھرے کہ تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جانے کے باوجود میں نے ڈیڑھ دو سال تک
کس بات کا انتظار کیا۔ میں نے دو سال تک ایک وہم کا تعاقب کیا۔ میں نے اس سچ کا انتظار
کیا جسے تمہارے ہونٹوں سے نکلنا تھا اور میرے کانوں تک پہنچنا تھا۔ میں دو سال تک تمہارے
ہونٹوں کی طرف دیکھتی رہی ہوں۔ تمہارے اندر سے ہونے والی کسی نیک آواز کا انتظار کرتی
رہی ہوں۔ تم نے جو کچھ کیا اسد وہ کسی طور قابل معافی نہیں تھا۔ نہ قانون کے لئے اور نہ
معاشرے کے لئے لیکن میں سچ کہتی ہوں اگر تم ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار میرے سامنے
اپنے گناہ کا اعتراف کر لیتے اور آئندہ زندگی میں اپنے ماضی کی طرف مڑ کر نہ دیکھنے کا وعدہ کر
لیتے تو میں اپنے دل پر بھاری پتھر رکھ کر اور اپنے سارے آنسو پی کر، اپنی حد تک تمہیں معاف
کر دیتی۔ اس آس پر جی لیتی کہ شاید میری اس معافی سے ایک نئی زندگی کی شروعات ہو سکے،
لیکن میرا انتظار رائیگاں گیا۔ دو سال کے طویل انتظار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچ گئی ہوں کہ
میں ایک ایسے منافق بہروپیے کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں جو کسی بھی وقت اپنے فریب کی
چادر اتار کر اپنے اصلی وحشی روپ میں واپس آ سکتا ہے۔ لہٰذا آج میں اور میرے بچے تمہیں
ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہے ہیں۔"

☆☆☆

اگلے پانچ برس اسد نے جس طرح گزارے وہ کچھ اسے ہی معلوم تھا۔ ان پانچ برسوں کا ایک ایک پل وہ ایک سولی پر لٹکا رہا تھا۔ اس نے عنبرین اور اپنے بچوں کو تلاش کرنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو اسکے اختیار میں تھا بلکہ شاید وہ بھی جو اس کے اختیار سے بڑھ کر تھا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ ایک سابقہ مجرم ہے اور قانون کی گرفت میں آ سکتا ہے۔ اس نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں کی خاک چھانی۔ گنجان ترین علاقوں سے لے کر غیر آباد ترین جگہوں تک کا سفر کیا۔ جہاں کہیں سے اسے عنبرین اور بچوں کے بارے میں کوئی کھوج ملنے کی توقع تھی وہ وہاں تک پہنچا اور اپنے مقصد کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، کبھی گرجا کبھی برسا، کبھی بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیا، لیکن وہ تو یوں گئی تھی کہ کہیں نشان تک نہیں چھوڑا تھا۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ تلاش کرنے والے کے ہاتھ کتنے بھی لمبے ہوں وہ کسی کی تلاش میں پوری دنیا کو نہیں کھنگال سکتا۔ آخر ایک روز اسد کی ساری امیدیں دم توڑ گئیں اور حوصلہ کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔ اس نے خود سے مخاطب ہو کر کہا ''اسد! عنبرین کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے خود کو قانون کے حوالے کر دو اور پھانسی کا پھندا چوم کر ہجر کے اس ناقابل برداشت عذاب سے چھٹکارا پالو''

لیکن پھر اسے یہ حوصلہ نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا قانون کے چکروں میں الجھ کر اسے کئی ماہ بلکہ شاید کئی برس تک زندہ رہنا پڑے گا اور زندگی اب اس کے لئے قطعی ناقابل قبول تھی۔ ایسے میں اسے عنبرین کا وہ آخری تحفہ یاد آیا۔ وہی زہر جو عنبرین نے اسے دینا چاہا تھا اور جو اس کی الماری میں رکھا رہ گیا تھا۔ یہ زہر ابھی تک اسد کے پاس محفوظ تھا۔

وہ گرمیوں کی ایک نکھری ہوئی شام تھی۔ ایسی ہی شاموں میں وہ اور عنبرین گھر کی بالکونی میں آرام کرسیوں پر بیٹھتے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر دور سرسبز ڈھلوانوں کو دیکھا کرتے تھے۔ وہ آج بھی بالکونی میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے بید کی بنی ہوئی خوب صورت میز پر ایک فریم شدہ تصویر رکھی تھی۔ یہ اس کی محبوب بیوی اور تینوں بچوں کا گروپ فوٹو تھا۔ وہ کچھ دیر تک اشک بار نظروں سے اس تصویر کو دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹوں سے کراہتی ہوئی آواز نکلی ''عنبرین! میں جب تمہارا ''وقت جدائی'' یاد کرتا ہوں تو خود کو دنیا کا بدقسمت ترین انسان سمجھنے لگتا ہوں۔ یہ بدقسمتی کی انتہا نہیں تو کیا ہے کہ جس وقت میں نے تم سے سچ بولنے کا

فیصلہ کیا، عین اسی وقت تم نے مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں، جس شام تمہاری آرزو کے عین مطابق، اپنا سچ لے کر تمہارے پاس آیا، اسی شام تم مجھے ''سزائے موت'' دے کر ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہو گئیں۔ کاش میں نے سچ بولنے میں یہ تاخیر نہ کی ہوتی ۔۔۔۔ یا کاش تم نے سزا دینے میں تھوڑی سی اور تاخیر کی ہوتی۔ آج پانچ برس بعد بدقسمتی کے شدید احساس کے ساتھ میں اس دنیا سے جا رہا ہوں۔''

اس نے آخری بار فریم شدہ تصویر کی طرف دیکھا، ایک سسکی لی اور زہر پھانک لیا۔ اگلی صبح خودکشی کی خبر کے ساتھ اس کی تصویر اخبار میں موجود تھی۔

☆

مختار

عثمان بھائی روزنامہ ''صبح'' کے دفتر میں داخل ہوئے تو دہلیز پر ٹھوکر لگنے سے ذرا سا لڑکھڑا گئے۔عنایت اللہ صاحب سمجھ گئے کہ وہ کوئی خاص آرٹیکل لے کر آئے ہیں یا آنے والے ہیں۔عنایت اللہ صاحب پچھلے تیس برس سے روزنامہ صبح کے چیف ایڈیٹر تھے اور عثمان بھائی تیس برس سے میگزین کے شعبے سے منسلک تھے۔انہوں نے پروف ریڈر سے کام کا آغاز کیا تھا اور اب سنڈے میگزین کے مدیر تھے۔عثمان بھائی کی شہرت ان آرٹیکلز کی وجہ سے ہوئی تھی جو بڑی باقاعدگی کے ساتھ سنڈے میگزین میں شائع ہوتے رہتے تھے۔یہ آرٹیکلز معاشرے کی سچی کہانیوں اور ہمارے آس پاس پھیلی تلخ حقیقتوں کے عکاس ہوتے تھے۔

عنایت اللہ صاحب نے کہا''خیریت ہے عثمان بھائی۔کوئی خاص چیز ہاتھ لگی ہے؟''

''ہاں خاص ہی سمجھیں''عثمان بھائی نے موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے سے عنایت صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا''ایک لڑکے کی کہانی ہے۔سلطان نام ہے اس کا،راوی روڈ پر رہتا ہے۔آج میں نے دو تین گھنٹے اس کے ساتھ لگائے ہیں۔تھوڑا سا کام رہ گیا ہے کل ہو جائے گا۔میرا خیال ہے کہ اگلے ہفتے ہم یہ آرٹیکل چھاپ سکیں گے۔''

''خاص بات کیا ہے اس میں عثمان بھائی؟''ایڈیٹر عنایت صاحب نے پوچھا۔

''خاص بات یہ ہے عنایت صاحب کہ اس کہانی نے مجھے آج سے بیس سال پہلے کی ایک اور کہانی یاد دلا دی ہے۔مجھے آج تک یاد ہے۔میرا خیال ہے کہ اپریل اکیاسی کے کسی شمارے میں چھپی تھی وہ کہانی۔۔۔۔۔مختار یا شاید افتخار نامی کوئی لڑکا تھا۔جس کی شادی کا معاملہ تھا اور وہ نوکری کے لئے دھکے کھا رہا تھا۔اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی تھی۔۔۔۔۔چھلانگ

نے کے لئے مینار پاکستان پر چڑھ گیا تھا۔''

''ہاں، مجھے یاد آ رہا ہے۔۔۔ایک دو تصویریں بھی دی تھیں آپ نے۔۔۔۔۔کافی ر کیا گیا تھا وہ آرٹیکل، کئی ماہ ڈاک آتی رہی تھی۔پھر کچھ عرصے بعد شاید اس لڑکے کو نوکری ل گئی تھی۔''

''ہاں اسی آرٹیکل کی بات کر رہا ہوں۔۔۔۔۔یہ موجودہ آرٹیکل بھی اس سے ملتا جلتا ہے شاید اس میں حالات زیادہ تلخ اور بے رحم نظر آتے ہیں۔زمانہ بدل گیا ہے لیکن مسائل نہیں لے اور نہ ہمارے معیار بدلے ہیں۔یوں لگتا ہے جیسے رات دن دوڑنے کے باوجود ہم اُسی اُسی جگہ کھڑے ہیں۔۔۔۔''

کچھ دیر تک حالات حاضرہ اور زندگی کے مسائل پر کڑھنے کے بعد عثمانی بھائی واپس چلے ۔عنایت صاحب اپنے ائیرکنڈیشنڈ دفتر میں تنہا رہ گئے۔دفتر میں چھوٹے بڑے سب عثمانی حب کو عثمانی بھائی ہی کہتے تھے۔یہاں تک کہ عنایت صاحب خود بھی۔۔۔۔۔یوں بھی ن بھائی عنایت صاحب سے عمر میں آٹھ دس سال بڑے ہی ہوں گے، یعنی وہ ستر کے لگ ۔تھے۔۔۔۔۔عثمانی بھائی ٹھنڈے مزاج کے دھیمے شخص تھے۔جذباتی کم ہی ہوتے ،اور جب جذباتی ہوتے تھے تو عنایت صاحب کو خود بخود معلوم ہو جاتا تھا کہ ان کے پاس ے یا بتانے کو کوئی خاص چیز ہے۔

اس وقت بھی عنایت صاحب کو کچھ ایسا ہی لگا تھا۔انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ کل جو آرٹیکل نڈے میگزین کے لئے لائیں گے وہ زبردست نہ بھی ہوا تو بھی ٹھیک ٹھاک ضرور ہو گا۔ ن بھائی کے جانے کے بعد عنایت صاحب کا دھیان آپوں آپ اس بیس سال پرانے فیچر کی ے چلا گیا تھا جو بقول عثمانی بھائی اپریل اکیاسی میں شائع ہوا تھا۔عنایت صاحب اس فیچر کو بھولے نہیں تھے۔ریکارڈ روم، دفتر سے منسلک تھا۔وہاں تمام فائلیں ترتیب سے رکھی ں۔عنایت صاحب یونہی ٹہلتے ہوئے اٹھے اور ریکارڈ روم میں چلے گئے۔کچھ ہی دیر بعد وہ یز پر بیٹھے اپریل اکیاسی کی فائل دیکھ رہے تھے۔مختار نامی نوجوان کا فیچر موجود تھا۔

یہ نوجوان لاہور کا رہنے والا تھا۔اس کے پڑوس میں نادیہ نامی ایک لڑکی رہتی تھی۔دونوں دوسرے کو پسند کرنے لگے۔یہ پسندیدگی دونوں کے والدین کی نظروں سے بھی اوجھل نہیں

تھی۔ ماہ وسال کی بھٹی میں پک کر محبت کے رنگ پختہ ہو گئے۔ مختار اور نادیہ ایک دوسرے کے
بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اور جب ایک دوسرے کے بغیر جینا محال نظر آئے تو
ایک طرح کا خوف بھی دلوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ بچھڑنے کا خوف۔۔۔۔۔ اگر ہم مل
سکے تو کیا ہوگا؟ اگر راہوں میں کوئی ناقابل عبور دیوار کھڑی ہو گئی تو کیا کریں گے۔۔۔۔ مختا
اور نادیہ کے دل بھی ایسے اندیشوں سے کانپ جایا کرتے تھے۔۔۔۔۔۔ مختار کا سب سے
مسئلہ روزگار تھا۔ وہ بہن بھائیوں میں بڑا تھا اور اس کی ذمے داری بھی زیادہ تھی۔ والد سرکا
ملازم تھے اور ان کی تنخواہ سے بمشکل گھر کی گزر بسر ہوتی تھی۔ ایم اے کے بعد مختار بے روزگ
تھا اور نوکری کی تلاش میں دفاتر کے چکر لگانا اس کا لگا بندھا معمول تھا۔

مختار اور نادیہ کو صاف نظر آ رہا تھا کہ وقت ان کے خلاف جا رہا ہے۔ نادیہ کے والد
سخت گیر تھے۔ انہوں نے مختار کے والدین سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر چار چھ ماہ کے اندر ا
کے بیٹے کو مناسب نوکری مل گئی تو ٹھیک ہے ورنہ وہ بیٹی کا رشتہ کہیں اور کرنے پر مجبور ہو جا
گے، اور وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ مختار کے برسر روزگار ہونے کے انتظار میں وہ جوان بیٹی
کب تک گھر میں بٹھائے رکھتے۔ ابھی تو اس کے لئے اچھے رشتے بھی مل رہے تھے۔ ایک
سال بعد اس کی شادی مسئلہ بن جاتی۔

نادیہ کے والد کی طرف سے آخری وارننگ موصول ہونے کے بعد مختار کی جدوجہد
اور تیزی ہو گئی۔ بالکل جیسے کسی تھکے ہارے گھوڑے کی پشت پر چابک پڑے اور وہ پھر سے
بھاگنا شروع کر دے۔ اس نے بہت سڑکیں ناپیں۔۔۔۔۔۔ بہت سیڑھیاں چڑھیں، دفاتر
سنگلاخ دیواروں سے بہت سر پٹخا لیکن کچھ بن نہیں پڑا۔ لیکن اب تو اس کے پاس ستانے
وقت بھی نہیں تھا۔ وہ گرتا پڑتا بھاگتا ہی رہا۔ دیوانوں کی طرح ان دروازوں پر دستک دیتا رہا،
جہاں سے اسے اپنے خون پسینے کے بدلے کچھ روپے مل سکتے تھے۔ وہ روپے جن کے ساتھ ا
کی محبت کی کامیابی یا ناکامی مشروط کر دی گئی تھی۔ اور پھر وہ دن آیا جب مختار (جو صرف نام
مختار تھا) بے اختیاری اور بے بسی کی انتہا کو پہنچ گیا۔ اس کی محبت کئی مراحل طے کرنے کے بع
آخری سنگ میل تک پہنچ گئی تھی جہاں سے جدائی کا موڑ شروع ہوتا ہے اور جان سے پیار۔
لوگ ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ نادیہ کے والدین کی طرف سے مختا

جو مہلت دی گئی تھی اس کے آخری دن تھے۔ مختار جانتا تھا صرف تین روز بعد نادیہ اپنے
والدین کے ساتھ کوئٹہ چلی جائے گی، وہیں پر اس کی شادی ہو جانا تھی۔۔۔۔ ان کی جدائی کے
بیچ میں صرف دو دن تھے اور مختار ایک پرائیویٹ کمپنی ڈان ٹیکسٹائل کے دفتر میں اس کے مالک
کے سامنے سسکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔ وہ یہاں ایک ''جاب'' کے انٹرویو کے لئے آیا تھا اور
حسب معمول رد کر دیا گیا تھا۔ وہ واپس جانے کے لئے اٹھا تھا مگر اچانک نجانے اسے کیا ہوا تھا
وہ رو پڑا تھا اور نڈھال ہو کر واپس کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اسے روتے دیکھ کر مالک گھبرا گیا تھا۔ اس
نے چپراسی سے پانی لانے کو کہا تھا اور بعد ازاں رسمی انداز میں مختار کو تسلی دینا چاہی تھی۔۔۔۔
مختار سسکیاں لیتے ہوئے بولا، سر! میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہر انسان زندگی میں کم از کم ایک
بار محبت ضرور کرتا ہے، میرا دل کہتا ہے کہ آپ نے۔۔۔۔۔۔ بھی محبت کی ہوگی۔ اور اگر ایسا
ہوا ہے تو پھر آپ محبت کی اہمیت کو سمجھتے بھی ہوں گے۔۔۔۔۔ سر مجھ پر رحم کیجئے۔۔۔۔۔ یہ
نوکری مجھے بخش دیجئے۔ میں ایک محبت کا مارا ہوں۔ میری محبت مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھینی
جا رہی ہے اور میرا قصور یہ ہے کہ میں بے روزگار ہوں۔ جس لڑکی کو میں چاہتا ہوں، چند دن
بعد اس کی شادی ہو جائے گی۔ میں جیتے جی مر جاؤں گا سر۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں اس جاب
کا اہل ہوں۔ مجھے یہ نوکری دے دیں۔۔۔۔۔۔ میں ساری زندگی آپ کے پاؤں دھو دھو کر
پیوں گا۔

مالک ایک غیر جذباتی اور خالص کاروباری شخص تھا۔ مختار کے عجیب و غریب انداز نے
اسے متاثر تو کیا تھا لیکن ایسی بات بھی نہیں تھی کہ وہ فوراً اپنا فیصلہ بدل لیتا۔ اس نے قدرے نرم
لہجے میں کہا ''دیکھو مسٹر مختار! تم نے اپنی ایک ضرورت بیان کی ہے۔ یقیناً وہ ایک اہم
ضرورت ہے لیکن یہاں جتنے امیدوار بھی آئے ہیں سب ایسی ہی ضرورتوں کے جال میں
جکڑے ہوئے ہیں۔ اس جال سے نکلنے کے لئے کوشش اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہوتی
ہے، تم بھی''۔۔۔۔

''خدا کے لئے جناب!'' مختار نے بے اختیار اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ میں آپ کی خصوصی
توجہ کا مستحق ہوں۔ میں کم ہمت نہیں ہوں جناب، ہزار سال تک جدوجہد کرنے کے لئے تیار
ہوں لیکن میرے پاس مہلت نہیں ہے جناب۔۔۔۔ آج جب میں آپ کے اس آفس سے

خالی ہاتھ نکلوں گا تو میرا سب کچھ لٹ چکا ہوگا۔۔۔۔ میں اپنے طرز تخاطب کی معافی چاہتا ہوں سر! لیکن اگر آپ نے زندگی میں کسی کو میری طرح چاہا ہے تو آپ کو اس محبت کا واسطہ مجھے یہ نوکری دے دیجئے۔ میں بہت مجبور ہوں سر۔

اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگا۔ وسیع میز کے عقب میں بیٹھا ہوا ادھیڑ عمر شخص بڑے اطمینان لیکن تعجب سے اس انوکھے امیدوار کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے زندگی میں بے شمار انٹرویو کیے تھے لیکن ایسا انٹرویو کبھی نہیں کیا تھا اور نہ کسی نے دیا تھا ۔۔۔۔ بہرحال وہ ایک تجربہ کار کاروباری شخص تھا۔ کاروبار کا پہلا اصول ہی یہی ہوتا ہے کہ جذبات میں نہ بہا جائے وہ مذکورہ نوکری تھوڑی دیر پہلے اپنے بینکار کے بھیجے ہوئے امیدوار کو دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ نتیجتاً تھوڑی دیر بعد مختار کو اس آفس سے خالی ہاتھوں اور بھری آنکھوں کے ساتھ نکلنا پڑا۔ اسی شام مختار نے مینار پاکستان سے کود کر اپنی جان لینے کی "مخلصانہ" کوشش کی تھی۔ اس وقت مینار کے سائے میں ایک سیاسی جلسہ ہو رہا تھا۔ پُرجوش مقرر اپنی حکومت کی کامرانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے منہ سے جھاگ اڑا رہا تھا۔ وطنِ عزیز سے ناانصافی، لاقانونیت اور بے روزگاری دور کرنے کے بلند و بانگ دعوے کر رہا تھا۔ ان کے دعووں کو یکسر جھٹلاتے ہوئے مختار نے مینار پاکستان سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی تھی۔ اتفاقاً ایک باہمت شخص نے عین موقع پر مختار کا ارادہ تاڑ لیا۔ اس سے پہلے کہ مختار کا جسم مینار سے علیحدہ ہو کر ہوا میں معلق ہوتا اس نے اسے عقب سے دبوچ لیا۔

مختار کی زندگی تو بچ گئی مگر اس کی محبت نہیں بچ سکی۔ ہونی بالآخر ہو کر رہی۔ چند روز بعد نادیہ اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر کوئٹہ چلی گئی اور پھر وہیں پر اس کی شادی کر دی گئی۔ جس روز نادیہ کی شادی ہوئی، اس روز مختار ایک مقامی اسپتال میں نیم بے ہوش پڑا تھا۔ وہ سخت بیمار تھا اور اس پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ اس کی دکھیاری ماں اپنے بدنصیب بیٹے کا سر گود میں لیے بیٹھی رہتی تھی اور اپنے آنسوؤں سے اس کا چہرہ دھوتی رہتی تھی۔

یہ پوری روداد پڑھنے کے بعد عنایت صاحب گم صم بیٹھ گئے۔ یہ عام کہانی ہوتی تو شاید دل پر اتنا اثر نہ کرتی لیکن یہ ٹھوس حقیقت تھی اس لئے دل و دماغ میں سرایت کر جاتی تھی۔ اس کی تفصیلات میں بہت گداز اور غمناکی تھی۔ خاص طور سے مختار کے دفاتر میں دربدر بھٹکنے کے

ظر اور وہ منظر جب وہ رسمی انٹرویو دیتے ہوئے ایک دم اشک بار ہو جاتا ہے اور بچوں کی رح بلک بلک کر رونے لگتا ہے۔

☆☆☆

عثمانی بھائی حسب وعدہ دوسرے روز وہ تازہ کہانی بھی لے آئے جوان کے بقول بیس ل پہلے والی کہانی کا پرتو تھی۔ اس فیچر کی سرخی اور ذیلی سرخیاں عثمانی بھائی نے خود ہی نکال لی ہیں، اس کے علاوہ جو ایک دو اسکیچ وہ دینا چاہتے تھے ان کی تفصیل بھی موجود تھی۔ عثمانی بھائی ے جانے کے بعد عنایت صاحب نے یہ روداد پڑھنی شروع کی۔ یہ بھی ایک رومانی کہانی تھی۔ ب نوجوان اپنی محبت کو دم بہ دم جدائی کے پھانسی کے گھاٹ کی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا اور سے بچانے کے لئے دیوانوں کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا۔ خوف کا چابک تھا جو اسے تیز رفتار نت کے ساتھ بگٹٹ بھاگنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس روداد میں لڑکے کا نام سلطان اور لڑکی کا رابعہ ا۔ دونوں کا تعلق دیہی علاقے سے تھا۔ وہ مرید کے کے مضافاتی علاقے کے رہنے والے ھے۔ آپس میں دور کے رشتے دار بھی تھے اور ایک دوجے سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ لڑکپن ں ہی ان کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا مگر پھر اچانک ان کے درمیان جدائی ی دیوار بلند ہونا شروع ہوگئی۔ رابعہ کی والدہ جگر کی مہلک بیماری کا شکار ہو گئیں۔ رابعہ کا باپ مراج دین ایک معمولی کاشت کار تھا۔ دو تین ماہ کے اندر اس کی جمع پونجی بیوی کے علاج پر لگ ئی۔ گھر میں فاقوں کی نوبت آئی تو معراج دین نے مقامی ساہوکار سے قرضہ لینا شروع کر یا۔ ادھر رابعہ کی ماں کی بیماری بڑھتی گئی ادھر معراج دین کا قرضہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا ل بال قرضے میں جکڑا گیا۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد اس کی نیک، خوبرو بیوی بچ جاتی تو ت تھی لیکن ایک دن اس نے بھی معراج دین اور رابعہ کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔ معراج دین ی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ بیوی کے دکھوں نے خود اس کو بھی بیمار کر دیا تھا۔ وہ کسی کام کاج کے قابل میں رہا تھا۔ کوئی جوان بیٹا بھی نہیں تھا جو اس کا سہارا بن سکتا۔ رابعہ سے چھوٹے دو بیٹے تھے ر دونوں کی عمر اسکول جانے کی تھی۔ یہ حالات تھے جن میں ساہوکار نے اپنی رقم کی واپسی کا طالبہ شروع کر دیا۔ معراج دین کے پاس دینے کو کچھ نہیں تھا مگر ساہوکار جانتا تھا کہ اس کے س دینے کو بہت کچھ ہے۔ اس کی نگاہ اونچی لمبی خوبرو رابعہ پر تھی۔ وہ اپنے نیم پاگل بیٹے کے

لئے اس کا رشتہ چاہ رہا تھا۔ یہ ایک بالکل بے جوڑ رشتہ تھا لیکن دولت کے بلڈوزر سے ناہمواری کو ہموار کیا جا سکتا ہے۔ دولت کی طاقت سے سمندر پاٹے جا سکتے ہیں اور پہاڑ پیوندِ خاک کر دیے جاتے ہیں۔ ساہوکار کا بیٹا ابرار عرف شکرا بھی کسی بلڈوزر سے کم نہیں تھا۔ اونچا لمبا اور فربہ جسم کا یہ لڑکا مست حال ہونے کے علاوہ بہت غصیلا بھی تھا۔ گالیاں بکنے پر آتا تو زمین آسمان ایک کر دیتا تھا۔ سارا دن کنوئیں کے پاس ایک برگد تلے چارپائی ڈال کر بیٹھا رہتا تھا اور لڑکیوں کو گھورتا تھا۔ کمینگی اس کی آنکھوں میں اتنی نمایاں ہوتی تھی کہ دور ہی سے لشکارے مارتی نظر آتی تھی۔ شاید اسی لئے اس کا نام شکرا پڑ گیا تھا۔ ورنہ شکرا ایسا بے ڈول اور غبی تو نہیں ہوتا۔

ایک رات گاؤں کے نواحی باغ میں ہونے والی ملاقات میں رابعہ نے روتے ہوئے سلطان کو سب کچھ بتا دیا۔ اس نے کہا، سلطان! میرے ابے پر ہزاروں روپے کا قرضہ ہے، اگر چند مہینے تک یہ قرضہ ادا نہ ہوا تو میرا ابا مجبوراً میرا ہاتھ ساہوکار کے بیٹے کے ہاتھ میں دے دے گا۔

''اس دن سلطان کے دل پر ایک بہت بڑا بوجھ پڑ گیا تھا۔ اس کے اپنے گھر کی مالی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ گاؤں سے باہر اس کے والد کی دکان تھی۔ وہاں بلڈنگ میٹریل اینٹ ریت سیمنٹ وغیرہ فروخت ہوتا تھا۔ پہلے تو دال روٹی چل رہی تھی مگر اب مقابلے میں دو تین دکانیں اور کھل گئی تھیں لہٰذا گزر بسر مشکل ہو گئی تھی۔ ایک چھوٹی سی دیہاتی دکان بارہ افراد پر مشتمل کنبے کا پیٹ کیسے پال سکتی تھی۔ سلطان نے بی اے کر رکھا تھا مگر بے روزگار تھا۔ اس روز رابعہ کی باتیں سن کر اسے لگا کہ اگر وہ جلد ہی اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا تو رابعہ اس کی زندگی سے بہت دور چلی جائے گی۔ اسے ہر صورت ملازمت کی ضرورت تھی۔ ایک ایسی ملازمت جس کی تنخواہ سے وہ نہ صرف اپنا خرچا نکال سکے بلکہ کچھ پس انداز بھی کر سکے۔ اگر وہ چار چھ مہینے میں کچھ رقم جمع کر لیتا تو چچا معراج دین کا قرض چکانے میں ان کی مدد کر سکتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ یہ مدد قبول کر لیں گے۔

سلطان فطرتاً شرمیلا اور کم گو تھا۔ ملازمت کی تلاش میں دفاتر کے چکر لگانے اور انٹرویوز دینے سے اسے خوف آتا تھا، مگر اب صورت حال کچھ اور طرح کی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا

جیسے کسی نے اسے گہرے پانی میں دھکا دے دیا ہے اور اب اسے ہر صورت ہاتھ پاؤں مار کر خود کو بچانا ہے۔ وہ کمر ہمت باندھ کر لاہور چلا گیا اور نوکری کے لئے دھکے کھانے شروع کر دیے۔ یہ بے چہرہ لوگوں کا جنگل تھا۔ یہاں کوئی شناسا تھا اور نہ اجنبی۔ یہاں چہروں کے خدوخال، دولت، سفارش اور حیثیت سے ابھرتے تھے اور نمایاں ہوتے تھے یہی چیزیں انسانوں کی پہچان تھیں۔ سلطان نے لاہور آ کر پچھلے چند ماہ میں بڑی کوشش کی۔ بڑی اذیت اور ذلت اٹھائی، لیکن کچھ حاصل نہیں کر سکا۔ اس کے پاس فروخت کرنے کو سچا سودا تھا، یعنی اس کا خون پسینہ لیکن یہاں سودا نہیں سودا فروخت کرنے والا دیکھا جاتا تھا اور سلطان کو کوئی بھلا کیا دیکھتا۔ وہ تو بے چہرہ شخص تھا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور سلطان کے خلاف گزر رہا تھا۔ وہی سنگلاخ سیڑھیاں وہی پتھریلی دیواریں، وہی ''نو ویکنسی'' کے بے رحم بورڈز۔ یہ وہی سفاک پیچ و خم تھے جن سے کبھی اختار گزرا تھا۔ آج ان میں سے سلطان گزر رہا تھا۔ نجانے کتنے مختار اور سلطان ان پیچ و خم سے گزر چکے ہیں، اپنی سہمی ہوئی امنگوں کو سینے سے لگائے برہنہ پا ان کانٹوں پہ بھاگ چکے ہیں ۔۔۔۔ اور بھاگتے رہیں گے۔

مسلسل بھاگ دوڑ نے سلطان کو بیمار کر دیا تھا۔ وہ کچھ دن ستانے کے لئے گاؤں چلا گیا۔ رابعہ سے ایک دو ڈری ڈری ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ وہ بہت مایوس تھی۔ اس ہرنی کی طرح سکتہ زدہ تھی جس نے خودرو جھاڑیوں کے عقب سے درندے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ لیا ہو۔ اس کی حسین آنکھوں کی ویرانی دیکھ کر سلطان کی بے قراری کو پر لگ گئے۔ ستانے کا خیال دل سے نکال کر وہ پھر گاؤں سے بھاگ نکلا۔ اس مرتبہ وہ لاہور جانے کے بجائے مرید کے چلا گیا۔ یہ بھی کافی بڑا قصبہ تھا۔ وہ روزگار کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔ ایک دن اسے اخبار سے معلوم ہوا کہ ایک مقامی دفتر میں کلرک کی دو آسامیاں خالی ہیں۔ وہ قسمت آزمانے پہنچ گیا۔ مالک ایک ادھیڑ عمر فربہ اندام شخص تھا اور اپنے مینجر کے تعاون سے خود ہی انٹرویو کر رہا تھا۔ انٹرویو کے دوران میں جب فرم کے مالک ''شیخ میاں صاحب'' سلطان سے اس کے گھریلو حالات کے متعلق پوچھ رہے تھے، ایک دم نجانے سلطان کو کیا ہوا کہ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے آنکھیں پھیلا کر آنسوؤں کو روکنا چاہا لیکن الٹا اثر ہوا۔ آنسو مزید تیزی سے امڈے اور پھر جیسے

یک دم سلطان کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کے باوجود رو پڑ
آنسو ندی دھاروں کی طرح بہے اور ہچکیوں سے اس کا وجود لرز گیا۔

چند منٹ بعد وہ بڑی کوشش سے خود کو سنبھال سکا تھا۔ انٹرویو کا سلسلہ ایک بار پھر و
سے شروع ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ مینجر نے پوچھا ''ہاں تو تم بتا رہے تھے کہ تمہاری منگنی ہو
ہے اور شادی ہونے والی ہے۔''

''ہونے والی نہیں ہے جناب، ہونے والی تھی''۔ سلطان نے گلوگیر آواز میں کہا پھر ا
نے اپنی اور رابعہ کی ساری بپتا دونوں حضرات کے گوش گزار کر دی۔ یہ نجی باتیں انٹرویو کے عمو
سوالات سے بالکل ہٹ کر تھیں لیکن وہاں ماحول ہی کچھ ایسا بن گیا تھا کہ سلطان کو یہ با
کہتے ہوئے عجیب نہیں لگا۔ فرم کے مالک سیٹھ میاں بڑے دھیان سے اس کی باتیں
رہے۔ گاہے گاہے انہوں نے سوالات بھی کیے۔ ان کی توجہ نے سلطان کو ایک بار پھر اشک
کر دیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔'' جناب! آپ مجھے یہ نوکری دے دیں۔ میں آپ
توقع سے بڑھ کر خدمت کروں گا۔ پلیز مجھے مایوس نہ لوٹائیں۔۔۔ میں۔۔۔ یہ نوکری ہار
تو اپنی۔۔۔ منگیتر سمیت سب کچھ ہار جاؤں گا۔ اور میں۔۔۔ اور میں اس کے بغیر۔۔۔
کوشش کے باوجود وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

سیٹھ میاں کچھ دیر گہری نظروں سے اسے دیکھتے رہے، پھر انہوں نے ٹھہرے ہوئے ل
میں کہا ''دیکھو مسٹر سلطان! تم جس خالی آسامی کے انٹرویو کے لئے آئے ہو، اس کے لئے
سے بہتر امیدوار موجود ہیں۔ لہٰذا یہ بات تو کلیئر ہے کہ یہ نوکری تمہیں نہیں مل سکتی۔ بہر حا
میں تمہارے بارے میں کچھ سوچوں گا۔ تم ایک ہفتہ بعد میرے اسسٹنٹ سے رابطہ کرنا۔
مایوسی اور امید کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سلطان آفس سے باہر آ گیا تھا۔

☆☆☆

ٹھیک ایک ہفتے بعد سلطان نے دوبارہ آفس سے رابطہ کیا تو پتا چلا کہ سیٹھ صاحب ک
کام سے کراچی گئے ہوئے ہیں اور دس دن بعد لوٹیں گے۔

کٹھن انتظار کے دس دن مزید گزارنے کے بعد سیٹھ صاحب سے سلطان کا رابطہ ہو گیا
اسے تقریباً دو گھنٹے آفس سے باہر بیٹھ کر ملاقات کا انتظار کرنا پڑا۔ آخر ملاقات ہوئی، سیٹھ

صاحب کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے سلطان کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا ''بھئی! میں نے تم سے کہا تو تھا لیکن کوئی بات بن نہیں سکی۔''

سلطان کے اندر کوئی شے چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ اس کا جسم مایوسی کی شدت سے ہولے ہولے لرزنے لگا۔ اسے پتا تھا کہ اس کی صورت قابل رحم نظر آ رہی ہے۔ سیٹھ میاں نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہا ''ایک صورت ہو سکتی ہے۔ یہاں سے چند میل دور نہر کے بڑے پل پر میری فیکٹری ہے۔ وہاں گارمنٹس کا کام ہوتا ہے ''سیٹھ میاں گارمنٹس'' کا نام شاید تم نے سنا ہی ہو گا۔''؟

سلطان نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی جناب۔ ہمارے گاؤں سے ڈیڑھ دو میل ہی دور ہے یہ جگہ۔''

سیٹھ صاحب نے سگار کا کونا چبا کر کہا '' وہاں سلائی کرنے والی دو عورتوں کی جگہ خالی ہے۔ اگر تمہاری منگیتر یہ جاب کرنا چاہے اور اس کے والدین بھی راضی ہوں تو اسے یہ جاب مل سکتی ہے۔''

''لل لیکن۔۔۔'' سلطان نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر پھر خاموش ہو گیا۔

کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر تھا۔ ممکن تھا کہ چچا معراج، رابعہ کو اس کام کی اجازت دے دیتا۔ سیٹھ صاحب مہربان نظر آ رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ معاوضہ بھی کچھ بہتر ہی دیتے۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' سیٹھ صاحب نے پوچھا۔

''مم۔۔۔ میں جناب! کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں۔۔۔ رابعہ کے والد سے پوچھ لیتا ہوں۔''

''بھئی تنخواہ اچھی ہو گی، اس کے علاوہ فیکٹری کی وین پر عورتوں کو لانے لے جانے کا انتظام بھی موجود ہے۔ غالباً تمہارے ساتھ والے گاؤں شاہ پور سے بھی دو تین لڑکیاں آتی ہیں۔''

''آپ کا بہت شکریہ جناب، میں آج ہی رابعہ کے والد سے بات کرتا ہوں'' سلطان نے کہا۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد رابعہ نے فیکٹری جانا شروع کر دیا۔ عام طور پر ابتدا میں خواتین کو پندرہ سو روپے ماہوار ملتے تھے لیکن رابعہ کی تنخواہ اٹھارہ سو روپے مقرر ہوئی وہ بڑی لگن سے اپنا کام کرنے لگی۔ دوسری طرف سلطان نے بھی نوکری کی تلاش جاری رکھی۔ سیٹھ صاحب کی طرف سے اسے کافی امید تھی کہ وہ اس کے لئے کچھ نہ کچھ کریں گے۔

مگر پھر ایک دن اچانک سلطان کو اپنی والدہ سے پتا چلا کہ رابعہ نے فیکٹری جانا بند کر دیا ہے۔ اس نے رابعہ کے والد چچا معراج دین سے بات کرنا چاہی لیکن انہوں نے سلطان کو فوری طور پر نظروں سے دور ہو جانے کا حکم دیا۔ سلطان چکرا کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ دو دن بے خبری کا عذاب سہتا رہا۔ آخر بڑی کوشش سے وہ رابعہ سے ملاقات میں کامیاب ہوا۔ رات کے وقت گاؤں کے باغ میں وہ دونوں ملے۔ یہ سہمی سہمی ملاقات آنسوؤں سے تر تھی۔ رابعہ نے سلطان کو بتایا کہ سیٹھ کی مہربانیوں کے پیچھے کون سی سفاکی چھپی ہوئی تھی۔ فیکٹری کی عورتوں میں سیٹھ کی ایک ٹاؤٹ عورت موجود تھی۔ وہ رنگین مزاج سیٹھ اور اس کے ایک دوست کے لئے ان کے مطلب کی لڑکیاں پھانستی تھی۔ اس عورت نے بڑے محتاط انداز میں رابعہ پر بھی جال پھینکا لیکن وہ جال میں نہیں آئی۔ سیٹھ اس پر مزید شدت سے رال ٹپکانے لگا۔ چند دن پہلے ٹاؤٹ عورت رابعہ کو گھیر کر سیٹھ کے ریٹائرنگ روم میں لے گئی۔ جہاں سیٹھ نے پہلے اسے لالچ دیا پھر ڈرایا دھمکایا اور مطلب برآوری کی کوشش کی۔ اس نے رابعہ کو بتایا کہ وہ فیکٹری کے اندر چوری کے الزام میں حوالات چلی جائے گی۔ رابعہ کی قسمت اچھی تھی کہ ان نازک لمحات میں اتفاقاً کچھ مہمان سیٹھ سے ملنے آ گئے اور سیٹھ رابعہ کے ساتھ ''دست درازی'' سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ سب کچھ سن کر سلطان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

اگلے روز صبح سویرے سلطان نے سیٹھ کی کار کو اس وقت روکا جب وہ فیکٹری جا رہا تھا۔ سلطان، سیٹھ پر جھپٹا اور اسے چند مکے رسید کیے۔ مگر وہ اس سے آگے نہیں جا پایا۔ سیٹھ کا ڈرائیور نہ صرف مسلح تھا بلکہ خاصا گرانڈیل اور ہٹا کٹا شخص تھا۔ اس نے سلطان کو قابو کر لیا۔ اسی دوران میں مزید لوگ آ گئے اور انہوں نے سیٹھ کو بچا لیا۔ سلطان کے لباس سے ایک خنجر برآمد ہوا اور اسے حوالہ پولیس کر دیا گیا۔

دوسری طرف رابعہ کے والد کو ان واقعات سے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ اس نے رابعہ کی

شادی ساہوکار کے نیم پاگل بیٹے سے طے کر دی۔۔۔۔ صرف دو ہفتے پہلے اس کہانی کا انجام ہو گیا تھا۔ وہی اداس کر دینے والا ناپسندیدہ انجام جو پیار کی اکثر کہانیوں کا مقدر ہوتا ہے۔۔۔۔ دراز قد خوبرو رابعہ کی شادی ساہوکار کے بیٹے شکرے سے ہو گئی تھی۔ سلطان جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا اور اس شادی کی اطلاع اسے وہیں پر ملی تھی۔۔۔۔۔ وہ لاچار کیا کر سکتا تھا۔ سماج کی قید ہی کچھ کم نہیں تھی، اب تو وہ قانون کا قیدی بھی تھا۔

☆☆☆

ایڈیٹر عنایت صاحب نے سلطان اور رابعہ کی ساری روداد ایک ہی نشست میں پڑھ لی۔ واقعی اس دوسری کہانی میں پہلی کہانی کا پرتو موجود تھا۔ وہی جدائی کا خوف، وہی بے بسی اور وہی مخالفت میں گزرتا ہوا تیز رفتار وقت۔

عثمان بھائی کے فیچرز کی وجہ شہرت یہی تھی کہ ان کی کہانیاں سچی ہوتی تھیں اور اکثر اوقات اس سچ کے ٹھوس ثبوت بھی فراہم کیے جاتے تھے۔ گھریلو کہانیوں میں اکثر ٹھوس شواہد کو منظر عام پر لانا ممکن نہیں ہوتا تھا پھر بھی تھوڑی بہت تحقیق کر لیتے تھے اور اگر عثمانی صاحب سے کہانی کا کوئی گوشہ تشنہ رہ گیا ہو تو اسے مکمل کر لیتے تھے۔ اس کہانی کے حوالے سے بھی انہوں نے تھوڑی سی مزید تحقیق ضروری سمجھی۔ خاص طور سے فیکٹریوں میں کام کرنے والی عورتوں کے مسائل پر تھوڑی سی مزید روشنی ڈالنا ضروری تھی۔

اگلے روز عنایت صاحب نے عثمانی بھائی کو اسپیشل فون کر کے گھر بلایا۔ عثمانی بھائی آئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ عنایت صاحب تازہ فیچر کے حوالے سے ڈسکس کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال درست نکلا لیکن جو کچھ ڈسکس ہوا تو وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ عنایت صاحب نے کہا'' عثمانی بھائی آپ بڑی اچھی کہانی لائے ہیں۔۔۔ لیکن یہ کہانی مکمل نہیں تھی۔''

کیا مطلب؟ عثمانی بھائی نے موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے سے عنایت صاحب کو دیکھا۔

''مطلب یہ کہ کہانی کے ایک بہت اہم پہلو پر روشنی نہیں پڑ سکی تھی۔ اس پہلو پر روشنی پڑنے سے پتا چلا ہے عثمانی بھائی کہ ایسے سانحے کیوں رونما ہوتے ہیں۔ کیوں سالہا سال گزرنے کے باوجود ہماری بے بسی اور لاچاری ایک بھاری چٹان کی طرح ہمارے سینوں پر

ٹھہری ہوئی ہے۔ کیوں ہماری ہر نسل ایک ہی جیسے عذابوں سے دوچار ہو رہی ہے''۔ ایک لمحہ توقف کر کے عنایت صاحب نے سگریٹ سلگایا اور ڈرامائی لہجے میں بولے ''عثمانی بھائی! کیا آپ جانتے ہیں کہ ان دونوں کہانیوں میں ایک کردار مشترک تھا۔''؟

''مم۔۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔'' عثمانی بھائی ہکلائے ''آپ کس کردار کی بات کر رہے ہیں؟''

عنایت صاحب بولے ''عثمانی بھائی! اس فیچر کی تیاری کے دوران میں آپ گارمنٹ فیکٹری کے سیٹھ سے ملے تھے؟''

''ہاں۔ ایک مرتبہ ملاقات کی ہے۔''

''آپ اسے پہچان نہیں پائے عثمانی بھائی۔۔۔۔ اور شاید وہ بھی آپ کو پہچان نہیں پایا۔۔۔۔۔ یہ سیٹھ میاں۔۔۔ وہی بے بس اور لاچار نوجوان مختار ہے جو آج سے بیس سال پہلے ایک انٹرویو کے دوران میں ملازمت کے لیے بلک بلک کر رویا تھا۔۔۔۔۔ ہاں عثمانی بھائی! یہ وہی ہے۔ آج سے بیس سال پہلے وہ مظلوم تھا لیکن آج جب وہ واقعی ''مختار'' ہے وہ ظالم بن گیا ہے۔ اس سے زیادہ ''بے بس محبت'' کے درد کو اور کس نے سمجھنا تھا لیکن آج وہی سب سے زیادہ بے خبر ہے۔ یہ سانحہ نہیں تو اور کیا ہے، ہم جن حوالوں سے اپنی زندگی کی بدترین اذیتیں سہتے ہیں۔ جب خود ان حوالوں کے مالک بنتے ہیں تو دوسروں کے ساتھ وہی کچھ کرنے لگتے ہیں، جو ہمارے ساتھ ہوا تھا۔ وہ سارے ناپسندیدہ کردار ہمارے اندر اتر آتے ہیں۔ سنگدل ساس، سخت گیر باپ، لالچی سسر، بے رحم آجر، غیر منصف حاکم، غرض ہر قابل نفریں روپ ہم خود اپنا لیتے ہیں۔ اس سے بڑی ہماری بدقسمتی اور کیا ہوگی عثمانی بھائی۔''؟

عثمانی بھائی حیران اور چپ تھے۔ بس موٹے شیشوں کے عقب سے اپنے ایڈیٹر کو دیکھتے جا رہے تھے۔ کمرے کے اندر سوگوار خاموشی طاری ہو گئی تھی۔

☆

مکتوبِ اجل

میرا نام مقصود باری ہے۔ عمر قریباً 65 سال ہے۔ پچھلے چالیس سال سے انگلینڈ میں مقیم ہوں۔ لندن کے مضافات میں میرا ذاتی مکان ہے۔ اس مکان کی بالائی منزل پر ایک خوبصورت چوکور کمرا ہے۔ رات کے وقت اس کمرے کی کھڑکیوں سے آس پاس کا علاقہ یوں نظر آتا ہے جیسے کسی دوشیزہ کے سیاہ آنچل پر ہزار ہا ستارے چمک رہے ہوں۔ اپنے گھر کا یہ کمرہ مجھے بہت پسند ہے۔ یہ میرے عدنان کا کمرہ ہے۔ میرے بیٹے کا، اسی کمرے میں بیٹھ کر وہ شاعری کرتا تھا گیت لکھتا تھا، تصویریں بناتا تھا اور مطالعہ کرتا تھا۔ اس کمرے کی ہر شے میں عدنان کی مہک رچی بسی ہے۔ دیواروں میں اس کے قہقہے جذب ہیں، فرش میں اس کے قدموں کی چاپ ہے اور کھڑکیوں دروازوں پر اس کے ہاتھوں کا لمس چمک رہا ہے۔ اسے اس کمرے سے جدا ہوئے قریباً بیس برس گزر چکے ہیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ ابھی یہیں تھا۔ شاید کسی کام سے باہر نکل گیا ہے۔ میں کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوں اور اسی کرسی پر ہوں جس پر عدنان بیٹھا کرتا تھا۔ عدنان ہی کے انداز میں میں نے اپنی دونوں ٹانگیں اٹھا کر کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھی ہوئی ہیں اور سگریٹ پی رہا ہوں۔ میرا ذہن ماہ و سال کے فاصلے پھلانگ کر ماضی کے سمندر میں یادوں کے دھندلے جزیروں میں بھٹکنے لگا ہے۔

وہ سب کچھ نگاہوں کے سامنے آ رہا ہے جو مجھ پر بیت چکا ہے اور جس کی بخشی ہوئی جلن قبر تک میرے ساتھ جائے گی۔

تفصیل سے بیان کرنے لگوں تو شاید یہ ایک طویل کہانی بن جائے۔ میں مختصراً بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ جتنی دیر ان عذاب ناک یادوں کے نرغے میں رہوں گا، بے حال رہوں گا۔

میرا بیٹا عدنان چھ سات برس کا ہوگا جب مجھے یہ محسوس ہونا شروع ہوا کہ وہ شکل وصورت کے علاوہ عادات اور خصائل کے اعتبار سے بھی مجھ سے ملتا جلتا ہے۔ وہ تمام فطری دلچسپیاں جو چھ سات سال کی عمر میں میرے مزاج کا حصہ تھیں، میرے بیٹے میں بھی موجود تھیں۔ بالفاظِ دیگر وہ اپنے تمام نفسیاتی رویوں میں میری فوٹو کاپی تھا۔

مندرجہ بالا نتیجہ اخذ کرنے کے بعد میں نے گہری نظروں سے اس کے طور طریقوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ میری ہی طرح اسے فکشن، شاعری، کرکٹ اور ڈاک ٹکٹوں سے دلچسپی تھی۔ رات کو دیر سے سونا اور صبح دیر سے اٹھنا، اس کا معمول تھا۔ میری ہی طرح وہ اعصابی طور پر بہت زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ فرطِ طیش اور فرطِ مسرت میں ٹوٹ پھوٹ جاتا تھا۔ میری ہی طرح حساسیت اس میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ عاشق مزاج بھی تھا اور ہر عاشق کی طرح انا پرستی کے جراثیم بھی اس میں موجود تھے۔ یہ تو خیر عمومی رویوں کی بات ہے لیکن وہ چھوٹی چھوٹی عادات میں بھی میری پیروی کرتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے چھوٹا لقمہ ڈالنا، پہلے بائیں پاؤں میں جوتا پہننا۔ بائیں کروٹ پر سونا۔ ہاتھ دھونے کے بعد انہیں اور زور سے جھٹکنا۔ تنہائی میں باریک آواز سے گنگنانا۔ غرض اس کی بہت سی عادات ایسی تھیں جو ہو بہو مجھ سے ملتی تھیں اور اس کی تصدیق کئی بار میری والدہ صاحبہ نے بھی کی تھی۔ اپنے بیٹے کے بارے میں میں جب اچھی طرح جاننے لگا تو اس کے بارے میں ٹھیک ٹھیک پیش گوئیاں بھی کرنے لگا۔ میری یہ پیش گوئیاں اکثر درست ہوتی تھیں اور میری بیوی کے علاوہ دیگر اہلِ خانہ بھی حیران رہ جاتے تھے۔

میں کوئی مستقبل بین نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے اس کا دعویٰ ہے۔ میری مستقبل بینی صرف اپنے بیٹے عدنان کی حد تک تھی اور اس کی وجہ وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کی ہے۔ عدنان کی نفسیات اور میری نفسیات میں کوئی فرق نہیں تھا اور اسی مماثلت کو بنیاد بنا کر میں اس کے آئندہ رویے کے بارے میں درست اندازہ قائم کر لیتا تھا۔ مثال کے طور پر میں نے ایک روز اپنی بیوی سے کہا کہ عدنان ایک دو دن میں پھر سے صبح کی سیر اور ورزش شروع کر دے گا اور ایسا ہی ہوا۔ عدنان نے اگلے دن سے پھر میرے ساتھ جاگنگ پر جانا شروع کر دیا۔ یہ معمول اس نے لیکن چار ماہ پہلے بلاوجہ چھوڑ دیا تھا اور میرے اصرار کے باوجود دوبارہ شروع نہیں کیا تھا۔

میری اس ''درست پیش گوئی'' کا پس منظر یہ تھا کہ ایک روز پہلے گلی میں عدنان کا ایک انگریز لڑکے سے جھگڑا ہوا تھا۔ اس نے زبانی کلامی جھگڑے میں انگریز لڑکا عدنان پر حاوی رہا تھا اور عدنان کو شرمندگی کے ساتھ پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی۔ میں نے یہ سب کچھ اپنے کمرے میں سے سن لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس شرمندگی کے ردِعمل کے طور پر عدنان اپنی صحت پر توجہ دینا شروع کر دے گا۔ بظاہر یہ بے ربط نظر آتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ایسا ہی ہے۔ خود میرے ساتھ بارہا ایسا ہو چکا تھا۔ مجھے کہیں ہزیمت اٹھانا پڑتی تو میں اس ہزیمت کا جواز اپنی جسمانی کمزوری یا ناقص صحت میں ڈھونڈنے لگتا تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے رینگتا رہا۔ عدنان اسکول سے فارغ ہو کر کالج پہنچ گیا۔ پڑھائی میں وہ میری ہی طرح اوسط سے بہتر طالب علم تھا۔ وہ کالج کی کرکٹ ٹیم میں کھیلتا تھا، ٹکٹ جمع کرتا تھا، میوزک سنتا تھا۔ غرض وہ سب کچھ کرتا تھا جو اس عمر میں کیا کرتا تھا۔۔۔۔

عدنان کے علاوہ ہماری صرف ایک بیٹی تھی۔ وہ عمر میں عدنان سے بڑی تھی اور اس کی شادی ہم پاکستان میں کر چکے تھے۔ اب ہماری تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز عدنان تھا۔ اسے اچھا شہری بنانا اور کسی نمایاں مقام تک پہنچانا ہم میاں بیوی کا نصب العین تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب عدنان کی رومانی زندگی شروع ہونے والی ہے۔ ان معاملات میں وہ میری طرح شرمیلا اور کم گو واقع ہوا تھا لیکن شرمیلے نوجوان اکثر چھپے رستم بھی ثابت ہوتے ہیں، اور پھر جو شخص شاعر اور مصور بھی ہو، اس کے علاوہ خوبصورت ہو اور حد درجہ حساس بھی تو اس کی رومانی زندگی یقیناً خاصے کی چیز ہوتی ہے۔ میری اپنی مثال میرے سامنے تھی۔ میں نے خالص مشرقی انداز میں ایک انگریز لڑکی سے ٹوٹ کر پیار کیا تھا اور ان تمام جاں گسل و روح افزا مراحل سے گزرا تھا جن کے ذکر سے مشرقی شعرا کے دیوان بھرے پڑے تھے۔ بڑی افلاطونی محبت تھی یہ لیکن ناپائیدار نہیں تھی۔ میں نے پورے تین سال اس لڑکی کو چاہا تھا پھر اس لڑکی کی شادی ہو گئی تھی۔ جس روز اس لڑکی کی شادی ہوئی اسی روز میری بھی ہو گئی۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ جی ہاں۔۔۔۔۔ میں نے اپنی محبت کو ہی اپنی شریکِ حیات بنایا تھا۔ اور یہاں آ کر میرا راستہ شعرائے کرام اور نامور عشاق کے راستے سے کچھ جدا ہو گیا تھا۔

اپنے ماضی کی روشنی میں میں بخوبی دیکھ سکتا تھا کہ عنقریب عدنان بھی کسی افلاطونی عشق

کا شکار ہونے والا ہے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ میں نے عدنان کی کتابوں میں ایک دو محبت نامے دیکھے۔ وہ اپنے کالج میں زیر تعلیم کسی جولیا نامی لڑکی سے محبت کر رہا تھا۔ عدنان کے محبت نامے پڑھنے کے بعد میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں جولیا نام کی اس لڑکی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانوں۔ نجانے کیوں محبت نامے پڑھتے ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرے نقش قدم پر چلتے ہوئے عدنان اب اسی لڑکی کو دلہن بنائے گا اور یہی ہماری بہو بنے گی۔ میں نے چند دن انتظار کیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید عدنان خود ہی جولیا کا تعارف ہم سے کرائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ غالباً اس کی فطری شرم و حیا آڑے آ رہی تھی پھر میں نے سوچا کہ خود ہی عدنان سے جولیا کا ذکر کروں اور اس سے کہوں کہ وہ ہمیں جولیا سے ملائے مگر اس سے پہلے کہ میں عدنان سے بات کرتا، ایک روز اتفاقاً جولیا میرے سامنے آ گئی۔ اسے دیکھنے کے بعد میں دنگ رہ گیا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ میں سے عدنان کے ساتھ نکل رہی تھی۔ وہ اتنی ہی خوبصورت تھی جتنا کسی مشرقی یا مغربی شاعر کا شہ پارہ ہو سکتا ہے۔ حسن اور کشش کے ہر بہترین معیار پر وہ پوری اترتی تھی۔ عمر بمشکل اٹھارہ سال ہو گی۔ اس کا چہرہ کسی معصوم دیوی کا چہرہ تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر میرے دنگ رہنے کی وجہ اس کی خوبصورتی نہیں تھی بلکہ یہ احساس تھا کہ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں اور یہ احساس اتنا ناخوشگوار تھا کہ مجھے اپنے سینے میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئیں۔ میں اس تتلی جیسی لڑکی کو اپنے رنگین مزاج باس کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ یہ دو ڈھائی ماہ پہلے کی بات تھی۔ انکم ٹیکس کے گوشوارے جمع کرانے کی تاریخیں تھیں اور میں چونکہ انکم ٹیکس کے کیس لڑنے والی ایک لیگل فرم میں کام کرتا تھا لہٰذا رات کو مجھے دیر تک دفتر میں بیٹھنا پڑا۔ رات نو بجے کے قریب ہمارے باس صاحب نشے میں دھت فرم کے دفتر میں داخل ہوئے۔ ان کا ایک بھاری بھرکم بازو اسی تتلی سی لڑکی کے شانے پر تھا۔ میری موجودگی کی پروا کئے بغیر وہ لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے اپنے آفس میں گھس گئے اور ڈیڑھ گھنٹے سے پیشتر باہر نہیں نکلے۔ آج میں اسی لڑکی کو اپنے بیٹے کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ میری رگوں میں خون کھول اٹھا۔ جی چاہا ابھی آگے بڑھوں اور اپنے بیٹے کا ہاتھ اس لڑکی کے ہاتھ سے چھڑا دوں لیکن میں اس خیال کو فوری طور پر عملی جامہ پہنا کر کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا صبر کا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

اس روز میں ساری رات جاگتا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے ان محبت ناموں کے

حروف ناچ رہے تھے جو میرے بیٹے نے جولیا نامی اس لڑکی کو لکھے تھے۔ یہ حروف مجھے سیلاب کی تند ریلوں کی طرح محسوس ہوئے۔ مجھے لگا کہ میں ان ریلوں کے سامنے جو بھی بند باندھوں گا وہ ریت کی دیوار کی طرح بہہ جائے گا۔ پھر کیا کرنا چاہئے مجھے؟ کیا مجھے بند باندھنا چاہئے یا کسی حکمت عملی کے ساتھ اس پانی کا رخ موڑ لینا چاہئے۔ میں بہت دیر سوچتا رہا اور جتنا سوچتا رہا، اتنا الجھتا رہا۔

جولیا اور عدنان کی محبت تیزی سے پروان چڑھتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ میرے اندر ٹوٹ پھوٹ بھی جاری رہی۔ میں نے اپنی بیوی کو بھی جولیا اور عدنان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور ہم دونوں نے عدنان کے توسط کے بارے میں ملاقات بھی کر لی تھی، لیکن حالات اپنے من چاہے رخ پر سرپٹ دوڑے چلے جا رہے تھے۔ میں نے ایک دو بار دبے لفظوں میں عدنان کو یہ سمجھایا بھی کہ جولیا ہمیں اچھی لڑکی نظر نہیں آتی اور وہ اس سے تعلقات استوار کرنے میں احتیاط سے کام لے لیکن اس نصیحت کا وہی حال ہوا جو عاشقوں کو کی جانے والی نصیحتوں کا ہوتا ہے۔

عدنان اور جولیا بدستور آپس میں ملتے رہے اور ان کے تعلقات پروان چڑھتے رہے۔ دوسری طرف میں اندر ہی اندر کڑھتا رہا اور میرے دل و دماغ میں اس لڑکی کے خلاف نفرت جڑ پکڑتی رہی جو بظاہر معصوم لیکن درحقیقت انتہا درجے کی عیار تھی اور میرے بیٹے کو اپنے جال میں جکڑے ہوئے تھی۔ میں حیران تھا کہ عدنان کی آنکھوں پر کیسی پٹی بندھ گئی ہے۔ وہ اتنا نادان نہیں تھا کہ جولیا کا کردار اس کی نگاہ سے اوجھل رہتا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ وہ اچھی لڑکی نہیں پھر بھی وہ اس کے سحر میں گرفتار تھا۔۔۔۔۔۔ وہ میرا۔۔۔۔۔ ہم مزاج تھا پھر وہ کیوں کر رہا تھا؟ میں تو کبھی بھی ایک بے راہ رو لڑکی کی چاہ میں یوں غرق نہ ہوتا۔ شاید وہ اپنی سدھ بدھ کھو گیا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ آگے چل کر جولیا اپنے آپ کو بدل لے گی۔ یا پھر کسی مصلحت کے تحت اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

میں نے جولیا کے بارے میں کافی معلومات اکٹھی کر لی تھیں۔ وہ ایک ماڈل گرل کی بیٹی تھی۔ بے حد آزاد خیال اور ماڈرن۔۔۔۔ اس نے بہت سی دوستیاں پال رکھی تھیں۔ ان میں مردوں کی دوستیاں بھی شامل تھیں اور ان میں ایک دو مرد ایسے بھی تھے جن کا نام خاص معنوں

میں اس کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ مزاج کے حوالے سے وہ بے حد حاضر جواب اور تیز وطرار مشہور تھی۔ مخاطب کو چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی۔ کسی مرد کے لئے آسان نہیں تھا کہ اسے سنجیدگی پر مائل کر سکے۔ یہ پہاڑ صرف عدنان نے ہی سر کیا تھا۔۔۔۔ وہ اس کے ساتھ سنجیدہ ہوئی تھی اور برملا اپنی شکست کا اعتراف بھی کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ عدنان اس کا آئیڈیل مرد ہے اور اگر وہ مستقبل میں کسی کی بیوی بنے گی تو وہ عدنان ہوگا۔

انہی دنوں میں نے عدنان کو اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکا بھیج دیا۔ وہ کمپیوٹر پروگرامنگ میں اعلیٰ ڈگری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ یہ ڈگری امریکا سے حاصل کرے۔ میرے اس مشورے کے پیچھے یہ خواہش بھی کارفرما تھی کہ وہ جولیا سے دور چلا جائے اور اس آگ سے بچ جائے جو ایک گمراہ لڑکی کی صورت میں اسے اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ عدنان امریکا چلا گیا لیکن حالات میں کوئی قابل ذکر تبدیلی رونما نہیں ہوئی، بلکہ میں نے اندازہ لگایا کہ فاصلے نے عدنان کے جذبوں میں شدت پیدا کر دی ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق وہ ہر دوسرے تیسرے روز جولیا کو خط لکھتا تھا اور طویل ٹیلی فون کالیں بھی کرتا تھا۔ عدنان کی غیر موجودگی میں بھی جولیا کبھی کبھار ہم سے ملنے آجاتی تھی، کبھی میں اس کے فلیٹ میں چلا جاتا تھا۔ آج کل وہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ علیحدہ فلیٹ میں رہ رہی تھی۔۔۔۔۔ چونکہ یہ فلیٹ میرے دفتر کے راستے میں واقع تھا لہٰذا میرے لیے آسان تھا کہ گاہے بگاہے جولیا سے مل سکوں۔۔۔۔۔ میں جولیا کو زیادہ اچھی طرح جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر ایک دفعہ اس کی ''سائیکی'' میری سمجھ میں آجاتی تو میرے لئے آسان ہو جاتا کہ اسے اپنے بیٹے عدنان سے دور کر سکوں لیکن وہ بڑی گہری اور پیچیدہ لڑکی تھی۔ پھر ایک روز ایسا واقعہ ہوا کہ جولیا کے لئے میری نفرت انتہا کو پہنچ گئی اور میں اس کے سلسلے میں انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔

وہ جمعے کی شام تھی۔ اگلے دو روز چھٹی تھی۔ میں خود کو بہت ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔ جولیا کے فلیٹ کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے کار کا رخ فلیٹ کی طرف موڑ دیا۔ فلیٹ پر پہنچ کر کال بیل بجائی لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ میں نے دروازے کو دھکیلا تو وہ مقفل نہیں تھا۔ جولیا کو آوازیں دیتا ہوا میں اس کے بیڈ روم تک جا پہنچا۔ وہ اپنے بستر پر نشے میں مدہوش پڑی تھی اور ایسی حالت میں تھی کہ کوئی بھی شخص اپنی ہونے والی بہو کو اس حالت میں دیکھنے کا

تصور نہیں کر سکتا۔ میں بھی آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کوئی مرد تھوڑی دیر پہلے تک اس کے ساتھ موجود تھا۔ کمرے میں بکھری ہوئی بہت سی اشیاء ان رنگین وسنگین لمحات کی کہانی سنا رہی تھیں جو اس کمرے میں گزارے جا چکے تھے۔ میں الٹے قدموں واپس لوٹ آیا۔ جولیا کے فلیٹ سے باہر نکلتے ہوئے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ میں اس لڑکی کو قتل کر دوں گا۔

جولیا کے قتل کا منصوبہ میں پہلے سے تیار کر چکا تھا۔ اس منصوبے پر عمل کرنے میں تاخیر میرے تذبذب کے سبب ہو رہی تھی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا، اس انتہائی اقدام سے پہلے تذبذب کا شکار ضرور ہوتا۔ میرے ذہن میں بھی بارہا یہ خیال آیا تھا کہ شاید میں کسی اور طریقے سے جولیا کو عدنان کی زندگی سے نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں یا پھر جولیا ہی میں کوئی تبدیلی آجائے کہ میرا ذہن اسے بطور بہو قبول کر لے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہو سکا تھا اور اب میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے پر مجبور تھا۔

یہ منصوبہ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد بنایا تھا۔ میرے منصوبے کی بنیاد تین برس پہلے کی ایک اخباری خبر تھی۔ اس خبر میں ایک جنونی قاتل کا ذکر تھا۔ اس جنونی نے بے گناہ لوگوں کو بے وجہ قتل کیا تھا۔ اس واقعے میں خاص بات قاتل کا طریقہ واردات تھا۔

اسکاٹ لینڈ کے ایک دور افتادہ قصبے وار پول میں کرسمس سے چند روز پہلے چھ سات افراد پراسرار طور پر ہلاک ہو گئے اور چند ایک کو نازک حالت میں ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ مقامی پولیس نے واقعات کے اس سلسلے کی کڑیاں آپس میں ملائیں تو معلوم ہوا کہ ہلاک اور بیمار ہونے والے افراد میں سے پانچ چھ افراد کے پاس ڈاک کا لفافہ پڑا ہوا پایا گیا۔ یہ لفافے مختلف نوعیت کے تھے۔ تین میں کرسمس کارڈ تھے۔ ایک میں گھریلو خط اور ایک میں کاروباری رقعہ۔ مزید تفتیش کے بعد اسکاٹ لینڈ کی مشہور زمانہ پولیس نے سراغ لگا لیا کہ تمام اموات سائنائیڈ زہر کی ایک خالص ترین قسم کی وجہ سے ہوئیں۔ حسب توقع یہ زہر ان ڈاک ٹکٹوں کی گم میں موجود تھا جو ڈاک کے لفافے پر موجود تھیں یا مقتولین اور متاثرین کے آس پاس پائی گئی تھیں۔ زہر سے متاثر ہونے والے افراد ڈاک لفافوں پر چسپاں کرنے کے لئے جب زبان سے گیلے کیے تو انتہائی زود اثر زہر کے سبب ان کی موت واقع ہو گئی یا وہ شدید بیماری کی حالت میں ہسپتال پہنچ گئے۔ پولیس نے قصبے کے ڈاک خانے میں موجود تمام ڈاک ٹکٹ قبضے میں لے

لیے اور ایک ملازم کو گرفتار کرلیا۔ اس ملازم نے بعدازاں اپنے جرم کا اعتراف کرلیا اور بتایا کہ اس نے دماغی فتور میں مبتلا ہو کر یہ خطرناک حرکت کی ہے۔ پولیس کی بروقت تفتیش اور کارروائی سے مزید درجنوں جانیں ضائع ہونے سے بچ گئی تھیں۔ زہر آلود ٹکٹ بہت زیادہ تعداد میں فروخت نہیں ہوئے تھے پھر بھی مقامی انتظامیہ نے علاقے کے لوگوں کو خبردار کرنے کے لئے ریڈیو اور ٹی وی پر اشتہارات دیے تھے اور اخباروں کے ذریعے لوگوں کو مطلع کیا تھا۔ یہ تمام واقعات قصہء پارینہ بن چکے تھے۔

دس پنس کا جو ٹکٹ سات افراد کی موت کا سبب بنا وہ محکمہ سیاحت کی طرف سے تھا۔ اس پر مادام تساؤ کے میوزم سمیت لندن کے چند تفریحی مقامات کی تصویریں تھیں۔ ان ٹکٹوں کی موجودگی ہی میرے منصوبے کی بنیاد بنی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جولیا کو ان ٹکٹوں کے ذریعے ہلاک کروں گا۔ سائنائیڈ زہر حاصل کرنا میرے لئے چنداں مشکل نہیں تھا۔ آج کے دور میں رقم خرچ کر کے کچھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں نے یہ زہر جنوبی لندن کی ایک کیمیکلز شاپ سے حاصل کیا اور بڑے سائنٹیفک طریقے سے اسے ڈاک کے ٹکٹوں کی پشت پر پیسٹ کر دیا۔ اب منصوبے کے آخری حصے پر عمل درآمد کرنا باقی رہ گیا۔

وہ اپریل کی ایک خوشگوار شام تھی۔ میں جولیا کے فلیٹ پر پہنچا۔ جولیا کی سہیلی ان دنوں کہیں گئی ہوئی تھی۔ جولیا فلیٹ میں اکیلی تھی۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ اس کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ باتوں کے دوران وہ کافی بنانے کچن میں گئی تو میں اس کے اسٹڈی روم میں داخل ہو گیا اور زہر آلود ٹکٹ اس کی میز پر رکھ دیے۔ یہ ٹکٹ میں نے پہلے سے موجود ٹکٹوں کے اندر رکھے تھے اور اگر جولیا بہت زیادہ باریک بینی کا مظاہرہ نہ کرتی تو اس کے لئے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ یہ ٹکٹ خود خرید کر لائی ہے یا کوئی یہاں رکھ گیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ جولیا ہر دوسرے روز عدنان کو خط لکھ رہی ہے اس کا مطلب تھا کہ اس ہفتے کے دوران وہ یہ ٹکٹ استعمال کر رہے گی۔ زہر خورانی کے سبب ہونے والی اس موت کا الزام کسی صورت بھی میرے سر نہیں آ سکتا تھا۔ میں تصور کی نگاہ سے اس خبر کی سرخی دیکھ سکتا تھا جو جولیا کی موت کے بعد شائع ہونا تھی۔۔۔۔۔

”ڈاک کے قاتل ٹکٹوں نے تین سال بعد ایک اور جان لے لی۔ ماضی کی مشہور ماڈل گرل کیتھرائن کی نوجوان بیٹی جولیا اپنے اسٹڈی روم میں مردہ پائی گئی۔“

اور پھر وہی کچھ ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ صرف دو روز بعد علی الصبح مجھے جولیا کی ”ناگہانی“ موت کی خبر مل گئی۔ اسے رات دس بجے کے لگ بھگ اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ایک گھنٹہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وہ دم توڑ گئی۔ تفصیلات کے مطابق اس کی موت زہر آلود ٹکٹوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ رات آٹھ بجے کے لگ بھگ اس نے اپنی ملازمہ کو ایک خط پوسٹ کرنے کے لئے دیا تھا۔ ملازمہ خط پوسٹ کرنے کے بعد واپس آئی تو جولیا کو درد کی شدید شکایت تھی۔ پہلے اسے فلیٹ پر ہی طبی امداد دی گئی پھر اسپتال پہنچا دیا گیا۔ گیارہ بجے کے قریب وہ ختم ہو گئی۔ اس کے معدے سے برآمد ہونے والے مواد میں سائنائیڈ زہر پایا گیا۔ پولیس نے فوری طور پر تفتیش شروع کر دی۔ جس وقت متوفیہ کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی وہ اسٹڈی روم میں تھی۔ اسٹڈی روم کی میز پر مشکوک ڈاک ٹکٹ پائے گئے۔ ڈاک ٹکٹ ملنے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر پولیس کے سراغرساں اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ متوفیہ کی موت زہر آلود ٹکٹوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔

میں نے جولیا کے قتل کا منصوبہ محنت سے تیار کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں ”تفتیش“ کی زد میں نہیں آؤں گا۔ زہر آلود ٹکٹوں کے سبب جولیا کے ہلاک ہو جانے میں ایک ڈرامائی کیفیت تو تھی، لیکن ایسا ہونا ناممکن نہیں تھا۔ اکثر پرانے غیر استعمال شدہ ٹکٹ لوگوں کے پاس پڑے رہ جاتے ہیں۔ بعدازاں ضرورت پڑنے پر انہیں استعمال کر لیا جاتا ہے۔ تین سال پہلے وارپول کے ڈاک خانے سے جو ٹکٹ فروخت ہوئے تھے ان میں سے بہت سے لاپتا تھے۔ جولیا کی موت کا سبب بننے والے ٹکٹوں کو انہی گمشدہ ٹکٹوں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔

اسی روز میں نے نیویارک فون کر کے عدنان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ شام کو اسی طرح کی ایک دوسری کوشش بھی ناکام ہوئی۔ عدنان کے ایک دوست کا فیکس نمبر میرے پاس تھا۔ یہ دوست نیویارک سٹی کے مضافات میں رہتا تھا تاہم مجھے امید تھی کہ وہ عدنان تک میرا پیغام پہنچا دے گا۔ میں نے اپنے فیکس میں عدنان کو یہ اطلاع دی کہ جولیا ایک ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہے اور اس کا فوراً لندن پہنچنا ضروری ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ کل شام تک لندن واپس پہنچ سکے اور جولیا کی آخری رسومات میں شریک ہو سکے لیکن وہ پہنچ نہیں پایا۔ جولیا کی تدفین اس کے بغیر ہی عمل میں آئی۔

تدفین کے اگلے روز بھی عدنان کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا تو مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ میں نے پھر اسے ٹیلی فون کیا۔ اس مرتبہ عدنان کے ایک ہم جماعت سے بات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ عدنان ہوٹل میں موجود نہیں ۔۔۔۔۔۔ اس کا کمرہ دو روز سے خالی پڑا ہے۔ میری پریشانی ایک دم عروج پر پہنچ گئی۔ میں نے عدنان کے ۔۔۔۔۔ ہم جماعت سے کہا کہ وہ فوراً عدنان کے بارے میں معلوم کرے۔ میں ایک دو گھنٹے بعد اسے پھر فون کرتا ہوں۔ لیکن میرے فون کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی ۔۔۔۔۔ صرف آدھے گھنٹے بعد مجھے ٹیلی فون پر نیو یارک سے ایک ایسی اطلاع ملی جس نے میری دنیا اندھیر کر دی اور مجھے یوں لگا کہ میرا جسم ہزار ہا ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر فضائے بسیط میں بکھر گیا ہے۔ میرے جوان بیٹے کی موت کی اطلاع دی گئی تھی۔

☆☆☆

عدنان درحقیقت چوبیس گھنٹے پہلے ہفتے کی شام کو ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ کھلے سمندر میں دیر تک اس کی لاش کی تلاش جاری رہی تھی لیکن کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی تھی۔ صرف اس کشتی کی چند باقیات مل سکی تھیں جس پر عدنان سوار تھا ۔۔۔۔۔ اس دلدوز واقعے کی تفصیلات کچھ اس طرح تھیں ۔۔۔۔۔ عدنان ہر ویک اینڈ پر کشتی رانی کے لئے کھلے سمندر میں جاتا تھا۔ ساحل سے دور کسی پُرسکون مقام پر وہ اپنی کشتی کے اندر ہی بیٹھ کر میوزک سنتا تھا، شعر لکھتا تھا اور دھوپ سینکتا تھا ۔۔۔۔۔ ایک بار اس نے خود ہی اپنے خط میں لکھا تھا۔ ''کھلے سمندر میں تنہا کشتی میں آسمان کی طرف منہ کر کے لیٹنا مجھے بہت بھلا لگتا ہے ۔۔۔۔۔ شعر جیسے خود بخود مجھ پر اترنے لگتے ہیں۔ خاص طور سے اس ماحول میں جولیا کے خطوط پڑھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے آس پاس ہی کہیں موجود ہے ۔۔۔۔۔۔ آبی پرندوں میں اس کی آواز سنتا ہوں اور ہوا میں اس کی مہک محسوس کرتا ہوں۔ وہ لہروں میں جذب ہو کر میری چاروں جانب ہلکورے لینے لگتی ہے ۔۔۔۔ یہ سب کچھ مجھے بہت اچھا لگتا ہے پاپا ۔۔۔۔ بہت ہی اچھا۔''

اس دن بھی وہ اسی تفریحی موڈ میں کشتی پر سوار ہو کر کھلے سمندر میں گیا تھا۔ موسم زیادہ اچھا نہیں تھا۔ ہوا تیز تھی اور موجوں میں تلاطم تھا۔ تین چار بجے تک موسم کی یہ کیفیت مزید شدت

اختیار کر گئی تھی ۔۔۔۔۔ اور پولیس کی تفتیش کے مطابق یہی وہ وقت تھا جب عدنان کی کشتی کو حادثہ پیش آیا ۔۔۔۔ حادثے کی وجوہات اس وقت تک نامعلوم تھیں ۔۔۔۔۔۔ یہ تو بہرحال نہیں کہا جا سکتا تھا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے کشتی الٹ گئی۔ عدنان ایک مشاق اور چوکس کشتی راں تھا۔ سمندر کی معمولی ہلچل اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ یہ بات طے تھی کہ ''جائے حادثہ'' پر عدنان کے ساتھ کچھ ہوا تھا۔ اس کی موت اتفاقی حادثہ نہیں تھی ۔۔۔۔۔ عدنان کی کشتی کا ٹوٹا ہوا بادبان اور کینوس شوز ایک موٹر بوٹ کے سواروں کو پانی پر تیرتے ہوئے ملے تھے۔ انہی اشیا کی دستیابی کے بعد عدنان کی تلاش شروع ہوئی تھی۔

دن ہفتوں میں بدلے اور ہفتے مہینوں میں ۔۔۔۔۔ دھیرے دھیرے ہر آس دم توڑ گئی۔ عدنان اب اس دنیا میں نہیں تھا ۔۔۔۔۔ لیکن اگر وہ اس دنیا میں نہیں تھا تو اس کی موت کی وجوہات کا تو علم ہوتا لیکن یوں لگتا تھا کہ عدنان کے ساتھ اس کی موت کی وجہ بھی سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن ہو چکی تھی۔ پولیس اور سراغرساں ایجنسیاں سرتوڑ کوشش کے باوجود کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھیں ۔۔۔۔۔ وہ ہر واقعہ سربستہ راز تھا جس کے سبب عدنان کی کشتی الٹی اور وہ بے رحم پانیوں کے حوالے ہوا۔

جولیا اور عدنان کی موت میں قریباً اڑتالیس گھنٹے کا فرق تھا۔ یہ تصور کیا جا سکتا تھا کہ عدنان کو جولیا کی ناگہانی موت کا پتہ چل گیا ہو اور وہ اتنا دل برداشتہ ہوا ہو کہ کھلے سمندر میں جا کر اس نے خودکشی کر لی ہو ۔۔۔۔۔ لیکن اس شبے کی نفی کرنے کے لئے ہمارے سامنے کئی ٹھوس شواہد موجود تھے اور ان میں ایک معتبر شہادت یہ تھی کہ ہفتے کی دوپہر جس وقت عدنان کشتی رانی کے لئے ساحل کے کھلے سمندر کی طرف روانہ ہوا ۔۔۔۔۔ کم از کم تین دوستوں نے اس سے ملاقات کی اور ان تینوں کا کہنا تھا کہ وہ انہیں بالکل ہشاش بشاش اور خوش و خرم نظر آیا ۔۔۔۔ اس امر کا موہوم سا امکان بھی نہیں تھا کہ وہ جولیا کے بارے میں کسی بری خبر سے آگاہ ہو چکا ہو۔

دھیرے دھیرے پولیس کی تفتیشی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں ۔۔۔۔۔ ہماری آنکھوں کے سوتے بھی بہہ بہہ کر خشک ہو گئے ۔۔۔۔۔ اس اندوہناک واقعے پر آہستگی کے ساتھ لیکن بتدریج گزرتے ہوئے وقت کی گرد پڑنے لگی ۔۔۔۔۔ یہ کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا

ہے کہ اب اس واقعے کو قریباً بیس برس گزر چکے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ عدنان کی موت اب بھی ایک معما ہے لیکن کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں عدنان کی موت کی وجہ جانتا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔ میں آرام کرسی سے ٹیک لگا کر اور آنکھیں بند کر کے بیٹھتا ہوں تو کھلے سمندر میں عدنان کی موت کا منظر پوری تفصیلات کے ساتھ میرے ذہن میں اجاگر ہو جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ میرا تخیل نہیں، میری یاد ہے ۔۔۔۔۔۔۔ میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

اب جو بات میں بتانے والا ہوں، شاید وہ آپ کو عجیب سی لگے اور آپ اس میں وزن اور منطق ڈھونڈنے میں ناکام رہیں ۔۔۔۔۔۔۔ شاید آپ یہ سوچنے لگیں کہ اکلوتے جوان بیٹے کی موت نے میری ذہنی صحت کو متاثر کیا ہے اور میں لایعنی خیالات میں گھرا ہوا ہوں لیکن ایسا کچھ نہیں ہے ۔۔۔۔۔۔۔ میں پوری طرح صحت مند ہوں اور اب پینسٹھ سال کی عمر میں بھی ایک اہم اور ذمے دارانہ عہدے پر کام کر رہا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔ پھر جو منظر میرے ذہن نے تخلیق کیا ہے، وہ آج نہیں پندرہ بیس سال پہلے ہی کر لیا تھا اور اس منظر پر مجھے اس وقت بھی اتنا ہی یقین تھا جتنا اب ہے۔

اپنے بیٹے کی موت کی وجہ بتانے سے پہلے میں آپ کو ایک بار پھر یاد کرا دوں کہ میری اور عدنان کی عادات و خصائل میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی تھی ۔۔۔۔ بعض معمولی اور ناقابل ذکر حرکات و سکنات میں بھی وہ میری پیروی کرتا تھا ۔۔۔۔۔۔۔ میری طرح وہ بھی عاشق مزاج تھا اور اس کے رومانی رویے میں عجیب سی وارفتگی اور پیارا سا بچپنا تھا ۔۔۔۔۔ مجھے اپنا دورِ عاشقی اچھی طرح یاد تھا ۔۔۔۔۔۔۔ ایک ایک بات، ایک ایک گھات، ایک ایک دیوانگی ۔۔۔۔۔ مجھے یاد تھا جب میں انگلینڈ سے پاکستان گیا تھا تو عدنان کی ماں جو اس وقت کالج میں پڑھتی تھی، ہر دوسرے تیسرے روز مجھے خط لکھتی تھی اور اپنے ہاتھ سے پوسٹ کرتی تھی۔ پورے ایک سال یہ سلسلہ جاری رہا تھا۔ اس کے خط میرے لئے اتنے ہی اہم ہوتے تھے جتنی زندگی کے لئے آکسیجن ہوتی ہے میں پہروں وہ خط آنکھوں سے چومتا رہتا تھا۔ ایک ایک خط کو درجنوں بار پڑھتا تھا۔ تصورات کی حسین وادیوں میں کھو جاتا تھا ۔۔۔۔۔۔۔ ایسے میں کبھی کبھی مجھ سے ایک عجیب حرکت ہوتی تھی۔ میں وہ ڈاک ٹکٹ اتارتا تھا جو خط پر چسپاں

ہوتے تھے میں سوچتا تھا ان ٹکٹوں کو اس نے اپنی زبان سے چھوا ہے۔ ان پر وہ لعابِ دہن موجود ہے جس پر میں ساری دنیا کی مٹھاس اور خوشبو قربان کر سکتا ہوں۔ میں ان ٹکٹوں کو چومتا تھا۔ ان کا ذائقہ اپنی زبان پر اتارتا تھا اور ایسے میں مسرت و شادمانی کی عجیب سی لہریں میرے رگ و پے میں دوڑ جاتی تھیں۔

وہ میرا بیٹا تھا۔ میرے ہی جیسا نیم دیوانہ، نیم فرزانہ، وہ کھلے سمندر میں نیلے آسمان تلے مکمل اطمینان سے اپنی محبوبہ کا خط پڑھتا تھا۔ اس روز بھی اس نے خط پڑھا تھا اور مر گیا تھا ۔۔۔۔۔۔۔ یہ میرے دل کی آواز ہے، ہاں یہ میرے دل کی آواز ہے، جن ڈاک ٹکٹوں نے جولیا کی جان لی تھی، انہی ٹکٹوں نے میرے بیٹے کی جان بھی لی تھی۔

☆

چھوٹی بیگم

میری زندگی کے اس یادگار واقعے کا تعلق راجستھان سے ہے۔ ان دنوں میں جودھ پور کے نزدیک ایک تھانے میں تعینات تھا۔ دوپہر کے وقت موٹی گردن اور ہشاش بشاش چہرے والا ایک شخص تھانے میں داخل ہوا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔

''میں گڑھی سے آیا ہوں۔ چھوٹی بیگم نے بھیجا ہے اور یہ خط آپ کے لیے دیا ہے۔''

گڑھی اور چھوٹی بیگم کا نام سن کر میں بے اختیار چونک گیا۔ جس علاقے کو گڑھی کہا جاتا ہے وہ چھوٹی موٹی ریاست سے کم نہیں تھا۔ یہاں کے جاگیردار کنور امر سنگھ کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ علاقے میں ان کی شہرت تھی شکار اور نسل کے کتے پالنے سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔

وہ کافی عرصہ بیمار رہنے کے بعد چند ہی ماہ پہلے ''سورگ باسی'' ہوتے تھے۔ اب کنور امر کی بڑی بیٹی نرملا نے جاگیر کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ ''چھوٹی بیگم'' دراصل نرملا ہی کو کہا جاتا تھا۔ اب اس چھوٹی بیگم نے میرے نام کوئی خط بھیجا تھا۔ میں نے موٹی گردن والے سے خط لے کر پڑھنا شروع کیا تھا، لکھا تھا۔

انسپکٹر نواز خاں صاحب! اپنے مینجر راجپال کو یہ خط دے کر بھیج رہی ہوں، پتا جی آپ کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا ایک مرتبہ آپ کے سامنے ہی انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر مجھے کسی وقت مدد کی ضرورت ہو تو بلا تکلف آپ سے رابطہ کر سکتی ہوں۔ اس وقت میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی پتا جی ہم سے جدا ہو جائیں گے اور مجھے ایک اہم مسئلے کے لئے آپ کو مدد کے لئے پکارنا پڑے گا۔ نواز صاحب! سچی بات یہ ہے کہ میں دل سے آپ کی مداح ہوں۔ مجھے واشواس ہے کہ اگر کوئی اس وقت میری مدد کر سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ پلیز آپ

اپنے قیمتی وقت میں سے چند روز کی فرصت نکال کر گڑھی آ جائیں۔ باقی باتیں میں آپ کو یہاں پہنچنے پر بتاؤں گی۔ میں آپ کی مجبوری سمجھتی ہوں، اس لئے میں نے ایک خط ایس ایس پی مسٹر اسمتھ والٹر صاحب کے نام بھی تحریر کر دیا ہے۔ امید ہے کہ ایس ایس پی صاحب کو آپ کے گڑھی آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ فقط آپ کی پرستار نرملا دیوی۔''

میں نے اپنی تعریف کا یہ مختصر خط دو دفعہ پڑھا۔ نرملا کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ آج سے دو سال پہلے میں اکثر گڑھی میں آتا جاتا تھا۔ ان دنوں نرملا آگرہ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ وہ بڑی ذہین اور سمجھدار لڑکی تھی۔ جاگیردار کنور امر سنگھ اکثر جاگیر کے معاملات میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک کیس کے سلسلے میں میں پورے دو ماہ گڑھی میں رہا تھا۔ ان دنوں نرملا سے میری کافی جان پہچان ہو گئی تھی میں نے خط دیکھنے کے بعد ایک طرف رکھ دیا اور مینجر راجپال سے پوچھا کہ ایس ایس پی صاحب والا خط کہاں ہے۔

راجپال نے جواب دیا'' میں جودھ پور سے ہو کر آیا ہوں۔ وہ خط میں نے انہیں دے دیا تھا، جواب میں ایس ایس پی صاحب نے یہ رقعہ آپ کے لئے بھیجا ہے۔''

مینجر نے ایک بار پھر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک دوسرا رقعہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ ایس ایس پی صاحب نے لکھا تھا کہ اگر تھانے میں کوئی زیادہ اہم کیس نہیں اور میں سب انسپکٹر کو قائم مقام بنا کر گڑھی جا سکتا ہوں تو ایک چکر وہاں کا لگا آؤں، کنور امر سنگھ نے اپنی زندگی میں ہمیشہ قانون کی مدد کی۔ ہمیں اس کی بیٹی کو مشکل میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہئے۔

اس کا مطلب تھا کہ نرملا دیوی نے مجھے گڑھی بلانے کا پکا انتظام کیا ہے۔ مگر میں بھی اپنی مرضی کا مالک تھا۔ اس کے علاوہ مجھے تھانے میں ایک دو کام بھی تھے۔ میں نے ٹال مٹول کر کے مینجر کو واپس بھیج دیا۔۔۔۔۔۔ مینجر چلا تو گیا لیکن ٹھیک دو روز بعد پھر آ دھمکا۔ اس دفعہ اس کے ساتھ نرملا کا طویل درخواست نامہ تھا۔ جس میں مجھ سے جلد از جلد گڑھی پہنچنے کی درخواست کی گئی تھی۔۔۔۔۔ اس سارے معاملے کی خبر تھانے کے عملے کو ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ جودھ پور ہیڈ کوارٹر میں بھی چرچے ہو رہے تھے کہ نواز خاں کو گڑھی کی جاگیردارنی نے بلوایا ہے۔ ایک طرح یہ بڑے اعزاز کی بات تھی کہ جاگیردارنی نے ایس ایس پی صاحب کو خط لکھ کر مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ کنور امر سنگھ کا خاندان بڑا بااثر تھا۔ اگر وہ لوگ چاہتے تو کمشنر تک کام کاج چھوڑ

کر وہاں پہنچ سکتا تھا اور اُن کے نخرے اٹھا سکتا تھا۔ خط والا واقعہ مشہور ہونے کے بعد ایک ڈی ایس پی صاحب جودھ پور سے چل کر مجھ سے ملنے آ چکے تھے۔ وہ صرف میری صورت دیکھنے آئے تھے کہ وہ کون سی ذات شریف ہے جسے گڑھی کی جاگیر دارنی خط لکھ لکھ کر بلوا رہی ہے اور جس پر کنور امر سنگھ اتنا بھروسہ کرتے تھے۔

بہر حال اپنے منہ سے زیادہ تعریف اچھی نہیں لگتی۔ جب نرملا دیوی کا منیجر دوسری مرتبہ پیغام لے کر میرے تھانے پہنچا تو میں نے فیصلہ کیا کہ ایک چکر وہاں کا لگا ہی آنا چاہئے۔ میں نے منیجر سے کہا کہ کل شام یا پرسوں دوپہر میں گڑھی پہنچ جاؤں گا۔

وہ مجھے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لئے ایک شاندار بگھی بھی لے آیا تھا۔

بہر حال جب اُس نے میری نیت بھانپ لی تو ہتھیار ڈال کر بولا ”نواز صاحب! بہتر ہے اب آپ اور تاخیر نہ کریں۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا چھوٹی بیگم کس قدر پریشان ہیں۔ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں۔ ساری ساری رات جاگتی ہیں۔ ہمیں تو دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے؟“

میں نے کہا ”راجپال، تم چھوٹی بیگم کے منیجر ہو یا حویلی میں گھاس کھودتے ہو۔ ایک منیجر کو ہر معاملے کی خبر ہونی چاہئے۔ یا پھر تم جان بوجھ کر چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

جواب میں راجپال نے فوراً گیتا کی قسم اٹھائی اور بولا ”مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔ دو تین ہفتے پہلے حویلی میں چوری کی واردات ہوئی تھی۔ چور ابھی حویلی کے احاطہ ہی میں تھے کہ چوکیداروں کو پتہ چل گیا۔ انہوں نے چوروں کو للکارا۔ ان میں سے ایک تو بھاگ گیا لیکن دو پکڑے گئے۔ دونوں کو مقامی پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ چوری چکاری علاقے کا معمول ہے۔ یہ کوئی ایسی خوفناک بات نہیں تھی۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ چھوٹی بیگم کی پریشانی اس واردات کے بعد ہی شروع ہوئی ہے۔ شاید ان کے دل میں کوئی وہم جڑ پکڑ گیا ہے۔“

میں نے منیجر سے پوچھا ”کیا تم پورے یقین سے کہہ سکتے ہو کہ حویلی میں گھسنے والے چور ہی تھے۔“

منیجر نے کہا ”جناب! یہ معلوم کرنا تو پولیس کا کام ہے۔ ویسے پکڑے جانے والوں میں سے ایک لنگڑے کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ پیشہ ور چور ہے۔ نقب لگانے میں اسے ماسٹر سمجھا جاتا ہے۔ جب وہ گرفتار ہوا اس کے لباس میں نقب لگانے کا سامان چھپا ہوا تھا۔“

میں نے منیجر کو مزید کریدنے کی کوشش کی لیکن یا تو اسے معلوم ہی اتنا تھا یا وہ چھپانے کا ”فریضہ“ انجام دے رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز میں اور بلال گڑھی کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ بلال شاہ میرے فربہ اندام و خوش مزاج مخبر کا نام تھا۔ ہم سادہ لباس میں تھے۔ گڑھی کو دو راستے جاتے تھے۔ ایک تو گھوڑوں اور تانگوں وغیرہ کے لئے تھا۔ اس راستے سے گڑھی کا فاصلہ پندرہ کوس کے قریب تھا۔ دوسرا راستہ بذریعہ بس تھا۔ بس گڑھی سے تین میل دور پختہ سڑک پر اتار دیتی تھی۔ وہاں سے پیدل یا تانگے پر جانا پڑتا تھا۔ یہ راستہ طویل تھا مگر نسبتاً آرام دہ تھا۔ ہم نے یہی راستہ اختیار کیا۔ بس ملنے میں کچھ دیر لگی جس کی وجہ سے ہم شام سے تھوڑی دیر پہلے گڑھی پہنچ سکے۔ گڑھی میں کنور امر سنگھ کی حویلی اپنی مثال آپ تھی۔ اسے دیکھ کر کسی چھوٹے موٹے قلعے کا گمان ہوتا تھا۔ ہم حویلی کے صدر دروازے پر پہنچے تو دو باوردی چوکیداروں نے استقبال کیا۔ گیٹ کے بعد ایک نیم تاریک ڈیوڑھی سے گزر ہوا۔ یہاں دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں نقش تھیں۔ ڈیوڑھی کے بڑے محرابی دروازے سے گزر کر ہم حویلی کے احاطے میں آ گئے۔ یہاں گھاس کے خوبصورت قطعے تھے۔ فوارے تھے اور پھولوں سے سجی ہوئی روشیں تھیں۔ احاطے کے عین وسط میں سرسبز گھاس پر بہت سی کرسیاں میزیں لگی تھیں اور خوش لباس مہمان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک طرف سنگ مرمر کے چبوترے پر علاقے کا سب سے مشہور سارنگی نواز استاد ستارے خان اپنے فن کا جادو جگا رہا تھا۔ مہمانوں میں کالے انگریزوں کے علاوہ گورے انگریز بھی موجود تھے۔ گوری میمیں سب سے نمایاں نظر آ رہی تھیں، لیکن ان میموں سے بھی گورے خوبصورت چہرے والی ایک عورت یہاں موجود تھی، اور وہ نرملا دیوی اپنے زرق برق لباس اور لمبے بالوں کے ساتھ وہ واقعی کوئی راجکماری نظر آتی تھی۔ پچھلے دو سالوں میں اس کا لوتی حسن کچھ اور نکھر گیا تھا۔ اسے میری آمد کی اطلاع ہو چکی تھی لہٰذا جونہی میں بلال شاہ کے ساتھ احاطے میں پہنچا وہ میری طرف متوجہ ہو گئی۔ اُٹھ کر ہمارے پاس آئی نمستے کر کے حال احوال پوچھا۔ بلال شاہ ایک دبلے پتلے انگریز کے پہلو میں بیٹھ کر بڑا خوش ہو رہا تھا۔ اور پھر سامنے میز پر بسکٹوں اور پیسٹریوں کا ڈھیر بھی تو لگا تھا۔ اس کے دل میں لڈو نہ پھوٹتے تو اور کیا

ہوتا۔ بیشتر مہمان ہماری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا نرملا دیوی کو ہم دونوں کا تعارف بھی کرانا پڑا۔ اس تعارف میں ظاہر ہے میری تعریف شامل رہی ہوگی۔ نرملا دیوی نے اس دو برس پہلے کے کیس کا ذکر بھی کیا جس کی وجہ سے مجھے کئی ہفتے اسی حویلی میں گزارنے پڑے تھے۔

تنہائی میں نرملا دیوی سے میری پہلی ملاقات اسی روز رات کو ہوئی۔ ایک اردلی ہمارے کمرے میں پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ نشست گاہ میں چھوٹی بیگم آپ کو یاد کر رہی ہیں۔ مجھے معلوم تھا ایسا نہ ہوگا لہٰذا گیارہ بجے کے باوجود میں نے ابھی تک شب خوابی کے کپڑے نہیں پہنے تھے۔ مہمان خانے سے نکل کر میں اردلی کے ہمراہ نشست گاہ میں پہنچا۔ اس وسیع وعریض کمرے میں نرملا دیوی تنہا بیٹھی تھی۔ نشست گاہ میں درجنوں فانوس تھے لیکن صرف دو جل رہے تھے اور ان کی مدھم روشنی میں نرملا دیوی کا چہرہ بے حد زرد دکھائی دیتا تھا۔ مجھے لگا جیسے چند گھنٹے پہلے باہر لان میں جو لڑکی مہمانوں کے ساتھ چہک رہی تھی وہ کوئی اور تھی اور اس کمرے میں جو اداس اور خوفزدہ چھوٹی بیگم بیٹھی ہے وہ کوئی اور ہے۔

میرے آنے سے پہلے ہی چائے کے برتن میز پر رکھے ہوئے تھے۔ نرملا نے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی اور ایک پیالی میری طرف سرکا دی۔ سرد ہوا کسی ادھ کھلے روشن دان سے گزر کر فانوس کی روشنی سے اٹھکیلیاں کرنے لگی۔ نرملا نے اپنے شانوں پر قیمتی شال کو سنبھالا اور کھڑکیوں سے باہر گہری تاریکی کو گھورتی ہوئی بولی۔

''انسپکٹر صاحب! جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ہم زمیندار لوگ نہ بھی چاہیں تو بہت سی دشمنیاں خواہ مخواہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ مجھے بھی پتا جی کی طرف سے بہت سی عداوتیں ورثے میں ملی ہیں۔ معلوم نہیں کیوں کچھ دنوں سے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی شخص میری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ ایک دو واقعے ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے مجھے بہت زیادہ پریشان کیا ہے میں کوئی بزدل لڑکی نہیں ہوں اور یہ بات آپ بھی جانتے ہوں گے مگر کچھ دنوں سے میرا دل ڈرا ہوا ہے۔ پچھلے ہفتے کی بات ہے میں ساری رات جاگتی رہی اور روتی رہی۔ مجھے پتا جی بڑی شدت سے یاد آ رہے تھے۔ وہ تھے تو زندگی کتنی سہل اور محفوظ تھی۔ کوئی غم نہیں تھا، فکر اندیشہ نہیں تھا۔ مگر اب بکھیڑوں اور نت نئے مسلوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اُس رات اچانک مجھے پتا جی کی

بات یاد آئی جو انہوں نے آپ کے بارے میں کہی تھی۔۔۔۔۔۔۔ نواز صاحب! سچ پوچھیے تو مجھے یوں لگا جیسے ایک دم بہت بڑا بوجھ میرے سر سے اتر گیا ہے میں خود کو کوسنے لگی کہ اس سے پہلے میں نے اس انداز میں کیوں نہیں سوچا۔۔۔۔۔ اب آپ کو ان دیواروں میں اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ کئی راتوں کے بعد آج پہلی بار چین کی نیند آئے گی۔۔۔۔۔۔''

نرملا دیوی کافی دیر باتیں کرتی رہی اور میں سنتا رہا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بردست ذہنی دباؤ کا شکار رہی ہے اور اب میری موجودگی سے اسے حوصلہ ملا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ وہ اپنی پریشانی کا سبب چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔

میں نے پوچھا ''نرملا دیوی آپ نے اپنے ڈر کی وضاحت نہیں کی۔ آخر کس کی طرف سے خطرہ ہے آپ کو؟ اور اس خطرے کا سبب کیا ہے؟''

نرملا نے کہا ''نواز صاحب! میں آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتی اور مجھے چھپانا بھی نہیں ہے۔ لیکن میں ابھی خود کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ اگر آپ مجھے چند دن کی مہلت دیں تو میں ادہ آسانی کے ساتھ آپ سے بات کر سکوں گی۔''

میں نے کہا ''نرملا دیوی! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ شاید کل یا پرسوں مجھے یہاں ے واپس جانا پڑے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے مسئلے کا پتہ لگ جائے اور اگر کوئی کام رے لائق ہے تو میں وہ انجام دے دوں۔''

یکا یک نرملا کے خوبصورت چہرے پر بے پناہ مایوسی پھیل گئی وہ بولی ''نواز صاحب! مجھے وس ہے کہ میں آپ کو اپنی بات ٹھیک طرح سمجھا نہیں سکی۔ یہ بڑا گھمبیر مسئلہ ہے سمجھئے کہ۔۔۔۔ کہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر آپ مجھے زندگی اور موت کی کش مکش چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں تو پھر بے شک چلے جائیے۔ میں آپ کو نہیں روکوں گی۔''

میں نے دیکھا نرملا کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں۔ اس کا دل بہت بری طرح ہوا تھا۔ وہ لڑکی جسے علاقے کے لوگ ''چھوٹی بیگم'' کہتے تھے اور مہارانی کا رتبہ دیتے تھے، ں میں میرے سامنے بے چارگی کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ ایک دم مجھے اس پر ترس آنے لگا۔

میں نے کہا'' اس کا مطلب ہے آپ مجھے یہاں روکنا چاہتی ہیں اور یہ بھی بتانا نہیں چاہتیں کہ کیوں روک رہی ہیں۔''

وہ بولی'' میں بتانے سے انکار نہیں کر رہی۔ صرف تھوڑا سا وقت چاہتی ہوں تاکہ جو کچھ بتاؤں وہ آپ کے لئے سودمند ہو نہ کہ آپ کو الجھا کر رکھ دے۔''

اس بات پر نرملا دیوی سے لمبی بحث کی جا سکتی تھی مگر اس کی شیشہ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک دیکھ کر میں نے بحث کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد ہم دونوں میں یہ طے پا گیا کہ میں کم از کم پانچ روز یہاں قیام کروں گا اور اس دوران نرملا مجھے اصل بات سے آگاہ کر دے گی۔۔۔۔۔ نرملا نے میرے اور بلال شاہ کے لئے ایک ایسا کمرہ خالی کرا دیا جو اس کی خواب گاہ کے بالکل قریب تھا۔۔۔۔۔

اگلی دو راتیں ہم نے اسی کمرے میں گزاریں جو نرملا کی خواب گاہ کے بالکل ساتھ تھا۔

تیسری رات گیارہ بجے کے قریب میں سونے کے لئے لیٹ گیا لیکن بلال شاہ بدستور جاگ رہا تھا اور کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ بار بار رکتا گردن کو کبھی لمبا اور کبھی چھوٹا کر کے زوردار ڈکار لیتا اور پھر ٹہلنا شروع کر دیتا۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے اسے نیند کیوں نہیں آ رہی تھی۔ پیٹ میں اوپر سے نیچے تک اناج ہی اناج بھرا ہوا ہو تو نیند بے چاری کیا کرے۔ میں بظاہر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا لیکن کبھی کبھی دزدیدہ نگاہوں سے بلال شاہ کی حرکات و سکنات دیکھ لیتا تھا۔ جلد ہی بلال شاہ تاڑ گیا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ وہ اپنی ''ڈکار بازی'' چھوڑ کر میرے پاس آ بیٹھا۔ کہنے لگا۔

''خان صاحب! مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔ چھوٹی بیگم نے ہمیں اپنے گوڈے سے لگا کر کیوں رکھا ہوا ہے؟''

بلال شاہ کا مطلب یہ تھا کہ نرملا نے ہمیں اپنی خواب گاہ کے اتنا قریب کمرہ کیوں دیا ہے۔ میں نے کہا۔

''شاہ جی! یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔ وہ میزبان ہے اور ہم مہمان۔ وہ جہاں جی چاہے ٹھہرائے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن تم اپنی آواز ذرا دھیمی رکھو۔ بیچ میں صرف ایک دیوار ہے، یہ نہ ہو وہ سن لے۔''

بلال شاہ دھیمی آواز میں بولا۔'' خان صاحب! کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے ۔۔۔۔۔ وہ آپ پر بڑی مہربان نظر آتی ہے۔''

میں بلال شاہ کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ کسی عورت کو میرے قریب دیکھ کر اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتے تھے۔ اس نے جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ مجھے عورت کے سائے سے بھی محفوظ رکھنا ہے۔ میں نے اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔

'' بھلے مانس اس کی تو شادی بھی ہو چکی ہے اور وہ اپنے شوہر سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی تمہیں مٹر پلاؤ کوفتے اور سری پائے سے ہے۔''

''واقعی'' بلال شاہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

''بالکل'' میں نے جواب دیا'' دو برس پہلے اس کا بیاہ ہوا تھا۔ ویسے وہ ابھی تک کنواری''

بلال شاہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں اس سے کوئی مذاق نہیں کر رہا تھا۔ حقیقتاً نرملا کی شادی ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ معلوم نہیں اس کی وجہ کیا تھی۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ نرملا اس شادی پر بہت خوش تھی اور اس کا شوہر اجمیر کے ایک کھاتے پیتے زمیندار کا پڑھا لکھا بیٹا ہے۔ مجھے یہ ساری باتیں اس لئے معلوم تھیں کہ جن دنوں یہ شادی ہوئی میں گڑھی کے علاقے میں ہی کام کر رہا تھا۔

بلال شاہ یہ باتیں سن کر حیران ہوا۔ کہنے لگا'' کہیں یہ بکھیڑا اسی آدھی شادی کا تو نہیں۔''

'' فی الحال تو کچھ نہیں کہا جا سکتا'' میں نے جواب دیا۔'' دیوی کچھ بتائے گی تو پتہ چلے گا۔''

''اور وہ کب بتائے گی؟''

''جب بھی بتائے تمہیں کیا، تم نے واپس جا کر کون سا کوئی کام کرنا ہے۔ کھاؤ، پیو اور موج اڑاؤ۔''

وہ پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا'' ویسے خان صاحب! آپس کی بات ہے نرملا دیوی آپ کی عزت بہت کرتی ہے۔ صبح میرے سامنے مسلمان قصائی سے بکرا حلال کروایا تھا اس نے۔''

میں نے کہا، یہ کیا بات ہوئی۔ مسلمان قصائی نے بکرا کیا تو تم نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ میری بہت عزت کرتی ہے؟''

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیا کریں جی۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہمارے کھانے پینے کا خاص الخاص خیال رکھتی ہے اور۔۔۔۔۔"

یکایک بلال شاہ بولتے بولتے رک گیا۔ اس کے خاموش ہونے کی وجہ ایک سایہ تھا جو کھڑکی کے سامنے سے لہرا کر گزر گیا تھا۔

گزرنے والا یوں دبے پاؤں گزر رہا تھا کہ پاؤں کی مدھم سی آہٹ بھی نہیں آئی تھی۔ میں نے بلال شاہ کی طرف اور بلال شاہ نے میری طرف دیکھا۔ میں تیزی سے اٹھ کر دروازے پر آیا۔ بہ آہستگی پٹ کھول کر باہر دیکھا۔ سایہ برآمدے کی مدھم روشنی سے باغیچے کی تاریکی میں گم ہو رہا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر دبے پاؤں باغیچے کی طرف بڑھا۔ برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ کر میں نے دیکھا، ایک فربہ جسم کی عورت یا لڑکی فوارے کی روشنی میں درختوں کے پیچھے گم ہوتی نظر آئی۔ اس کا انداز بالکل چوروں کا سا تھا۔ اتنی رات گئے ایک عورت کا اس طرح گھومنا پراسرار تھا۔ تمام اندیشے بالائے طاق رکھ کر میں بھی عورت کے پیچھے لپکا۔ میرے جسم پر معمولی لباس تھا اور سرد ہوا کپکپی طاری کر رہی تھی۔ پاؤں میں چپل تھی اور مجھے خاص طور پر پاؤں دبا کر چلنا پڑ رہا تھا۔ فوارے کے نزدیک سے میں نے دیکھا کہ عورت سیدھی حویلی کے اصطبل کی طرف جا رہی ہے۔ یکایک اندھیرے میں اسے نجانے کیا نظر آیا کہ وہ ٹھٹھک کر رکی پھر چیخی اور مڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ جھاڑیوں سے ایک سایہ نکل کر اس کے پیچھے لپکا۔ عورت کے پیچھے بھاگنے والا بھی کوئی فربہ اندام شخص تھا۔ اب میں خاموش تماشائی بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ جونہی وہ دونوں مہندی کے پودوں میں گھسے میں بھی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا میرے وہاں پہنچنے تک فربہ اندام شخص عورت کو چھاپ چکا تھا۔ وہ اس کی گرفت میں مچل رہی تھی اور چلا رہی تھی میرے سامنے اس نے ایک زوردار دوہتڑ مرد کے سر پر مارا، جواب میں مرد چیخ کر بولا۔

"خان صاحب! پکڑ لی ہے، پکڑ لی ہے۔"

میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ موٹی عورت سے لپٹا ہوا موٹا مرد بلال شاہ تھا۔ عورت کی چیخ و پکار دور دور تک گونج رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اصطبل کی طرف سے کئی افراد بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں لالٹینیں تھیں۔ ایک شخص کے ہاتھ میں رائفل بھی نظر آ رہی تھی۔ عورت اب اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور دوپٹہ آنکھوں پر رکھے اونچی آواز میں

رونے لگی تھی۔ رائفل والے نے عورت کو پہچان کر کہا۔

"بشیراں! تم اس وقت یہاں؟"

بلال شاہ دلیر ہو کر بولا "یہ چوروں کی طرح اصطبل کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہاں پہنچ کر ٹھوکر لگی اور گر گئی۔"

عورت کے لباس اور حلیے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ حویلی کی ملازمہ ہے مگر وہ اس وقت جا کہاں رہی تھی۔ اس کے مسلسل رونے سے ظاہر تھا کہ اس کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ رائفل بردار نے ایک بار پھر پوچھا "بشیراں! کیا ہوا ہے تمہیں۔ کچھ بتاؤ بھی؟"

وہ اس سوال کے جواب میں بھی روتی رہی۔ اب یہاں اچھا خاصا مجمع لگ چکا تھا۔ اتنے میں نرملا دیوی بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس نے ابھی شب خوابی کا لباس نہیں پہنا تھا۔ وہ خاصی برہم دکھائی دیتی تھی۔ ایک خادم گیس لیمپ اٹھائے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"کیا ہوا بشیراں؟" نرملا نے قریب آ کر پوچھا۔

بشیراں نے روتے روتے بلال شاہ کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ "چھوٹی بیگم! اس نے مجھے نیچے گرایا ہے اور میرے منہ پر تھپڑ بھی مارا ہے، یہ دیکھئے گرنے سے میرا سارا بازو چھل گیا ہے۔"

اس نے روتے روتے اپنا ایک بازو روشنی کی طرف کر دیا۔ کہیں سے کھال اتر گئی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ نرملا نے گھور کر بلال شاہ کی طرف دیکھا، بلال شاہ تیزی سے بولا۔

"چوہدرانی جی! یہ چوروں کی طرح اصطبل کی طرف جا رہی تھی، میں نے پوچھا کون ہے، بھاگ کھڑی ہوئی۔۔۔۔۔۔"

"اور تم نے اسے پکڑ کر تھپڑ مارنے شروع کر دیئے" نرملا نے غصے سے بات مکمل کی۔

میں نے بلال شاہ کی طرف داری کرتے ہوئے کہا "نرملا دیوی، بات دراصل یہ ہے کہ میں اور بلال شاہ کمرے میں بیٹھے تھے کہ ایک سایہ سا کھڑکی کے پاس سے گزرا۔۔۔۔ گیارہ بجے ہیں۔ ہمارا چونکنا لازمی تھا، ہم کمرے سے نکل آئے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں" نرملا نے بے زاری سے میری بات کاٹی "لیکن

بندے کو اپنے پرائے کی پہچان تو ہونی چاہئے۔ بشیراں اس حویلی کی پرانی ملازمہ ہے اور میری ہدایت پر یہاں آئی تھی۔ آپ کے ساتھی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور حشر کر دیا بے چاری کا۔''

نرملا کے لہجے نے مجھے حیران کر دیا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ سب کے سامنے ایسی سرد مہری سے بات کرے گی۔ کہاں دوپہر تک ''آپ جناب'' ہو رہی تھی اور کہاں یہ غیروں جیسا رویہ۔ میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ پچھلے چند گھنٹوں میں حویلی کے اندر کوئی اہم تبدیلی رونما ہو گئی ہے۔ شام کے وقت بھی میرا اور بلال شاہ کا کھانا کمرے میں ہی بھجوا دیا گیا تھا حالانکہ اس سے پہلے ہمارا کھانا اہل خانہ کے ساتھ ایک ہی میز پر ہوتا تھا۔

میں نے اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے نرملا سے پوچھا ''تو کیا اس عورت کو آپ نے بھیجا تھا۔''

نرملا نے اس بات کا جواب اثبات میں دیا اور بتایا کہ ایک بوڑھی ملازمہ کی طبیعت خراب تھی، اسے ہسپتال پہنچانا تھا بشیراں کو اصطبل بھیجا گیا تھا تا کہ وہ بگھی بان کو بگھی تیار کرنے کی ہدایت کرے۔

اتنے میں نرملا کی دو چھوٹی بہنیں بھی وہاں آ گئیں۔ ان میں سے بارہ تیرہ سالہ کوشل خاص طور پر بہت تیز وطرار تھی۔ اس نے ملازمہ کی زخمی کہنی دیکھی تو بلال شاہ کو گھورنا شروع کر دیا۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا برا لگ رہا تھا۔ یہ تو عرش سے فرش پر پھینکنے والی بات تھی۔

کچھ دیر بعد یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا اور ہم اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ بلال شاہ ڈر رہا تھا کہ شاید میں اسے برا بھلا کہوں گا، لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی میری نظر میں بلال شاہ بالکل بے قصور تھا۔۔۔۔ چور تو ملازمہ کے دل میں خود تھا جو بلال شاہ کو دیکھ کر ڈر گئی تھی اور دوڑ پڑی تھی۔

اگلے روز صبح آٹھ بجے کے قریب حویلی کے دو ملازم کھانا لے کر آئے تو کھانے کی ٹرے میں ایک پرچی بھی تھی۔ یہ پرچی نرملا کی طرف سے تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

''سوری انسپکٹر صاحب! حویلی میں کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ میں ایک دو دن بہت مصروف رہوں گی۔ بہتر تو یہی تھا کہ آپ چند روز یہاں اور قیام کرتے لیکن اگر زیادہ مصروفیت ہے تو فی الحال آپ جودھ پور کا ایک چکر لگا آئیں۔ میں آپ کو بعد میں دوبارہ بلوا لوں گی

۔۔۔۔تعاون کے لئے بے حد شکریہ۔''

تحریر کا صاف مطلب یہ تھا کہ نرملا کو اب ہماری ضرورت نہیں اور وہ ہمیں یہاں سے چلتا کرنا چاہتی ہے۔ میں نے پرچی کی پشت پر لکھ دیا ''نرملا دیوی! ہم آپ کے کہنے سے بیشتر ہی جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ مہمان نوازی کا بے حد شکریہ''

میں نے پرچی ناشتے سمیت واپس بھیج دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں اور بلال شاہ حویلی سے رخصت ہو رہے تھے۔ نرملا کا مینجر ہمیں دروازے تک چھوڑنے آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم حویلی سے پختہ سڑک تک جانے کے لئے حویلی کی بگھی استعمال کریں لیکن میں نے یہ پیش کش قبول نہیں کی۔ دو ڈھائی فرلانگ پیدل چلنے کے بعد ہمیں ایک تانگہ مل گیا اور ہم اس پر سوار ہو کر واپس روانہ ہو گئے۔ بلال شاہ کا منہ پھولا ہوا تھا وہ راستے بھر گڑھی اور گڑھی کی چھوٹی بیگم کو کوستا رہا۔

''بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ ہم کوئی درخواست دے کر یہاں نہیں آئے تھے۔ اپنی ضرورت کے لئے بلایا تھا ہم کوئی بھوکے تھے ان کی روٹیوں کے۔ بد دماغ کہیں کے، ایسے پڑھے لکھوں سے تو گنوار اچھے۔''

میں بلال شاہ کو بار بار ٹوکتا رہا کہ کوچوان سن لے گا اس کے دماغ کو تو ہوا چڑھی ہوئی تھی۔ وہ بولتا رہا۔ ''یہ لوگ مطلب کے یار ہوتے ہیں، مطلب تھا تو قدموں میں بچھے جا رہے تھے، مطلب نہ رہا تو تم کون، ہم کون۔ مجھے تو زہر لگی ہے یہ چھوٹی بیگم، میرے بس میں ہو تو اب کبھی تھوکوں بھی نہ اس کے منہ پر۔''

ہماری منزل آ چکی تھی، کرایہ دے کر ہم تانگے سے اتر آئے۔ جب بس اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے میں نے بلال شاہ سے کہا ''بلال شاہ، تم نے نرملا کے بارے میں جو اندازہ لگایا ہے وہ زیادہ صحیح نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے تنک کر پوچھا۔

''مطلب یہ کہ نرملا کسی گہرے چکر میں پھنسی ہوئی ہے اور اس نے ہمارے ساتھ جو بدسلوکی کی ہے وہ کسی مجبوری کی وجہ سے ہے۔''

بلال شاہ نے کہا، خان صاحب! بدسلوکی مجبوراً ہو یا مرضی سے بدسلوکی ہوتی ہے۔ اسے

کیا حق پہنچتا تھا، رات میری بے عزتی کرنے کا۔ اس نے ہمیں اپنی حفاظت کے لئے بلایا تھا۔ اگر ہم ایک مشکوک عورت سے الجھ پڑے تھے تو یہ ہماری ڈیوٹی کا حصہ تھا۔ اس میں ہمارا کیا فائدہ تھا۔ ہم نے کوئی رشوت کھائی تھی؟''

میں نے کہا ''بلال شاہ! میں تمہاری باتیں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن جو میں کہہ رہا ہوں وہ تم نہیں سمجھ رہے۔۔۔۔۔ ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ایک ہی دن میں نرملا دیوی کا رویہ ہم سے کیوں بدل گیا۔ ملازمہ والا واقعہ بعد میں ہوا اس سے پہلے ہی وہ ہم سے بے زاری ہو گئی تھی۔ آخر کیا قصور تھا ہمارا۔ یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے اور ہمیں نرملا کے رویے کو خواہ مخواہ عزت بے عزتی کا مسئلہ نہیں بنانا چاہئے۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہئے؟'' بلال شاہ نے اکتا کر پوچھا۔

''واپس چلنا چاہئے۔''

''واپس تو جا رہے ہیں۔''

''تھانے کی طرف نہیں۔۔۔۔۔ نرملا دیوی کی طرف۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' وہ بے حد حیران ہو کر بولا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

میں نے ہاتھ کے اشارے سے ایک تانگے والے کو روکا اور اسے کہا کہ وہ ہمیں ''جھوک پال'' لے جائے۔ جھوک پال نام کا یہ گاؤں، گڑھی کے نزدیک ہی تھا۔ یہاں کا نمبردار ہنس مکھ میرا شناسا سا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ہمارے ساتھ پورا تعاون کرے گا اور ہمیں جھوک پال میں رہنے کے لئے ٹھکانہ بھی مل جائے گا۔

میری توقع کے مطابق ہنس مکھ ہمارے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا۔ خاطر مدارت کی اور فراخ دلی سے بولا کہ ہم جب تک چاہیں وہاں رہ سکتے ہیں۔

میں نے کہا ''ہنس مکھ بات ''جب تک'' کی نہیں ہم صرف دو تین روز یہاں رہنا چاہتے ہیں لیکن رازداری سے میرا مطلب ہے کہ ہماری یہاں موجودگی کا پتہ چھوٹی بیگم کو نہ چلے۔''

ہنس مکھ کے چہرے سے ظاہر ہوا کہ میں نے اسے کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ بہرحال میرے اصرار پر وہ آمادہ ہو گیا کہ اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ اس معاملے کی

خبر چھوٹی بیگم کو نہیں ہونے دے گا۔

ٹھکانہ مل گیا تو میں نے ٹھنڈے دل سے اس سارے معاملے پر سوچ بچار شروع کی۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے نرملا سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی میں نے حویلی میں اپنے تین روز قیام کے دوران نرملا کے بارے کافی کچھ جان لیا تھا۔ اس بے چاری پر کم عمری ہی میں بھاری ذمے داریاں پڑ گئی تھیں۔ کنور امر سنگھ کی اولاد میں سب سے بڑی وہی تھی۔ ماں بچپن میں ہی مر چکی تھی۔ باپ کی موت کے بعد اب وہی گھر کی کرتا دھرتا تھی۔ نرملا سے چھوٹی تین بہنیں تھیں اور سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ وہ آگرہ کے کسی سکول میں پڑھتا تھا۔ چاروں بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کے ساتھ جاگیرداری کی ذمے داری بھی نرملا پر عائد ہو چکی تھی۔ وہ جو ایک برس پہلے تک یونیورسٹی کی طالبہ تھی اب چھوٹی بیگم کہلاتی تھی۔ بھاری بھرکم زیور اور لبادے پہن کر باپ کی کرسی پر بیٹھتی تھی اور جاگیر کا کاروبار چلاتی تھی۔ میں نے ایک بات کا اور بھی اندازہ لگایا تھا، جاگیردار گھرانے کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں تھے جتنے لوگ سمجھتے تھے۔ جاگیر کی بہت سی زمین ایک سرکاری اسکیم میں آ رہی تھی اور پچھلے چار پانچ سال سے اس کا مقدمہ چل رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی یہ گھرانہ کئی مقدموں میں الجھا ہوا تھا۔ مقدموں پر خرچ بڑھتا جا رہا تھا اور جاگیر کی آمدن وہیں کی وہیں تھی۔

خیر یہ تو نرملا سوچنے کی باتیں تھیں۔ میں ایک بات جانتا تھا کہ اگر نرملا نے مجھے یہاں بلایا تھا تو کسی نہایت اہم مسئلے کے لئے بلایا تھا۔ پھر وہ مجھے بتا نہیں سکتی تھی کہ مسئلہ کیا ہے۔۔۔۔۔

ایک اور بات بھی میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا۔ ملازمہ بشیراں اگر اصطبل کی طرف جا رہی تھی تو کسی خاص مقصد سے جا رہی تھی، اور نرملا نے جھوٹ بولا تھا کہ کسی بیمار ملازمہ کو اسپتال پہنچانا تھا۔ جس وقت یہ واقعہ ہوا رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور نرملا نے اس وقت تک شب خوابی کا لباس نہیں پہنا تھا عین ممکن تھا کہ بیمار ملازمہ کی بجائے اسے خود کہیں جانا ہو۔ میں ان معاملات پر جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھن کا شکار ہو رہا تھا۔ پھر میرا دھیان نرملا کی ادھوری شادی کی طرف چلا گیا۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید نرملا کی پریشانیوں کا سبب یہ شادی ہے لیکن اب میں مختلف انداز میں سوچ رہا تھا پچھلے تین روز میں نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق اس معاملے میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ یہ شادی نرملا کی دادی ساس کے اصرار پر

ہوئی تھی۔ اس کی دادی ساس قریب المرگ تھی اور وہ ہر صورت اپنے پوتے کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی۔ نرملا اس شرط پر شادی کے لئے رضا مند ہوئی تھی کہ رخصتی کچھ عرصہ بعد ہوگی۔ وہ بیمار باپ کو نوعمر بہنوں کے سہارے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔۔۔۔۔۔۔ بعد ازاں باپ فوت ہوگیا اور نرملا کی ذمے داریاں اور رنگ اختیار کر گئیں۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اس کی چھوٹی بہن ایم ایس سی کے امتحان سے فارغ ہوجائے اور بہن بھائیوں کی نگہبانی کرنے لگے تو وہ شوہر کے گھر رخصت ہوجائے گی۔ نرملا کا زمیندار شوہر راج پانڈے بڑا بھلا مانس نوجوان تھا۔ پڑھا لکھا بھی تھا، اس نے نرملا پر کسی طرح کا دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ وہ جاگیر کے مسائل حل کرنے میں بھی اس کی مدد کرتا رہتا تھا۔۔۔۔۔۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ نرملا کے مسئلے کا تعلق اس کی ازدواجی زندگی سے ہے۔

میں دیر تک اپنے خیالوں میں الجھا رہا۔ بیٹھے بیٹھے اچانک میرے دل میں آئی کہ آج رات حویلی کی نگرانی کرنی چاہئے۔ اگر واقعی کل رات نرملا کہیں جا رہی تھی تو ممکن تھا کہ آج رات وہ پھر کوشش کرے۔ یہ سوچتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت سہ پہر کے تین بجے تھے۔ بلال شاہ لمبی تان کر سویا ہوا تھا۔ میں نے نمبردار ہنس مکھ کو بلایا اور اس سے کہا کہ مجھے ایک رات کے لئے کسی کھیت مزدور کے کپڑے چاہئیں۔۔۔۔۔۔ میری یہ فرمائش پوری کرنے میں ہنس مکھ نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ وہ مختلف رنگوں اور ناپوں کے تین چار جوڑے لے آیا۔ ان میں سے ایک جوڑا مجھے ٹھیک آیا۔ پرانی سی دھوتی قمیض پر میں نے پھٹی پرانی ڈبی دار چادر اوڑھ لی اور دیسی جوتی پہن کر بالکل تیار ہوگیا۔ پولیس ملازمین کو اکثر بھیس بدلنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔۔ ویسے دیہاتی علاقوں میں بھیس بدلنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ خاص طور پر سردیوں میں تو بہت آسانی رہتی ہے۔ ہر شخص منہ سر چادر میں لپیٹے پھرتا ہے۔

بلال شاہ نے مجھے کھیت مزدور کے روپ میں دیکھا تو حیران ہوا۔ میں اسے سب کچھ سمجھا کر خاموشی سے روانہ ہوگیا۔ نمبردار ہنس مکھ نے میرے لئے ایک مریل سی گھوڑی کا انتظام کر دیا تھا۔ بغیر زین کے گھوڑی پر بیٹھ کر شام کے جھٹپٹے میں میں گڑھی کی طرف چل دیا۔ گڑھی کا فاصلہ ''جھوک پال'' سے قریباً دو میل تھا۔ میں کھیتوں کے درمیان سفر کرتا گڑھی کی حدود میں پہنچا تو اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ قصبے کے کچے پکے گھروں میں چراغ جل رہے تھے۔ دور حویلی کی

دوسری منزل پر جگمگاتے فانوس بھی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے پہلے گڑھی کے چاروں طرف ایک چکر لگایا پھر اس۔۔۔۔۔۔ نیم پختہ راستے کے کنارے گھات لگا کر بیٹھ گیا، جہاں سے حویلی کا تانگہ یا بگھی گزر سکتی تھی۔ جس جگہ میں نے ڈیرہ لگایا وہ ایک پرانا کنواں تھا۔ ساتھ ہی برگد کے دو بڑے بڑے درخت تھے۔ میں ان کے نیچے اُپلے جلا کر بیٹھ گیا۔ گھوڑی کو ساتھ رکھنا مناسب نہیں لگا۔ اسے میں نے قریب ہی سرکنڈوں کے اندر کھونٹا ٹھونک کر باندھ دیا۔ میں ساری رات بھی اس جگہ بیٹھا رہتا تو کسی کو شک نہیں گزر سکتا تھا۔ دیہات میں مسافر اسی طرح سرِ راہ آگ جلا کر بیٹھ جاتے ہیں اور بعض اوقات ساری رات گزار دیتے ہیں۔

۔۔۔۔۔۔ میں نے بھی وہ ساری رات اسی ویران کنویں کے اردگرد گھومتے ہوئے گزار دی۔ نیم پختہ راستے کی طرف دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں پتھرا گئیں جس کا انتظار تھا وہ ''شاہکار'' نہیں آیا۔ صبح پَو پھٹنے سے پہلے میں نے سرکنڈوں سے گھوڑی نکالی اور واپس ''جھوک پال'' روانہ ہوگیا۔۔۔۔۔۔ یہ عمل اگلی رات پھر دہرایا گیا۔ شام سے ذرا پہلے ہی میں اپنے اڈے پر پہنچ گیا۔ آج میں اپنے ساتھ وقت گزاری کے لئے حقہ بھی لایا تھا۔ دیر تک میں حقہ گڑگڑاتا رہا اور موہوم امید کے سہارے راستے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت دس بجے تھے جب مجھے نیم پختہ راستے پر بگھی کی ہچکولے کھاتی روشنیاں نظر آئیں۔ اچانک میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ یقینی بات تھی کہ یہ حویلی ہی کی بگھی ہے۔ اگر بگھی میں نرملا بھی موجود تھی تو پھر آج رات کوئی نہایت اہم انکشاف ہونے والا تھا۔ میں برگد کی آڑ میں کھڑا ہوگیا اور خوب توجہ سے بگھی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک شاندار بگھی تھی، میں دن کی روشنی میں اسے اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ کار کی طرح کیبن میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ گھنٹی کی جگہ بیٹری سے بجنے والا ہارن تھا۔ پہیوں اور پائیدانوں پر دھات کے خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔ خوب غور سے دیکھنے کے باوجود مجھے بگھی کے اندر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بگھی گزر گئی تو میں نے بھی گھوڑی سنبھالی اور مناسب فاصلے سے تعاقب شروع کر دیا۔ ویران راستوں پر تعاقب کرنا خاصا دشوار کام ہوتا ہے۔ بہرحال مجھے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ بگھی کی روشنیاں میری رہنمائی کر رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ قریباً تین میل کا فاصلہ طے کر کے بگھی تحصیل کے اسپتال میں پہنچ گئی۔ یہ اسپتال قصبے سے باہر ایک ریلوے لائن کے کنارے واقع

تھا۔ درختوں سے گھری ہوئی سنسان سی جگہ تھی۔ بگھی اسپتال کے نیم روشن گیٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ بگھی بان نے اتر کر عقبی دروازہ کھولا۔ پہلے ایک تنومند چادر پوش عورت نیچے اتری۔ مجھے یہ پہچاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ یہ بشیراں ہے۔ بشیراں کے بعد ایک دوسری عورت نے نیچے قدم رکھا۔ وہ بھی چادر میں چھپی ہوئی تھی۔ بشیراں نے ہاتھ تھام کر اسے نیچے اتارا اور لے کر اسپتال کی طرف چل دی۔ ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں آیا کہ شاید واقعی کسی بیمار بڑھیا کو یہاں لایا گیا ہے مگر فوراً یہ خیال ذہن سے نکل گیا۔ چادر پوش عورت کی چال دیکھ کر میرا ذہن پکار اٹھا کہ یہ دوسری عورت گڑھی کی چھوٹی بیگم کے علاوہ اور کوئی نہیں ۔۔۔۔۔ میرے اس یقین کو ایک اور چیز پختہ کر رہی تھی۔ بشیراں کا انداز بڑا مؤدبانہ تھا، اور وہ دوسری عورت سے ایک قدم پیچھے جھکی جھکی چل رہی تھی۔ بگھی بان نے گھوڑوں کے سامنے چارہ ڈالا اور گیٹ کے قریب ایک بنچ پر بیٹھ کر بیڑی کے کش لگانے لگا۔

دونوں عورتیں قریباً ایک گھنٹہ اسپتال کے اندر رہیں۔ پھر باہر نکلیں اور بگھی میں بیٹھ کر خاموشی سے روانہ ہو گئیں۔ وہ واپس جا رہی تھیں مجھے یقین تھا اب بگھی حویلی کے اندر پہنچ کر ہی رکے گی۔ تعاقب بے فائدہ تھا۔ میں نے بگھی کو جانے دیا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر گھومتا رہا پھر اسپتال کے اندر چلا گیا۔ یہاں کوئی مجھے پہچانتا نہیں تھا لہٰذا بھیس بدل کر بہت لطف آ رہا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا بے کار اسپتال تھا۔ کمروں میں جالے لگے ہوئے تھے۔ دوائیں تو دور کی بات ہے روشنی کا مناسب انتظام بھی نہیں تھا۔ ایک برآمدے میں چند بدنصیب مریض ٹوٹی پھوٹی چارپائیوں پر پڑے کراہ رہے تھے۔ پورے اسپتال میں صرف ایک کمپاؤنڈر اور ایک ڈاکٹر تھا۔ کمپاؤنڈر ایک کمرے میں لمبی تان کر سویا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کمرے میں تھا اس نے ٹانگیں اٹھا کر میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ پاؤں میں ولائتی جوتے تھے۔ جوتوں کے پاس ہی دو پلیٹوں میں کچھ کیک پیسٹریاں اور بسکٹ رکھے تھے۔ چائے کی تین پیالیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ آثار سے نظر آتا تھا کہ حویلی کی دونوں خواتین تھوڑی دیر پہلے تک اس کمرے میں موجود تھیں۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر ڈاکٹر پہلے تو چونکا پھر اس کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ اس کے بے حد کالے ہونٹ کچھ اور بھی کالے ہو گئے۔ وہ غرا کر بولا کہ مجھے اندر آنے کی اجازت کس نے دی ہے۔

میں نے کراہ کر کہا ''میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ اس نے ایک کڑک گالی میرے سینے کو دی

اور چوکیدار کو آوازیں دینے لگا۔ پٹھان چوکیدار بگولے کی طرح چکراتا ہوا آیا اور ڈاکٹر کا اشارہ پانے کے بعد مجھے گھسیٹ کر باہر لے آیا۔''

''خو چہ اَم کو بولو کیا تکلیف ہے تمہارے سینے میں؟''

میں نے عاجزی سے کہا'' میں ڈاکٹر صاحب کو دکھانا چاہتا ہوں''

وہ غصے سے بولا'' اوئے خوار! تم اَم کو جاہل سمجھتا ہے۔ اَم ساڑھے گیارہ برس سے اس اسپتال میں ہے، تمہارے سینے کا تو معمولی بات ہے، ہم تو چھوٹا موٹا اپریشن بھی کر لیتا ہے۔''

بڑی مشکل کے ساتھ اس خودساختہ ڈاکٹر سے جان چھوٹی اور میں واپس جھوک پال روانہ ہوا۔

☆☆☆

میری بے قراری اب عروج پر پہنچ چکی تھی۔ رات والے واقعے کے بعد یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ گڑھی کی چھوٹی بیگم کسی خطرناک معاملے میں الجھی ہوئی ہے۔ اسے کیا ضرورت تھی اتنی رات گئے ڈاکٹر کے پاس جانے کی اور پھر یہ سب کچھ چھپانے کی۔ کبھی دل میں یہ بات بھی آئی کہ ہوسکتا ہے اس معاملے میں نرملا کا اپنا قصور ہو۔

میرا دھیان رہ رہ کر اس سیاہ ہونٹوں والے ڈاکٹر کی طرف جا رہا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں بطور انسپکٹر اس سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں میری یہاں موجودگی کا راز کھل جاتا۔ اگر میں کسی دوسری حیثیت سے ڈاکٹر کے پاس جاتا تو وہ مجھے کچا چبا جانے کا پروگرام بنا لیتا۔ بڑا غصیلا شخص تھا وہ۔ اگلی رات اسی کش مکش میں گزر گئی۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ اب نرملا کی بجائے اس ڈاکٹر پر نظر رکھنی چاہئے۔ آخر کچھ پتہ تو چلے کہ یہ کون ذات شریف ہے۔ یہ کام میری بجائے بلال شاہ زیادہ بہتر طریقے سے انجام دے سکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر نے ابھی اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔۔۔۔۔۔ علی الصبح میں اس بارے میں بلال شاہ سے بات کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ایک سنسنی خیز اطلاع میرے کانوں تک پہنچی اور اس اطلاع کے ساتھ ہی سارا پروگرام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اطلاع یہ تھی کہ چھوٹی بیگم کل رات حویلی سے غائب ہو گئی ہے۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح گڑھی کے تمام دیہاتوں میں پھیل گئی۔ لوگ حیران تھے کہ

نوجوان جاگیردارنی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ بعض لوگ ابھی تک اس خبر پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ان کا خیال تھا کہ بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جارہا ہے۔ چھوٹی بیگم کسی کام سے نکلی ہوں گی اور بہت ہوا تو رات تک واپس آجائیں گی۔ میں نے فوری طور پر نمبردار ہنس مکھ کو حویلی بھیجا تاکہ وہ اصل بات معلوم کر کے آئے۔ نمبردار کی واپسی قریباً تین گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔اس نے بتایا کہ خبر سولی صد درست ہے۔ چھوٹی بیگم حویلی سے غائب ہے۔ اس کے علاوہ حویلی کا بگھی بان راجو اور ملازمہ بشیراں بھی بگھی سمیت غائب ہیں۔ بڑا الجھا ہوا معاملہ ہے،حویلی والے کچھ بتاتے نہیں ہیں۔ہنس مکھ نے یہ بھی بتایا کہ نرملا کا ایک تایا حویلی میں پہنچا ہے اور اس نے قریبی تھانے میں اس واقعے کی اطلاع دی ہے۔

اب میرا اور بلال شاہ کا چھپے رہنا فضول تھا۔ ہم نرملا دیوی کی وجہ سے چھپے ہوئے تھے جب وہ ہی نہیں رہی تھی تو چھپنا کس سے تھا۔ ہم جھوک پال سے نکلے تو سیدھے حویلی پہنچ گئے۔ حویلی میں پولیس پہلے سے آئی بیٹھی تھی۔ ایک موٹا سا انسپکٹر دو اے ایس آئی اور کوئی نصف درجن سپاہی تھے۔ انسپکٹر کا نام انت سنگھ تھا۔ وہ بڑا اسٹپٹایا ہوا نظر آتا تھا۔ غالباً اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کرے۔ اس نے گڑھی کے قریب دو درجن افراد کو مرغا بنا رکھا تھا اور سپاہی ان پر چھتروں کی بارش کر رہے تھے۔ ان مصیبت زدہ لوگوں میں حویلی کے ملازمین بھی شامل تھے۔ انت سنگھ مجھے پہچان کر کھڑا ہو گیا۔ ''آؤ آؤ انسپکٹر نواز خاں! مجھے پتہ تھا تم ضرور آؤ گے پھر آہستگی سے بولا ''ویسے میں مجرم کے قریب قریب پہنچ گیا ہوں گھیرا تنگ کر لیا ہے میں نے۔''

''میں نے کہا ''تمہارا خیال ہے کہ ان مرغوں میں سے ہی کوئی مجرم ہے؟''

''سولی صد بادشاہو۔ ابھی دیکھنا تمہارے سامنے بکیں گے۔ تم انہیں کوئی ایویں شیویں شے نہ سمجھو۔ بڑے بڑے چھپے رستم ہیں ان میں۔''

میں انت سنگھ کے گدھے پن پر مسکرانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ اور اس میں انت سنگھ کا بھی کیا قصور تھا، زیادہ تر دیہاتی تھانے داروں کی تفتیش کا انداز یہی ہوا کرتا تھا۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ ان مشتبہ افراد میں سے کوئی ایک بھی اتنے حوصلے کا مالک نہیں کہ گڑھی کی چھوٹی بیگم کو دو ملازمین اور بگھی سمیت اٹھا کر لے جائے۔۔۔۔۔ یہ تو چھوٹے موٹے آوارہ گرد تھے جو تقدیر کی خرابی کے سبب انت سنگھ کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے میں

نے انت سنگھ سے کہہ سن کر پہلے تو ان مصیبت زدگان کی جان چھڑائی۔ پھر تنہائی میں جا کر انت سنگھ کو سمجھایا کہ چھوٹی بیگم کی گمشدگی کا معمہ ذرا گہرائی میں جا کر حل کرنا ہوگا۔

وہ بولا ''اور دوسرا کیس؟''

میں نے پوچھا ''دوسرا کون سا؟''

اس نے کہا ''بادشاہو! وہی بگھی اور دو نوکروں والا، بلکہ تین نوکروں والا، کیونکہ بگھی بان بھی تو ساتھ ہی غائب ہوا ہے''۔

میرا دل سر پیٹنے کو چاہا۔ انت سنگھ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ بگھی کے غائب ہونے کا معاملہ علیحدہ ہے اور چھوٹی بیگم کی گمشدگی علیحدہ واردات ہے۔ میں نے کہا۔

''سردار جی! مجھے ذرا اتنا بتا دیں کہ آپ کی نگاہ میں یہ سارا معاملہ ہے کیا؟''

وہ سنجیدگی سے بولا ''دیکھو بادشاہو! بگھی والا معاملہ تو میں نے قریب قریب حل کر ہی لیا ہے۔ یہ تو سیدھا سادہ کیس ہے۔ حویلی کی کوئی ملازمہ بیمار تھی۔ کل رات دس بجے اس کی طبیعت اچانک زیادہ خراب ہو گئی۔ حویلی کا بگھی بان نذیر خان ایک دوسری ملازمہ بشیراں کے ساتھ بیمار ملازمہ کو لے کر تحصیل ہسپتال روانہ ہوا۔ بندہ پوچھے زات دس گیارہ بجے اتنی مہنگی بگھی کو ویران رستے پر ڈالنے کی کیا لوڑ تھی۔۔۔۔۔ تھی کوئی لوڑ؟ کچھ نہیں کچھ نہیں تو ایک ہزار روپے کے تو گھوڑے ہی تھے۔ دس بارہ سیر چاندی لگی ہوئی تھی اور سونے کا پانی پھرا ہوا تھا پائیدانوں پر بس وارے نیارے ہو گئے باچا سنگھ کے تو۔''

میں نے حیران ہو کر پوچھا ''یہ باچا کون ہے؟''

وہ سرگوشی سے بولا ''ڈکیت ہے علاقے کا۔ بڑی اَت اٹھائی ہوئی ہے آج کل۔ یہ سارا کام اسی کا ہے۔ میں نے پورا پتہ لگا لیا ہے وہ مونچھوں والا بھنگی جس نے تیسری قطار میں کان پکڑ رکھے تھے ناں، خاص بندہ ہے باچے کا۔ اس نے اقبال کیا ہے کہ یہ کام باچے کے سوا اور کسی کا نہیں۔ بس یہ کیس تو تم حل ہی سمجھو۔ لیکن یہ جو جاگیردارنی کا معاملہ ہے یہ بڑا الٹا سیدھا ہے۔ گھر کے بھیدی کے سوا یہ کام اور کوئی نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔'' اپنے بھدے ہاتھوں سے وہ داڑھی کھجا کر بولا ''ایک تو میرے دماک (دماغ) میں یہ بات آتی ہے کہ ہو سکدا ہے جاگیردارنی خود ہی کہیں چلی گئی ہو۔ یہ بڑے لوک ہیں بابا۔ ان کی آؤنی جاؤنی کا کچھ پتہ نہیں

چلتا۔''

انت سنگھ کی باتوں سے کم از کم ایک بات تو واضح ہوگئی تھی کہ وہ انگوٹھا چھاپ قصائی تھانیدار ہے اور یہ معمہ حل کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ شاید اس لئے نرملا کا دھیان سیدھا میری طرف گیا تھا اور اس نے مجھے جودھ پور سے لانے کے لئے اپنا منیجر بھیج دیا تھا۔ میں نے مطمئن لہجے میں انت سنگھ سے کہا۔

''سردار جی! چھوٹی بیگم نہ تو خود کہیں گئی ہے اور نہ اُسے حویلی کے اندر سے اغوا کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔''

انت سنگھ نے کہا ''بادشاہو میں سمجھا نہیں۔''

میں نے جواب دیا ''بادشاہو! سمجھنے کے لئے تھوڑا سا وقت چاہئے۔'' (حالانکہ مجھے ''وقت'' کی جگہ دماغ کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا)

وہ احتجاجی لہجے میں بولا ''انسپکٹر نواز! وہ بندا اقبال کر رہا ہے۔''

میں نے کہا ''اقبال کو چھوڑو۔ تم تھوڑی سی پھینٹی لگاؤ گے تو آدھا شہر اقبال کرنے لگے گا۔ میرے خیال میں یہ کسی باچے شاچے کا کام نہیں۔۔۔۔ آؤ میں تمہیں اس بندے تک لے جاؤں جو ہمیں اس بارے میں کچھ بتا سکتا ہے۔''

انت سنگھ بڑی مایوسی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں بار بار اس کے جوش و خروش کو ٹھنڈا کرنے کا سبب بن رہا تھا۔ اسے سمجھا بجھا کر میں نے اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر لیا۔ حویلی میں گمشدہ بگھی کے علاوہ دو شاندار تانگے بھی موجود تھے۔ ہم نے ان میں سے ایک تانگہ لیا اور تحصیل اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے انت سنگھ کے اے ایس آئی کو ہدایت کر دی کہ وہ حویلی میں رہے اور مشتبہ افراد سے پوچھ گچھ جاری رکھے۔

حویلی سے تحصیل اسپتال کا فاصلہ قریباً تین میل تھا۔ ہم دوپہر سے تھوڑی دیر بعد روانہ ہوئے تھے۔ لیکن راستے میں تانگے کا دُرّہ ٹوٹ گیا۔ آخر حویلی سے ایک دوسرا تانگہ منگوانا پڑا۔ اسی چکر میں اسپتال پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ میں نے سیدھے اُس کمرے کا رُخ کیا جہاں دو روز پہلے بدمزاج ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی تھی۔ خوش قسمتی سے وہ اپنے کمرے میں ہی تھا۔ سانولے رنگ اور موٹے کولہوں والی ایک نرس میز پر چڑھی بیٹھی تھی اور ڈاکٹر اس سے باتیں کر رہا تھا۔

میں تو آج بھی سادہ لباس میں تھا لیکن باوردی انت سنگھ کو دیکھ کر ڈاکٹر ذرا گڑبڑا گیا۔ انت سنگھ نے نرس کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ نرس نے پہلے تو اس توہین آمیز انداز پر احتجاج کرنا چاہا مگر پھر ارادہ بدل کر کولہے مٹکاتی ہوئی کھسک گئی۔ میں نے کمرے کی کنڈی اندر سے بند کر دی۔ میرے جارحانہ انداز نے ڈاکٹر کو بوکھلا دیا۔

''کیا بات ہے جی، آپ کچھ پریشان نظر آتے ہیں۔'' اس نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے پوچھا۔ پھر اس نے بڑے غور سے میرا چہرہ دیکھا۔ اس کی یادداشت اچھی تھی۔ معمولی کوشش کے بعد وہ مجھے پہچان گیا۔ اس نے اپنی انگلی میری طرف اٹھائی اور کالے ہونٹ پھڑکا کر بولا۔

''تم۔۔۔۔۔تم تو پرسوں رات۔۔۔۔''

''ہاں پرسوں رات میرے پیٹ میں درد تھا'' میں نے اس کی بات کاٹی ''اور اب تم تسلی سے کرسی پر بیٹھ کر میرے چند سوالوں کا جواب دے دو۔ میں تمہارا ''قیمتی'' وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔''

ایکا ایکی ڈاکٹر کو اندازہ ہوگیا کہ میں وہ نہیں جو وہ مجھے سمجھتا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں خوف اُمڈ آیا۔

☆☆☆

ٹھیک ایک گھنٹے بعد جب ہم اس کمرے سے روانہ ہونے والے تھے کمرے کا نقشہ مکمل طور پر بدل چکا تھا اور کمرے پر ہی بس نہیں ڈاکٹر کے مزاج شریف پر بھی بڑے اچھے اثرات مرتب ہو چکے تھے۔ وہ ایک لنگڑی کرسی پر نڈھال سا پڑا تھا، ٹائی کھل چکی تھی قمیص کے بٹن ٹوٹ چکے تھے۔ دونوں رخساروں پر انت سنگھ کی بھاری انگلیوں کے نشان تھے۔ اور نیچے والا ہونٹ جو کچھ زیادہ ہی کالا تھا پھٹ کر سرخرو ہو چکا تھا۔ کچھ یہی حال کمرے کا بھی تھا۔ یہ ساری ''تبدیلیاں'' انت سنگھ کی کوشش سے رونما ہوئی تھیں۔ ان تبدیلیوں سے ''خوش'' ہو کر ڈاکٹر نے ہمارے ساتھ بے پناہ تعاون کیا تھا۔ اور وہ باتیں بھی بک دی تھیں جو ہم اس سے بکوانا نہیں چاہتے تھے۔

ڈاکٹر کا اصل نام نجیب دیو تھا۔ اس کی ڈگری بھی کچھ مشکوک سی تھی، بہر حال ہمیں ان

باتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہماری غرض ان باتوں سے تھی جو سنجے نے نرملا دیوی کے بار ے
میں بتائیں۔ یہ بے حد سنسنی خیز انکشاف تھے۔ان انکشافات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔
''ڈاکٹر سنجے کا نرملا دیوی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ اُس کا تعلق واسطہ گساجن نا
ایک طالب علم لیڈر سے تھا اور گساجن کا تعلق نرملا دیوی سے تھا۔ گساجن کا تعلق نرملا دیوی
کیا تھا اور یہ تعلق کیسے پیدا ہوا؟ اس کا جواب آگرہ یونیورسٹی سے ملتا ہے گساجن اس تعلیم
ادارے کا سب سے اہم بدنام لڑکا تھا اور نرملا بھی یہیں پڑھتی تھی۔ بظاہر گساجن اور نرملا کی مڈ
بھیڑ نہیں ہوئی نہ ہی کوئی ایسا واقعہ ہوا جس سے شبہ ہوتا کہ گساجن نرملا سے تعلق پیدا کرنا چا
ہے لیکن اندر خانے بات کچھ اور تھی۔ من موہنی صورت والی نرملا گساجن کی شکاری نگاہوں
نشانے پر آچکی تھی۔ وہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو گساجن کب کا اسے کھا پی کر ہضم کر چکا ہوتا لیکن
ہر طرح اس کے لئے لوہے کا چنا تھی۔ ایک تو وہ کسی شہدے کو لفٹ ہی نہیں کراتی تھی، دوسر
ایک باا ثر خاندان کی فرد تھی۔ گساجن اسے دیکھ کر رال ٹپکا سکتا تھا لیکن اس پر اپنے دانت نہ
آزما سکتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر جلتا اور سلگتا رہتا تھا۔ انہی دنوں وہ ایک بینک ڈکیتی کے الزام
گرفتار ہو کر جیل چلا گیا۔ اس کے جیل جانے سے نرملا کی طرح اور بھی کسی شریف لڑکیوں
سکھ کا سانس لیا ہوگا۔

جیل جانے کے بعد گساجن جو ایک کچا پکا غنڈا تھا صحیح بدمعاش بن کر اُبھرا۔ جیل کے ا
ہی اس نے ایک چھوٹا سا گروہ بھی بنا لیا۔۔۔۔ چھ مہینے پہلے گساجن جیل سے رہا ہوا تھا اور
روز سے وہ ہاتھ دھو کر نرملا دیوی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ اب تک گڑھی کے کئی چکر لگا چکا تھا
ایک سے زائد بار نرملا سے ملاقات کرنے میں کامیاب رہا تھا۔۔۔۔۔ چند ہفتے پہلے حویلی
اندر سے جو آدمی پکڑے گئے تھے وہ بھی گساجن کے ساتھی تھے۔ فرار ہو جانے والا تیسرا شخ
گساجن خود تھا۔ وہ نرملا پر اپنی دھاک بٹھانے کے لئے اس سے ملنے حویلی کے اندر چلا
تھا۔ چوکیداروں کو بروقت پتہ چل گیا اور یوں اس کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔۔۔۔۔ ہماری تفت
کے دوران ڈاکٹر نے جو سب سے سنسنی خیز انکشاف کیا وہ یہ تھا کہ اب نرملا دیوی بھی گسا
کے دباؤ میں آ چکی تھی، وہ رقم دے کر یا کسی بھی طرح گساجن سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی تھی
روز پہلے رات کو جب وہ یہاں آئی تھی تو گساجن سے بات چیت کرنے کے لئے آئی تھ

گساجن نے اسے اسپتال میں ڈاکٹر سنجے کے کمرے میں وقت دے رکھا تھا۔ لیکن وہ پروگرام کے مطابق یہاں نہیں آیا۔ دراصل اسے شبہ تھا کہ نرملا اپنے ساتھ پولیس لگا لائے گی۔ نرملا اپنی ملازمہ اور بگھی بان کے ساتھ یہاں آئی اور بیٹھ بیٹھ کر واپس چلی گئی۔ اگلے روز گساجن ڈاکٹر سنجے سے ملا۔ اس نے سنجے سے کہا کہ وہ آج رات پھر آئے گی، اور آج رات سارا معاملہ نبٹ جائے گا۔ پروگرام کے مطابق گساجن کل رات نو بجے ہی اسپتال میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ دو مسلح ساتھی بھی لے کر آیا تھا جو اسپتال کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دس بجے کے قریب تیز آندھی چلنا شروع ہوگئی۔ ہر شے گرد و غبار سے اٹ گئی۔ سنجے نے گساجن سے کہا۔

''گساجن صاحب! موسم خراب ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے اب انتظار فضول ہے وہ نہیں آئے گی۔''

گساجن نے جواب میں کہا'' پیارے! وہ آئے گی، اسے آنا ہی پڑے گا، وہ لوہے کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ جتنا مرضی پھڑک لے مگر بچ نہیں سکتی۔''

گساجن کی باتوں سے ڈاکٹر سنجے نے اندازہ لگایا کہ وہ نرملا کو کسی طریقے سے بلیک میل کر رہا ہے۔ بہر حال اس نے گساجن کو زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی، ان دونوں میں زیادہ بے تکلفی نہیں تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ گساجن سے خوف کھاتا تھا۔ کل رات گساجن اور اس کے ساتھی قریباً گیارہ بجے تک نرملا کا انتظار کرتے رہے، آخر گساجن ڈاکٹر کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو چھت سے بلایا اور وہ تینوں اپنی جیپ میں بیٹھ کر گڑھی کی طرف روانہ ہوگئے۔ گساجن کو پورا یقین تھا کہ نرملا اسے ملنے کے لئے حویلی سے نکلی ہوگی اور راستے میں کسی وجہ سے رک گئی ہوگی۔ عین ممکن تھا کہ خراب راستے میں بگھی ہی کہیں پھنس گئی ہو۔ وہ تینوں اسپتال سے روانہ ہوگئے تو ڈاکٹر سنجے لمبی تان کر سو گیا۔ وہ صبح دس بجے تک سویا رہا۔ بیدار ہونے پر اسے اطلاع ملی کہ حویلی کی چھوٹی بیگم اپنے ملازموں اور بگھی سمیت غائب ہے۔

یہ تو تھا ڈاکٹر سنجے کا بیان جو اس نے انت سنگھ سے پھینٹی کھانے کے بعد دیا۔ اس بیان کی روشنی میں بہت کچھ واضح ہوگیا تھا لیکن اس کے ساتھ کئی نئے سوال بھی پیدا ہوگئے تھے۔ مثلاً یہ کہ نرملا دیوی ایک غنڈے کے ہاتھوں کیوں بلیک میل ہو رہی ہے۔ کیا اس کی کوئی کمزوری

گسا جن کے ہاتھ آ چکی ہے یا وہ خواہ مخواہ کی بدنامی سے بچنا چاہتی ہے۔ وہ گسا جن سے کیا بات چیت کرنا چاہتی تھی اور اس بات چیت کے لئے اس نے اتنی رات گئے گھر سے باہر نکلنے کا خطرہ کیوں مول لیا؟ پھر جب وہ گھر سے باہر نکل ہی آئی تھی تو وقت پر اسپتال میں کیوں نہ پہنچ سکی؟ یہ سارے سوال اہم تھے لیکن ان سب سے اہم سوال یہ تھا کہ نرملا اس وقت کہاں ہے؟ ڈاکٹر سنجے کے کمرے سے نکلنے سے پہلے ہمیں اس سوال کا جواب درکار تھا۔ میں نے نیچے جھک کر سنجے کے بال مٹھی میں جکڑے اور اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے کہا۔

''دیکھو سنجے! تمہارے ساتھ بہت ہو چکی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں تھانے لے جانا پڑے اور وہاں تم انت سنگھ کا اصل روپ دیکھو۔ بہتر یہی ہے کہ اب تم ہمیں گسا جن کے ٹھکانے سے آگاہ کردو۔''

سنجے صحیح معنوں میں ڈنڈے کا یار تھا، شروع میں جب ہم نے اس سے گسا جن کا پتہ پوچھا تھا تو وہ بالکل انجان بنا رہا تھا مگر اب اس نے یہ پتہ فرفر بتا دیا۔ اس کی معلومات کے مطابق گسا جن اجمیر کے ایک مضافاتی گاؤں میں قیام پذیر تھا۔

☆☆☆

گڑھی سے اجمیر شہر کا فاصلہ قریباً نوے میل ہے، ہمیں گسا جن کے ٹھکانے تک پہنچنے کے لئے ساٹھ ستر میل کا سفر کرنا تھا۔ انت سنگھ کا خیال تھا کہ اب گڑھی واپس جا کر آرام کیا جائے اور صبح تازہ دم ہو کر نرملا کے کھوج میں نکلا جائے۔ بلال شاہ بھی لمبی لمبی انگڑائیاں اور جمائیاں لے کر اپنی نیت کا اظہار کر رہا تھا، مگر میں یہ قیمتی وقت کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ وقت جو ہمارے لئے زیادہ اہم نہیں تھا کسی کے لئے بہت اہم ہو۔ ڈوبنے والے کے لئے ایک ایک لمحے کی قیمت ہوتی ہے جبکہ کنارے پر سونے والا گھنٹوں بے خبر سویا رہتا ہے۔ میں نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ ہم ابھی اور اسی وقت گسا جن کی تلاش میں روانہ ہوں گے۔ میں نے سنجے سے کہا کہ اسے ہمارے ساتھ چلنا ہوگا مگر ساتھ ہی یہ تسلی بھی دے دی کہ اگر اس نے درست معلومات فراہم کی ہیں تو اس کیس کی وجہ سے اس کے نام پر کوئی حرف نہیں آئے گا (اگر ٹھنڈے دماغ سے سوچا جاتا تو اس معاملے میں سنجے کا گناہ اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ گسا جن کی طاقت اور غنڈہ گردی سے خوف کھا گیا تھا اور اس نے گسا جن کو اجازت دے دی

تھی کہ وہ نرملا کو بلیک میل کرنے کے لئے اس کے کمرے کو استعمال کرے۔ دوسرے لفظوں میں وہ گسا جن کے دبدبے میں آ کر اس کا آلہ کار بن گیا تھا)

انت سنگھ نے تو اتنی رات گئے میرے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اسے تھانے میں کئی بھولے بسرے کام یاد آ گئے تھے۔ بلال شاہ بھی اوپر نیچے ہو رہا تھا مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ انکار کر دیتا۔ ہم نے انت سنگھ کے دو ہیڈ کانسٹیبلان کو ساتھ لیا اور اسپتال کی طرف ایک ویگن نما گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ اسپتال کی طرح یہ گاڑی بھی لاجواب تھی۔ تاہم اگر اس سے نئی نویلی دلہن کی طرح پیار محبت کا سلوک کیا جاتا تو وہ نیم جان ہونے کے باوجود ہمیں منزل تک پہنچا سکتی تھی۔ اجمیر کی طرف روانہ ہونے سے پہلے مجھے دو قیدیوں کا خیال آیا جو چند ہفتے پہلے نرملا کی حویلی سے گرفتار ہوئے تھے، اور جن کے بارے ڈاکٹر نے اب بتایا تھا کہ وہ گسا جن کے ساتھی تھے۔ یقینی بات تھی کہ یہ دونوں افراد انت سنگھ کے تھانے میں پہنچائے گئے ہوں گے۔ اگر وہ اس وقت بھی انت سنگھ کی حوالات میں تھے تو ان سے بہت مدد لی جا سکتی تھی۔ میں نے انت سنگھ سے ان دونوں حوالاتیوں کے بارے پوچھا تو اس کا منہ لٹک گیا۔

کہنے لگا ''بادشاہ زادیو! مجھے کیا پتہ تھا وہ اتنے خاص الخاص بندے ہیں۔ نہیں تو میں ان کی حفاجت کا خاص الخاص انتظام کرتا۔ وہ کچی حوالات میں تھے۔ ایک رات کھڑکی توڑ کر بھاگ گئے۔ میں نے بڑا تلاش کرایا پر نہیں ملے۔ پھر میرے دماگ میں آیا کہ چلو چور ہی تھے نا آج نہیں تو کل دوبارہ پکڑے جائیں گے۔''

انت سنگھ نے اپنی صفائی پیش کر دی لیکن میں جانتا تھا وہ اتنا الو نہیں جتنا ظاہر کر رہا ہے۔ یقینی بات تھی کہ اس نے کسی سے رشوت کھا کر حوالاتیوں کو چھوڑ دیا تھا۔

بہرحال انت سنگھ اور اس کی تھانیداری پر دو حرف بھیج کر میں ڈاکٹر سنجے کے ساتھ اجمیر جانے والی سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب یہ بات میرے ذہن میں بالکل صاف تھی کہ پرسوں رات کی طرح کل رات بھی نرملا، بیمار ملازمہ کے بھیس میں حویلی سے نکلی تھی اور ڈاکٹر سنجے کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ لیکن یا تو وہ دیر سے روانہ ہوئی تھی یا آندھی کی وجہ سے راستے میں کہیں رک گئی تھی لہٰذا وقت پر گسا جن تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ پھر گسا جن اسپتال سے نکل پڑا تھا۔ نرملا سے گسا جن کی ملاقات راستے

میں کہیں ہوئی تھی اور اس کے بعد سے نرملا اور اس کے دونوں ملازمین کا کچھ پتہ نہیں تھا۔

ستر میل کا سفر ہم نے قریباً چھ گھنٹوں میں طے کیا اور رات دو بجے اجمیر کے اُس مضافاتی گاؤں میں پہنچ گئے جہاں گساجن کا ٹھکانہ بتایا جاتا تھا۔ آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک سرد ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔ رات کے سناٹے میں ویگن کی گھر رگھر دور تک گونج رہی تھی۔ راستے کی دونوں اطراف جوار اور مکئی کے کھیت تھے۔ کہیں کہیں کسانوں کے جھونپڑوں میں روشنی دکھائی دیتی تھی۔ گاؤں ابھی کافی فاصلے پر تھا کہ ڈاکٹر سنجے نے ہمیں ویگن روکنے کو کہا میرے اشارے پر ڈرائیور نے ویگن روک کر انجن بند کر دیا اور بتیاں بجھا دیں۔ تاروں کی مدھم روشنی میں ایک جانب قبروں کے سفید سفید کتبے نظر آ رہے تھے۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک وسیع قبرستان ہے۔ اس قبرستان کے آخری سرے پر دو مکانوں کے ہیولے تھے مکانوں کا درمیانی فاصلہ چالیس پچاس فٹ کے قریب تھا ڈاکٹر سنجے اس سے پہلے یہاں آیا تھا لہٰذا اس نے یہ بات قیافے سے کہی تھی۔

دونوں کانسٹیبلوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ میرے پاس 38 بور کا ریوالور تھا۔ بلال شاہ بھی ایک دیسی پستول سے مسلح تھا۔ ہم نے ڈرائیور اور ڈاکٹر سنجے کو تو وہیں گاڑی میں چھوڑا اور خود محتاط طریقے سے ان مکانوں کی طرف بڑھے۔

قریب پہنچنے پر اندازہ ہوا کہ پہلا مکان دراصل ایک ٹوٹا پھوٹا مزار ہے۔ مزار کے گرد احاطہ اور چند کمرے تھے۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ یہ مزار ایک طرح سے قبرستان کا ہی حصہ تھا۔ دوسرا مکان کچھ مشکوک نظر آیا۔ دیواریں خاصی اونچی تھیں۔ مکان کی شکل و صورت دیکھ کر قیاس ہوتا تھا یہ کسی زمیندار کا گودام ہے۔ اس گودام کا ایک حصہ بارشوں سے منہدم ہو چکا تھا۔ بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے خود اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے دیوار پھاندنا ضروری تھا۔ بلال شاہ نے نیچے بیٹھ کر مجھے کندھوں پر اٹھایا اور میں دیوار چڑھ کر دوسری طرف اتر گیا۔ اندر مکمل تاریکی تھی۔ برآمدے میں کوئی شخص چارپائی پر سو رہا تھا۔ اس کے خراٹے کافی بلند تھے۔ میں بہ آہستگی اس کے سرہانے پہنچا۔ جھک کر غور سے دیکھا اس نے لحاف اوڑھ رکھا تھا اور منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ اس کی چارپائی کے پاس دیوار کے ساتھ ایک موٹی لاٹھی پڑی تھی۔ لاٹھی کے ایک سرے پر چھری چڑھی ہوئی تھی۔ مجھے یقین

محسوس ہونے لگا کہ ہم صحیح مقام پر آ گئے ہیں۔ سب سے پہلے تو میں نے خطرناک لاٹھی ایک تاریک گوشے میں چھپائی پھر صحن میں جا کر دروازے کی کنڈی اندر سے گرادی۔ بلال شاہ اور دونوں کانسٹیبل بھی اندر آ گئے۔ اب میری آنکھیں مکان کی تاریکی میں اچھی طرح دیکھ رہی تھیں۔ میں بہ آہستگی چلتا اندرونی حصے میں پہنچا۔ یہاں ایک کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی دکھائی دی۔ غالباً لالٹین کو چارپائی کے نیچے گھسا دیا تھا۔ اس کمرے کو بھی اندر سے کنڈی لگی تھی۔ تاہم میں نے ایک کھڑکی پر دباؤ ڈالا تو وہ معمولی آواز سے کھل گئی۔ کمرے میں دو ہٹے کٹے افراد دو چارپائیوں پر لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ ایک شخص کے تکیے کے نیچے سیاہ پستول کا دستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ گولیوں والی پیٹی پائے سے لٹکی ہوئی تھی۔ دیوار پر دو پتلونیں اور ایک جرسی لٹکی ہوئی تھی۔ کچے فرش پر مونگ پھلی کے چھلکے تھے، سگریٹ کے ٹوٹے تھے اور شراب کی خالی بوتل لڑھکی ہوئی تھی۔ میں نے یہ سارا منظر چند ساعتوں کے اندر دیکھا اور پھر کھڑکی سے کود کر اندر پہنچ گیا۔ سب سے پہلے میں نے کمرے کی کنڈی کھولی پھر دبے پاؤں اس ریوالور کی طرف بڑھا جو تکیے کے نیچے سے جھانک رہا تھا۔ لگتا تھا ان لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں کہ کوئی یہاں پہنچ سکتا ہے، وہ بالکل بےفکر ہو کر سو رہے تھے۔ میں نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور دوسرے ہاتھ سے تکیے والا ریوالور نکالنا چاہا، لیکن اب بےخبری کی ''انتہا'' ہو چکی تھی۔ تکیے کی جنبش سے اچانک سویا ہوا شخص جاگ گیا۔ اس نے بےانتہا پھرتی سے میرا بازو تھاما۔ ریوالور میرے اسی ہاتھ میں تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے خوفناک چنگھاڑ نکلی۔

''بھورے۔۔۔۔۔۔'' بھورا غالباً اس کے ساتھی کا نام تھا۔ یکایک کمرے میں کہرام مچ گیا۔ جونہی ساتھ والی چارپائی سے بھورا ہڑبڑا کر اٹھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے کڑک کر اسے خبردار کیا اور تھری نٹ کی نالی اس کی کھوپڑی سے لگا دی۔ وہ شخص جس نے میرے ریوالور پر ہاتھ ڈالا تھا کچھ زیادہ ہی پھرتیلا نکلا۔ اس نے اپنا لحاف میرے اوپر پھینکا اور بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر کانسٹیبل کی صورت میں ایک فرشتہ اس کے سر پر بھی کھڑا تھا۔ اس فرشتے نے اپنی رائفل کا کندا گھما کر بھاگنے والے کی گردن پر مارا۔ یہ ایک زوردار ضرب تھی، وہ شخص اُچھل کر دروازے کے پاس گرا۔ میں نے ایک ٹھوکر اس کی پسلیوں میں ماری اور دو ہوائی فائر کر کے اسے سمجھا دیا کہ ہم نے بڑے پکے ہاتھ ڈالے ہیں۔ وہ کوئی بدمعاشی دکھانے کی کوشش نہ کرے

اب صرف تیسرا شخص تھا جو باہر برآمدے میں سو رہا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ غیر مسلح تھا اور میں بلال شاہ جیسے صحت مند رکھوالے کو اس کے سرہانے چھوڑ آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جونہی ہنگامہ شروع ہوا ہوگا بلال شاہ نے اپنے شکار کو جن جپھے میں جکڑ لیا ہوگا اور ایسے جکڑا ہوگا جیسے جکڑنے کا حق ہوتا ہے۔ میرا اندازہ ''ایک سو ایک فی صد'' درست نکلا جب میں کمرے سے باہر آیا تو بالکل وہی منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا جو میں سوچ رہا تھا۔ ایک درمیانی جسامت کا شہری لڑکا بلال شاہ کی گرفت میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ بلال شاہ نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا ''دیکھو خان صاحب! میں کسکن وی نہیں دتا'' یعنی دیکھو میں نے ہلنے بھی نہیں دیا۔ دفعتاً مجھے اندرونی کمرے سے کسی لڑکے کے رونے کی آوازیں آئیں۔ یہ دبی دبی آوازیں اُسی چارپائی سے آ رہی تھیں جہاں سے بھورا اٹھا تھا۔ لحاف نیچے ابھی تک کوئی موجود تھا اور ہذیانی انداز میں آہ و بکا کر رہا تھا۔ میں نے چارپائی کے نیچے سے لالٹین نکالی اور جلدی سے لحاف کے پاس آیا۔ لحاف اٹھا کر دیکھا تو آنکھیں کھلی رہ گئیں یہ کوئی لڑکی نہیں تھی۔ دس بارہ سالہ لڑکا تھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا اور چیختا چلا رہا تھا ''دیدی دیدی ۔۔۔۔۔۔ بچاؤ ۔۔۔۔۔۔ بچاؤ'' میں نے لالٹین کی روشنی میں غور سے لڑکے کے خدوخال دیکھے۔ شکل کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ اچانک میرے ذہن نے پکا کہا کہ یہ لڑکا نرملا کا چھوٹا بھائی ہے وہی بھائی جس کے بارے نرملا نے بتایا تھا کہ وہ آگرہ ایک انگریزی اسکول میں پڑھتا ہے۔

☆☆☆

ہم نے اس گودام نما مکان کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن نرملا، بشیراں یا نکھی بان کا کوئی س نہیں ملا۔ پکڑے جانے والے تینوں افراد میں سے کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ گسا ہے یا گسا جن نام کے کسی شخص سے اس کا کوئی تعلق رہا ہے۔ ان نہ ماننے والوں کا علاج ہمارے پاس موجود تھا۔ میں نے بلال شاہ کو بھیجا اور وہ گاڑی میں سے ڈاکٹر سنجے کو لے سنجے خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ کچھ یہی کیفیت مکان کے تینوں مکینوں کی اسے دیکھ کر ہوئی۔ میں سرد لہجے میں اس سے دریافت کیا کہ یہ تینوں کون ہیں؟ اس نے فوراً ایک شخص کی طرف انگلی اٹھائی اور بولا۔

''یہ گسا جن ہے۔ یہ اس کا کلاس فیلو بھورا اور یہ کرشن ہے۔''

مجھے پہلے ہی امید تھی کہ گسا جن ان تینوں میں سے کوئی ہوگا۔ سنجے نے جس کی طرف اشارہ کیا تھا وہ گول سرخ چہرے والا ایک سخت گیر نوجوان تھا۔ اُس نے پتلون اور بنیان پہن رکھی تھی۔ سینہ اور بازو بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اسی شخص نے مجھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت وہ فرش پر اوندھا پڑا ہائے ہائے کر رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا کانسٹیبل کی زوردار ضرب سے اس کی گردن کی ہڈی ترخ گئی تھی۔

وہ رات ہم نے اسی تنہا مکان میں گزاری۔ ہم نے جن تین نوجوانوں کو پکڑا تھا ان میں سے ایک مقامی گاؤں کے چوہدری کا لڑکا تھا۔ اسی نے گسا جن اور عقیل کو مہمان ٹھہرایا ہوا تھا۔ وہ تینوں کئی روز سے یہاں داد عیش دے رہے تھے۔ سب سے پہلے تو ہم نے لڑکے کو چپ کرانے کی کوشش کی اور اسے تسلی تشفی دے کر بولنے پر آمادہ کیا۔ ایک علیحدہ کمرے میں گفتگو کرتے ہوئے لڑکے نے مجھے اپنا نام نریندر بتایا اور بتایا کہ وہ آگرہ کے فلاں سکول میں پڑھتا ہے۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ چار روز پہلے اُسے دس چھٹیاں ہوئی تھیں۔ حویلی کا پرانا ملازم راجپال جو اب منیجر بن چکا ہے اسے خود آگرے سے لینے آیا تھا۔ اتوار کی صبح وہ آگرے سے بذریعہ کار گڑھی کے لئے روانہ ہوئے لیکن راستے ہی میں گسا جن اور اُس کے ساتھیوں نے اسے اغوا کر لیا اور منیجر راجپال کو تھپڑ مارے۔ پھر منیجر کو نرملا دیوی کے لئے کوئی پیغام دے کر چھوڑ دیا۔ لڑکے نریندر نے بتایا کہ یہ تینوں آدمی اسے ڈراتے دھمکاتے رہتے تھے۔ اور جب وہ روتا تھا تو مارتے بھی تھے۔

لڑکے کا تفصیلی بیان لے کر میں نے گسا جن سے رجوع کیا۔ وہ حقیقتاً ایک خطرناک غنڈہ تھا۔ زخمی گردن کی وجہ سے وہ سخت عذاب میں تھا۔ اس کے باوجود اکڑ رہا تھا اور زبان کھولنے سے صاف انکاری تھا۔ میں نے اس کے ساتھی کرشن کی طرف توجہ دی پہلے تو اس نے اکڑ دکھائی لیکن پھر مار کھانے کے بعد راہِ راست پر آ گیا۔ اس نے اقرار کیا کہ لڑکے نریندر کے بیان میں کچھ باتیں درست ہیں۔ یعنی وہ اسے اغوا کر کے یہاں لائے ہیں اور پچھلے چار روز سے وہ ان کی تحویل میں ہے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ منیجر راجپال کو چھوٹی بیگم کے لئے پیغام دے کر حویلی بھیجا گیا تھا ۔۔۔۔ مگر کرشن نے یہ جرم قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ کل

رات انہوں نے چھوٹی بیگم کو اُس کے دو ملازموں سمیت اغوا کیا ہے یا ایسی کوئی کوشش کی ہے
میں نے زناٹے کے تھپڑ اُس کے منہ پر مارے۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ ا
تینوں بُری طرح پھنس چکے ہیں اور اب چھٹکارہ ممکن نہیں۔ دوسرے کمرے میں ان کا لیڈ
ہائے ہائے کی دردناک آوازیں نکال رہا تھا جس کی وجہ سے اُس کا رہا سہا حوصلہ بھی ختم ہو چ
تھا۔ وہ دبے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''انسپکٹر صاحب! یہ حقیقت ہے کہ ہم نے نریندر کو چھوٹی بیگم پر قابو پانے کے لیے ہی اغ
کیا تھا، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ گساجن کے ارادے چھوٹی بیگم کے بارے میں کچھ اچھے نہیں
تھے۔ وہ اُس کے حسن اور اس کی دولت دونوں پر نظر رکھتا تھا لیکن میں بھگوان کو گواہ بنا کر سچ کہ
رہا ہوں کہ کل رات ہم نے چھوٹی بیگم کی صورت تک نہیں دیکھی۔ ''عقیل بھورا'' لڑکے کے
پاس تھا اور میں گساجن کے ساتھ گڑھی گیا تھا۔ تحصیل اسپتال میں رات گیارہ بجے تک چھو
بیگم کا انتظار کرنے کے بعد ہم اُسے ڈھونڈنے کے لئے نکلے۔ ہمارا خیال تھا کہ آندھی کی و
سے وہ کہیں راستے میں رک گئی ہے۔ ہم نے اسے بہت ڈھونڈا لیکن کہیں سراغ نہیں ملا
راستے میں ایک دو کسانوں سے پتہ چلا کہ حویلی کی بگھی کچھ دیر پہلے اس راستے سے گزری تھی
ہم سمجھ گئے کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ لہٰذا واپس اسپتال بھی نہیں گئے اور جیپ کو پختہ سڑک پر ڈا
کر اجمیر کی طرف چلے آئے۔ صبح چھ بجے ہم یہاں پہنچ گئے۔ اس کے بعد سے ہم ا
چار دیواری میں ہیں۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی یہاں تک پہنچ سکتا ہے، لہٰذا بڑ
بے فکری سے سو رہے تھے۔

ہم نے صبح تک تینوں ملزموں سے پوچھ گچھ جاری رکھی لیکن مزید کچھ بھی معلوم نہ
ہو سکا۔ گردن کی چوٹ کے سبب گساجن کی حالت ابتر تھی۔ میری ہدایت پر ڈاکٹر سنجے نے ا
کی مالش وغیرہ کی اور روئی رکھ کر پٹی باندھ دی۔۔۔۔۔ میں گرد و پیش کا جائزہ لینے کے لئے
الصبح باہر نکلا۔ بلال شاہ بھی میرے ساتھ تھا۔ ابھی اندھیرا چھٹا نہیں تھا۔ مکان کے چارو
طرف سرکنڈے تھے اور اس سے آگے کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ صبح کی خنک ہوا میں
کنڈوں کے سفید سر جھوم رہے تھے اور چڑیوں کی چہکار دور دور تک گونج رہی تھی۔ جلد ہی مجھے
جیپ بھی نظر آ گئی جس پر گساجن وغیرہ نے گڑھی تک کا سفر طے کیا تھا۔ کیچڑ میں لتھڑی ہ

جیپ سرکنڈوں کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ دفعتاً میں چونک گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی سرکنڈوں
میں چھپا ہوا ہمیں دیکھ رہا ہے میں نے بلال شاہ پر اپنا اندیشہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ہم یونہی ادھر
ادھر گھومتے رہے۔ اچانک بلال شاہ کی نظر کسی شخص پر پڑ گئی۔ وہ سرکنڈوں میں گھورتا ہوا بلند
آواز سے بولا ''کون ہے'' جونہی اس نے آواز لگائی، کوئی اپنی جگہ سے اٹھ کر بھاگا اور سرکنڈوں
کے اندر سے گزر کر دور نکل گیا۔ بلال شاہ اور میں اس کے پیچھے لپکے لیکن وہ ہماری پہنچ سے دور جا
چکا تھا۔ چند ہی لمحے بعد گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں اور میں نے دیکھا کہ ایک ہیولا قبرستان کا
چکر کاٹ کر پختہ سڑک کی طرف جا رہا ہے۔ میں نے تیزی سے کہا۔

بلال شاہ! تم ایسا کرو کہ لڑکے کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ جہاں مرضی چلے جاؤ لیکن
یہاں نہیں رہنا۔ دونوں کانسٹیبلوں سے کہنا ملزموں پر کڑی نظر رکھیں۔ میں اس شخص کے پیچھے جا
رہا ہوں۔۔۔۔۔ یہ ہدایات دیتے دیتے میں مکان کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ یہاں دو صحت مند
گھوڑے میں نے رات ہی دیکھ لیے تھے۔ میں ایک گھوڑے پر سوار ہوا اور اُس جانب بڑھا
جہاں تھوڑی پہلے گھڑ سوار دکھائی دیا تھا۔ اب اندھیرا کافی حد تک چھٹ چکا تھا۔ میں مکان سے
دو سو گز دور ایک ٹیلے پر پہنچا تو گھڑ سوار نظر آ گیا۔ وہ قریباً ایک فرلانگ کی دوری پر تھا اور کھیتوں
کے درمیان کشادہ راستے پر گھوم رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے جاتا تو اس نے فوراً ہوشیار ہو جانا
تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر نتائج سے بے پرواہ ہو کر اپنا گھوڑا سرکنڈوں میں ڈال دیا۔ یہ
سرکنڈے ایک خشک نالے کے ساتھ ساتھ دور تک چلے گئے تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ نالہ
اس راستے کو قطع کرے گا جس پر گھڑ سوار روانہ ہوا ہے۔ جو راستہ میں نے اختیار کیا وہ بڑا دشوار
گزار تھا۔ قریباً ایک میل کے سفر میں گھوڑے کے ساتھ ساتھ ''میں بھی'' ہلکان ہو گیا۔۔۔۔۔
اتنی مشقت کے باوجود میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ گھڑ سوار کو دوبارہ پا سکوں گا عین ممکن تھا
کہ وہ راستے ہی میں کسی اور جانب مڑ گیا ہو۔ یہ بھی امکان تھا کہ وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی
مقررہ مقام سے آگے نکل جائے۔ اچانک ایک ایسا منظر نظر آیا۔ جس کا میں نے تصور بھی نہیں
کیا تھا۔ ابھی میں نے اپنا شارٹ کٹ مکمل کر کے بڑے راستے پر پہنچا بھی نہیں تھا کہ دائیں
جانب خبر کی گھنی جھاڑیوں سے ایک گھڑ سوار برآمد ہوا اور بڑے اطمینان سے میرا راستہ کاٹتا ہوا
خشک نالے میں اتر گیا۔ سرکنڈوں میں میں نے اس شخص کے لباس کی صرف ایک جھلک دیکھی

تھ
،راب میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ میں اس شخص کے پیچھے یہاں پہنچا ہوں۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھا وہ بڑی تسلی سے نالہ پار کر کے دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ میں نے بھی اپنے گھوڑے کی رفتار دھیمی کی اور انہیں کھینچ کر اسے نالے میں اتار دیا۔

دونوں ہانپتے ہوئے گھوڑے بڑے مزے سے آگے پیچھے چلتے ایک گاؤں کی حدود میں داخل ہوگئے۔ میں نے اپنے گھوڑے کو ہلکی سی ایڑ لگائی اور اس نے بھاگ کر اگلے گھوڑے سے اپنا درمیانی فاصلہ مزید کم کر لیا۔ اب ہمارے درمیان قریباً پچاس گز کی دوری تھی۔ میں اسی دیہاتی لباس میں تھا جو جھوک پال کے نمبردار ہنس مکھ نے مجھے لا کر دیا تھا۔ مجھے اپنے پہچانے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ گھڑسوار گاؤں کی حدود میں داخل ہوگیا اور پھر میں نے اسے ایک خوبصورت دومنزلہ حویلی میں داخل ہوتے دیکھا۔

☆☆☆

رات تاریک تھی۔ آج پھر راجستھانی جھکڑ چل رہے تھے۔ میں پچھلے بارہ گھنٹوں سے اس ''چھاپور'' نامی گاؤں میں گھوم رہا تھا۔ ایک مسافر کی حیثیت سے کسی نے مجھ پر شبہ نہیں کیا تھا۔ میں نے ایک دو دکانداروں سے مل کر کچھ معلومات بھی حاصل کی تھیں۔ گھڑسوار جس دو منزلہ حویلی میں داخل ہوا تھا وہ یہاں کے مکھیا کی تھی۔ مکھیا کا نام بھی مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ میں پچھلے بارہ گھنٹوں میں چار پانچ بار حویلی کے سامنے سے گزرا تھا اور ہر بار مجھے احساس ہوا تھا کہ حویلی کے اندر کوئی بے چینی سی پائی جاتی ہے۔ پریشان چہروں والے افراد اندر باہر آ جا رہے تھے۔ شام کے بعد حویلی میں کچھ لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ان کے گھوڑے حویلی سے باہر ہی کھڑے تھے۔ میں نے دیکھا تھا کہ اندر جانے والوں میں سے کئی افراد مسلح ہیں۔ معلوم نہیں حویلی کے اندر کیا کھچڑی پک رہی تھی۔ جوں جوں رات گہری ہو رہی تھی میرا اضطراب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ رہ رہ کر نرملا کا چہرہ نگاہوں میں گھومتا اور میرا دل پکار کر کہتا کہ وہ کسی سنگین مشکل میں پھنسی ہوئی ہے۔ نجانے کیوں مجھے بار بار یہ خیال آنے لگا تھا کہ اگر نرملا اور اس کے ملازمین گساجن کے ہاتھ نہیں لگے تو پھر وہ اس حویلی میں موجود ہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ حویلی اس کہانی میں کیسے گھس آئی ہے اور یہاں رہنے والے لوگ دراصل کون ہیں؟

اس وقت رات کے دس بجے تھے جب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ نرملا کو گم ہوئے

آج تیسری رات تھی۔ اجنبی لوگوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی لڑکی کے لئے یہ بہت۔۔۔۔ بہت لمبا عرصہ تھا۔۔۔۔ حویلی کے دروازے پر کوئی چوکیدار تو تھا نہیں۔ میں نے قمیص تھپتھپا کر ریوالور کی موجودگی کا اندازہ کیا اور دندناتا ہوا اندر گھس گیا۔ اندر اور بھی لوگ گھوم رہے تھے۔ فوری طور پر کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ میں ۔۔ اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے جو فقرے ڈھونڈ رکھے تھے وہ سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ کیونکہ میں حویلی کے اندرونی حصے تک پہنچ گیا اور کسی نے نہیں پوچھا کہ ''میاں کون ہو تم؟'' آنکھ بچا کر میں اوپر جانے والے زینوں پر آ گیا۔ بالائی منزل پر تاریکی تھی۔ صرف چند کمروں میں گیس لیمپ روشن تھے۔ چہل پہل بھی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک روشن کمرے کے سامنے سے گزرتے گزرتے میں ٹھٹھک گیا۔ اندر سے کسی مرد کے دھاڑنے کی آواز آ رہی تھی۔

''یہ تمہاری نہیں میری ذمے داری ہے اور میں یہ ذمے داری پوری کروں گا۔''

ایک عورت نے گھگھیا کر کہا'' بھگوان کے لئے۔۔۔۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ اسے کچھ ہو گیا تو۔۔۔۔۔ میں جیتے جی مر جاؤں گی۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ اندر سے آنے والی آواز نرملا کی تھی۔ میں اس آواز کو ہزاروں میں شناخت کر سکتا تھا۔

مرد نے گرج کر کہا'' کچھ بھی ہو جائے نرملا۔ ہمیں یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا، اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اگر ہے تو مجھے تو بتاؤ۔''

نرملا نے کہا،'' میں آپ کی بات تسلیم کرتی ہوں لیکن۔۔۔۔۔''

''لیکن کے بعد بے غیرتی کی سوچ شروع ہوتی ہے، مرد نے کڑک کر کہا'' اور کوئی پتی یہ بے غیرتی برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ ہم جا رہے ہیں۔ تم بھگوان سے ہماری کامیابی کی پرارتھنا کرو۔۔۔۔'' اس کے بعد بھاری قدموں کی آواز آئی۔ میں پہلے ہی ایک تاریک گوشے میں دبک چکا تھا۔ کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور ایک شخص لمبے ڈگ بھرتا ہوا برآمدے کی طرف نکل گیا۔ اس کا لباس گواہی دے رہا تھا کہ یہی وہ گھڑسوار ہے جس کا تعاقب کر کے میں یہاں پہنچا ہوں۔ اندر سے اب دبی دبی سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں کچھ دیر بے حرکت کھڑا سوچتا رہا، پھر کمرے کی طرف بڑھا۔ جانے والا شخص کمرے کو باہر سے

کنڈی لگا گیا تھا۔ میں نے کنڈی کھولی اور جلدی سے اندر چلا گیا۔ اندر گیس لیمپ جل رہا تھا۔ آراستہ کمرے کے وسط میں نرملا دیوی کھڑی رو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بُری طرح چونکی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

''آپ۔۔۔آپ یہاں؟''

وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے بولی۔

میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ عروسی جوڑے میں ملبوس تھی۔ ہاتھوں میں سونے کے وزنی کڑے، ماتھے پر جھومر اور ہونٹوں پر سرخی۔ رونے سے اس کی آنکھوں کا کاجل بہہ چکا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ چھوٹی بیگم صحیح معنوں میں ''بیگم'' بن چکی ہے اور ابھی جو شخص اس کمرے سے نکلا ہے وہ اس کا شوہر نامدار ہے۔ وہ شوہر جو ایک عرصے سے خاموش تھا اور اپنی محبوب بیوی کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ آخر بول پڑا تھا۔ اور ایسی دیہاتی آن بان سے بولا تھا کہ بولنے کا حق ادا ہو گیا تھا۔۔۔۔ نرملا نے بے قرار ہو کر میرا بازو تھام لیا۔ روتی اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی ''انسپکٹر نواز، بھگوان کے لیے انھیں روکیے۔ وہ کسی سے جھگڑا کرنے جا رہے ہیں۔ میرے بھائی کا جیون خطرے میں ہے۔ خدا کے لیے انہیں روک لیجیے۔''

میں اطمینان سے کھڑا رہا۔ وہ اور بے قرار ہو گئی، مجھے جھنجھوڑنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کی تڑپ، باپ کی محبت اور بڑی بہن کی پکار یکجا ہو گئی تھی۔ اس گھڑی وہ چوبیس سالہ دوشیزہ مجھے ذمے داریوں کے بوجھ تلے پسی نظر آئی اس کی نازک جان ہزار خانوں میں بٹی ہوئی تھی، اور وہ اپنی ناتوانی کم کرنے کے لیے کسی خانے سے بھی اپنی جان نکال نہیں سکتی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''گھبراؤ نہیں نرملا دیوی! تمہارے بھائی نریندر کو کچھ نہیں ہو گا۔ جہاں تمہارے سسرال والے جا رہے ہیں۔۔۔۔ وہاں اب نریندر نہیں ہے۔''

وہ حیرت کا بت بنی میری طرف دیکھتی چلی گئی۔۔۔۔ طوفانی جھکڑ حویلی کی بلند برجیوں سے ٹکرا رہے تھے، اور حویلی سے نکلنے والے گھوڑے گاؤں کی کسی گلی میں سرپٹ بھاگے چلے جا رہے تھے۔۔۔۔

☆☆☆

ان آخری سطروں کو پڑھ کر قارئین کہانی کی چند گمشدہ کڑیاں ملا لیں گے۔۔۔۔۔ یہ بتانے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ نرملا نے مجھے گساجن کے خوف سے گڑھی بلایا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ گساجن کی نظر اس کی عزت اور دولت پر ہے۔ اور وہ کسی بھی وقت ان دونوں چیزوں پر ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ لیکن مجھے حویلی میں بلانے کے بعد اسے ہمت نہیں ہوئی کہ وہ مجھے فوری طور پر اس حقیقت سے آگاہ کر سکے۔ اسے اب بھی امید تھی کہ شاید حالات سدھر جائیں لیکن اس دوران گساجن نے اس کھیل کی تُرپ کی چال چلی اور آگرے کے راستے میں نرملا کے اکلوتے بھائی نریندر کو اغوا کر لیا۔ اس واقعے نے نرملا کا سارا دم خم ختم کر دیا۔ وہ کسی طور اپنے بھائی کی جان کا رسک نہیں لے سکتی تھی، لہٰذا اس نے اچانک مجھ سے بے رخی اختیار کر لی اور فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے میں پولیس کو درمیان میں نہیں لائے گی۔۔۔۔ گساجن کے مطالبے پر جب وہ دوسری مرتبہ اس سے ملنے تحصیل اسپتال گئی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کیا واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اس کا پتی راج پانڈے جو ایک سمجھدار نوجوان تھا خاموشی سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا اور اپنی پتنی پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس رات پانڈے فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے آگے بڑھ کر نرملا کے قدم روکنے ہوں گے اور اسے تاریک گڑھوں میں گرنے سے بچانا ہو گا۔ وہ اب تک بہت برداشت کر چکا تھا اب اور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بھائی بہنوں کی محبت میں جکڑی ہوئی نرملا اس کی بات ہرگز نہیں مانے گی لہٰذا اس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ راستے میں نرملا کو روکا اور زبردستی اپنے ساتھ گاؤں لے گیا۔ یہ ایک طرح سے نرملا کی اچانک رخصتی تھی۔۔۔۔۔ اس نے نرملا سے کہا کہ وہ اس کی پتنی ہے صرف پتنی بن کر رہے، پتی کی ذمے داریاں اس پر چھوڑ دے۔ جب نرملا کی زبانی اسے نریندر والے واقعے کا پتہ چلا تو وہ غضب ناک ہو گیا۔ اس نے نرملا سے وعدہ کیا کہ وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی اس کے بھائی کو بچا لے گا۔۔۔۔ اس نے کمر سے اسلحہ لگایا اور حالات کا جائزہ لینے کے لیے گساجن کے ٹھکانے کی طرف چل دیا۔ بعد کے واقعات آپ جانتے ہی ہیں۔ اتفاق سے میری نگاہ پانڈے پر پڑ گئی اور میں اس کا پیچھا کرتا ہوا ''چھاپور'' پہنچ گیا۔

اغوا برائے تاوان کے تینوں بڑے ملزم گرفتار ہو چکے تھے ان کی نشاندہی پر آگرے سے کم از کم دس افراد مزید گرفتار کر لیے گئے۔ میں نے ڈاکٹر سنجے کو حسب وعدہ اس کیس سے

صاف نکال لیا۔ حویلی کی شاندار بگھی کے بارے لوگوں میں بہت چرچے تھے۔ یہ بگھی بھی بگھی
بان نذیر خان اور بشیراں سمیت نرملا کے سسرال سے برآمد ہوگئی۔ نرملا کے یہ دونوں ملازم وہاں
مہمانوں کی حیثیت سے مقیم تھے۔ ویسے بھی جب میاں بیوی راضی تھے تو قاضی نے کیا کرنا
تھا۔ دیکھا جائے تو اس رات راج پانڈے کی جرأت نے نرملا کو ان دیکھی مصیبتوں سے بچالیا
تھا۔ وہ گسا جن تک پہنچ جاتی تو نہ جانے اس کا کیا حال ہوتا۔ بلال شاہ، راج پانڈے کی مردانگی
پر بہت خوش تھا اور بتا رہا تھا کہ ایک دفعہ وہ بھی اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو اس طرح اٹھا کر چک
لالے سے خوشاب لے گیا تھا۔

جس روز میں گڑھی سے رخصت ہوا نرملا اور پانڈے مجھے ''سی آف'' کرنے کے لیے
موجود تھے۔ نرملا نے کہا ''میں آپ کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں۔''

میں نے کہا ''شکریہ تو آپ کئی روز پہلے ہی ادا کر چکی ہیں۔ یہ تو میں ہی ڈھیٹ تھا کہ پھر
بھی رخصت نہیں ہوا۔''

نرملا نے اشک بار ہو کر کہا۔ ''آپ رخصت ہو جاتے تو پھر۔۔۔۔'' اس سے آگے وہ
کچھ نہ کہہ سکی اور اپنے خوبصورت ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

☆

ہمسفر

وہ 22 دسمبر کی رات تھی۔ سال کی سرد ترین اور طویل ترین رات۔۔۔۔ ابھی نو بجے تھے
مگر یوں لگتا تھا کہ شام ہوئے ایک مدت گزر چکی ہے۔ ایک مدت گزر چکی ہے کہ ٹھٹھرا ہوا
سورج غروب ہو چکا ہے اور ایک یخ بستہ تاریکی نے نشیب و فراز کو ڈھانپ رکھا ہے۔ یہ جہلم
شہر کا بیرونی علاقہ تھا۔ شہر کی ایک نواحی بستی سے کچھ فاصلے پر اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ ان ٹیلوں
میں پیلی اینٹوں کا ایک کھنڈر نما مکان تھا۔ بس دو کمرے تھے۔ ایک کی چھت تو مکمل طور پر گر چکی
تھی، دوسرے کی چھت میں کافی بڑا شگاف تھا اور اس شگاف میں سے ٹوٹے ہوئے بالے اور
کڑیاں وغیرہ جھانکتی تھیں۔ اس شکستہ کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بوڑھا
صادق علی کمر پر ہاتھ رکھے ڈگمگاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ کچھ دیر کھانستا رہا پھر ایک کونے
میں بچھی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ بہت کمزور اور کسی حد تک بیمار نظر آتا تھا۔ اس کا دوست لالی اس
کے سامنے موجود تھا اور وہ بھی خاموش اور گم صم تھا۔

صادق علی نے اپنی خستہ حال قمیض کی جیب ٹٹولی اور ایک روپے کا سکہ نکال لیا۔ کچھ دیر
خالی خالی نظروں سے سکے کو دیکھتا رہا تب اس کے ہونٹوں پر ایک نحیف مسکراہٹ بکھر گئی۔
کھوئے ہوئے لہجے میں بولا ''لالی! یہ آخری روپیا رہ گیا ہے، اس کا تو کچھ بھی نہیں آئے گا۔
اگر آتا تو کل صبح کھانا لے آتا، آٹھ آنے کا تیرے لئے آٹھ آنے کا اپنے لئے۔''

آہ بھر کر صادق علی نے سکہ ایک طرف پھینک دیا۔ اور افسردہ لہجے میں بولا ''پیسے کی کوئی
قیمت نہیں رہ گئی یار! ایک وقت تھا کہ ایک روپے میں دو بندے رج کر روٹی کھا لیتے تھے۔ اب
روپے میں بچے کی چوسنے کی گولی آتی ہے، پتا نہیں کیا بنے گا اس دنیا کا۔''

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔بس مغموم نظروں سے سامنے بے در کے دروازے کو دیکھتا رہا۔اس دروازے میں سے گاہے گاہے ٹھنڈی ہوا کا سرکش جھونکا اندر گھس آتا تھا۔کل صادق علی نے کوشش کی تھی کہ اس دروازے میں گھاس پھونس سے بنا ہوا ایک چوکھٹا سافٹ کر دے لیکن پچھلے پہر چلنے والی تیز ہوا نے اس چوکھٹے میں کئی سوراخ کر دیے تھے۔

صادق علی نے پریشان لہجے میں کہا ''یار لالی! اب کیا ہوگا تو جانتا ہے میں اب پانچ دس روپے کی مزدوری بھی نہیں کر سکتا۔دو چار قدم تیزی سے اٹھاؤں تو سانس رکنے لگتا ہے۔اب تو درد کی وجہ سے کمر بھی بالکل تختہ بن کر رہ گئی ہے۔''

اس پر ایک بار پھر کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔پھٹی پرانی پگڑی جو اس نے سر پر لپیٹ رکھی تھی۔کھانسی کے جھٹکوں سے کھل کر اس کی جھولی میں گر پڑی۔وہ دمے کا مریض تھا۔کھانسی کے دورے کے بعد دوبارہ سنبھلنے میں دو تین منٹ لگ گئے۔وہ کراہتے ہوئے بولا ''یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں لالی کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے نہ پڑ جائیں۔ساری عمر یہ کام نہیں کیا۔رب سوہنا اب بھی اس ذلت سے بچائے رکھے۔''

لالی نے اثبات میں سر ہلایا۔وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔وہ ایک بے زبان گھوڑا تھا۔اس خستہ حال کمرے میں،اس سرد ترین رات میں،وہ اپنے مالک صادق علی ہی کی طرح مغموم اور آفت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

صادق علی خود کو سمیٹ کر بمشکل اپنی جگہ سے اٹھا۔سردی کی بڑھتی ہوئی شدت کو کم کرنے کے لئے اس نے تین اینٹوں کے درمیان خشک لکڑیاں ترتیب سے رکھیں اور آگ جلا دی۔دھوئیں میں اس کا سانس زیادہ پھولنے لگتا تھا مگر آگ جلانے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔وہ ہاتھ پھیلا کر آگ کے قریب بیٹھ گیا۔کچھ دیر خالی خالی نظروں سے لالی کو دیکھتا رہا پھر نحیف آواز میں بولا ''لالی،دل چاہتا ہے،آج تجھے سب کچھ بتا دوں۔کچھ بھی نہ چھپاؤں۔میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور شاید تیرے دل کا بھی'' لالی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔بالکل ایسے جیسے سب کچھ سمجھ رہا ہو۔ایک ایک لفظ سے آشنا ہو۔صادق علی مسکرایا ''لالی یار،جب تو اس طرح میری طرف دیکھتا ہے ناں،تو پتا ہے،مجھے کیا یاد آتا ہے۔مجھے وہ دن یاد آ جاتا ہے جب میں نے تجھے گجرات کی منڈی مویشیاں سے خریدا تھا۔ہماری وہ پہلی ملاقات آج سے کوئی پچیس

سال پہلے ہوئی تھی لیکن مجھے آج بھی وہ سب کچھ پہلے دن کی طرح یاد ہے۔تو نے لالی،ایسے ہی بھید بھری نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔مجھے یوں لگا تھا جیسے تیری نظر مجھ سے بات کر رہی ہے،اس کے علاوہ تو وہ سب کچھ سمجھ رہا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔تیرے اس طرح دیکھنے کے ڈھنگ نے تجھے اپنے تمام ساتھیوں سے جدا کر دیا تھا۔تو ان سب میں وکھرا دکھائی دیا تھا مجھے۔۔۔۔تجھ پر چڑھتی جوانی تھی،چمکیلے بال،صاف کمیت پنڈا،تگڑی مضبوط کاٹھی اور خوبصورت ٹانگیں۔میں نے پہلی نظر میں فیصلہ کر لیا تھا کہ تجھے خریدوں گا۔پھر پتا ہے،جب میں تجھے اپنے گھر لایا تھا تو سکینہ کتنا خوش ہوئی تھی۔اس کی آنکھوں میں خوشی ناچ اٹھی تھی۔کتنی ہی دیر تیرے پنڈے پر ہاتھ پھیرتی رہی تھی۔پھر اس نے فوراً ہی اپنی ایک چوڑی اتار کر میرے حوالے کر دی تھی اور کہا تھا ''آپ اتنے اچھے گھوڑے کے لئے اتنا ہی اچھا تانگا بھی بنوائیں۔

میں نے کہا تھا ''نہیں سکینو! تم چوڑی اپنے پاس ہی رکھو۔''

''نہیں جی،ایسا نہیں ہوگا'' وہ ناز سے بولی تھی ''ہمارا تانگا گھوڑا سب سے اچھا ہوگا۔راہ گیر نے پیدل بھی جانا ہوگا تو اس کا تانگے پر بیٹھنے کو دل چاہے گا اور پھر جی گہنے کا کیا ہوتا ہے۔اصل چیز تو روزگار ہوتا ہے۔روزگار ہو تو گہنا پھر سے بن جاتا ہے۔''

وہ ایسی ہی دانائی کی باتیں کیا کرتی تھی۔تجھے تو سب پتا ہے ناں۔پورے محلے کی عورتیں اس سے مشورے لیا کرتی تھیں۔بڑی بوڑھیوں میں بیٹھتی تھی تو مدبر لگتی تھی۔اور جوانوں میں بیٹھتی تھی تو سب سے بڑھ کر جوان اور شوخ نظر آتی تھی۔ہم دونوں ہی تجھے بہت چاہتے تھے۔تجھے بھی تو ایسے ہی لگا کرتا تھا ناں۔وہ پاس ہوتی تھی تو،تو سمجھتا تھا کہ اس سے زیادہ محبت تجھ سے اور کوئی نہیں کر سکتا۔میں پاس ہوتا تھا تو پھر تیری یہ سوچ میرے لئے ہوتی تھی۔وہ اکثر تجھے اپنے ہاتھ سے دانہ پٹھا ڈالتی تھی اور تو اور میرے منع کرنے کے باوجود کبھی کبھی تجھے کھریرا بھی کر دیا کرتی تھی۔اسے بڑا شوق تھا تیرے کام کرنے کا۔''

باتیں کرتے کرتے صادق علی کچھ سوچ کر مسکرا دیا۔چند لمحے ماضی کے دھندلکوں میں کھویا رہا پھر بولا ''سچ ہے یار! کبھی کبھی تو مجھے تجھ سے جلاپا ہونے لگتا تھا۔وہ کیا کہتے ہیں کہ رقابت محسوس ہونے لگتی تھی۔میں سوچتا تھا کہ وہ میرا اتنا خیال نہیں رکھتی جتنا تیرا رکھتی ہے۔کہتے ہیں،میں منہ بنا لیا کرتا تھا۔وہ بہت ہنستی تھی،ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی،کہتی

تھی ''بڑے بوڑھے سچ کہتے ہیں۔ اگر بچے نہ ہوں تو بھی عورت کو کم از کم ایک بچہ تو سنبھالنا ہی پڑتا ہے۔ اس کا خاوند ہی ساری عمر بچہ بنا رہتا ہے۔''

ہماری اولاد نہیں تھی لیکن ہمیں کبھی اس کی کمی ہی محسوس نہیں ہوئی۔ میرے تین چھوٹے بھائی ہی ہماری اولاد تھے۔ سکینہ نے کبھی بھی انہیں دیور نہیں سمجھا۔ ہمیشہ بیٹوں کی طرح ان کا خیال رکھا اور دیکھ بھال کی۔ میرے بعد تین بہنیں تھیں اور اس کے بعد اکبر پیدا ہوا تھا۔ اکبر مجھ سے کوئی بیس سال چھوٹا تھا پھر ارشد اور چھوٹے مٹھو میں دو دو سال کا فرق تھا۔ میری اور سکینہ کی کتنی خواہش تھی کہ ہم ان تینوں کو ان کے پاؤں پر کھڑا کر دیں۔ ہماری اس خواہش کو پورا کرنے میں لالی، تو نے بھی ہمارا پورا ساتھ دیا۔ مجھے ایک ایک بات یاد ہے لالی۔ میں کچھ بھی بھولا نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے تو بھی میرے ساتھ بھوکا پیاسا رہا ہے۔ تو نے بھی میرے ساتھ تپتی ہوئی دوپہروں اور ٹھٹھری ہوئی راتوں میں جہلم شہر کی سڑکیں ناپی ہیں۔ ہاں، مجھے سب یاد ہے لالی!''

صادق علی نے ایک گہری سانس لی۔ آگ میں کچھ مزید لکڑیاں جھونکیں اور بازو لمبا کر کے پیار سے لالی کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ تب ایک بار پھر وہ ماضی کی دھند میں کھو گیا۔ کھوئی کھوئی آواز میں بولا ''وہ دن بڑے کٹھن تھے لالی۔۔۔۔ پھر بھی کتنے سہانے تھے۔ ہم دونوں تھکن سے چور ہو کر گھر لوٹتے تھے لیکن سکینہ کی مسکراہٹ اور محبت بھری آواز ہماری تھکن کو ہوا کر دیتی تھی۔ وہ پہلے تجھے چارہ ڈالتی پھر میرے لئے کھانا لاتی۔ جب ہم دونوں کھا رہے ہوتے تو وہ ہم سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہتی۔ اس کی باتوں میں روکھی سوکھی بھی زردے پلاؤ کا مزہ دیتی تھی۔ ان دنوں اکبر، ارشد اور مٹھو بھی کتنے خوش باش اور بے پروا ہوا کرتے تھے۔ اکبر نے مجھ سے کوئی پیسا لینا ہوتا تو سکینہ سے کہلواتا۔ ارشد کو ضرورت ہوتی تو میری ٹانگیں دبانے بیٹھ جاتا اور مٹھو تو ایک آفت کا پرکالا تھا۔ سیدھا میری جیب میں ہاتھ ڈالتا تھا اور جو مانگتا تھا لے کر رہتا تھا۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ سب سے لاڈلا بھی تھا۔ سارے گھر میں اس کی وجہ سے طوفان آیا رہتا تھا۔ ہم دونوں کی خواہش تھی کہ اسے خوب پڑھائیں، لکھائیں گے۔ اللہ بخشے میرے والد کی بھی یہی آرزو تھی کہ مٹھو پڑھ لکھ کر افسر بنے۔ اکبر کو انہوں نے اپنی زندگی میں ہی خراد کے کام پر ڈال دیا تھا، ارشد درزی کی دکان پر کام کرتا تھا۔

ہم میاں بیوی نے دل ہی دل میں فیصلہ کر رکھا تھا کہ اکبر اور ارشد کو دبئی یا کویت وغیرہ

بھجوائیں گے۔ سکینہ کا ایک ماما رشید کویت گیا ہوا تھا۔ وہ اکثر اپنے مامے کو خط لکھواتی رہتی تھی کہ اس نے اکبر اور ارشد کو کویت بلوانا ہے۔ اور پھر تجھے وہ دن تو اچھی طرح یاد ہو گا لالی! جب سکینہ کے مامے کا خط آیا تھا اور اس نے لکھا تھا کہ دونوں لڑکوں کا کام بن گیا ہے۔ تجھے یاد ہے ناں کہ میں نے جوش میں آ کر سکینہ کو بازوؤں میں اٹھا لیا تھا۔ وہ شرم سے سرخ ہو گئی تھی اور دہائی دینے لگی تھی ''کیا کرتے ہو جی، جوان بچے ہیں، دیکھ لیں گے۔''

میں نے کہا تھا ''یہاں کوئی جوان بچہ نہیں ہے۔ صرف یہ میرا یار لالی ہے اور میں اس سے کچھ بھی نہیں چھپاتا۔ تیری اور میری ہر بات کا اسے پتا ہے۔''

وہ کچھ اور شرما گئی تھی۔ جیسے اس نے میری بات کو سچ مان لیا ہو۔ شرماتے ہوئے اس کے گال کتنے اچھے لگتے تھے اور آنکھوں میں گڈے گڈی کی پینگ نظر آنے لگتی تھی۔

پھر تجھے یاد ہے ناں لالی کہ اگلے ایک مہینے میں تجھے اور مجھے کتنی جان مارنی پڑی تھی۔ اکبر اور ارشد کے ویزوں کے لئے ہم نے بہت کچھ بیچ دیا تھا۔ کئی جگہ سے ادھار لیا تھا۔ پھر بھی پندرہ ہزار روپے کم پڑ رہے تھے۔ ہم دونوں نے اوور ٹائم لگانا شروع کر دیا تھا۔ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی راتوں میں ہم فلم کا آخری شو ٹوٹنے کا انتظار کیا کرتے تھے اور چند گھنٹے گھر میں آرام کر کے صبح سویرے پھر کام پر نکل جایا کرتے تھے۔ سچ کہتا ہوں لالی، مجھے یہی لگا کرتا تھا کہ تو ہم دونوں سے بھی زیادہ پریشان ہے۔ تجھے رات دن یہ فکر لگی رہتی ہے کہ پیسے جلد سے جلد اکٹھے ہو جائیں۔ سواری کی تلاش میں تو مجھ سے بھی زیادہ پریشان ہوتا تھا اور جب سواری ملتی تھی تو تیری چال میں عجیب سا جوش آ جاتا تھا۔ میں سب جانتا ہوں لالی، مجھ سے تیرا کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ تو ہمارے گھر کا فرد تھا اور وہی محسوس کرتا تھا جو ہم سب کرتے تھے۔

آخر ہماری کوششیں رنگ لائی تھیں اور ہم اکبر اور ارشد کو ایک ساتھ کویت بھیجنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ سکینہ ان دنوں کتنی خوش اور کتنی اداس تھی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ اس کے 'بیٹے'' اچھے روزگار پر لگ گئے تھے اور اداسی اس بات کی کہ وہ ہم سے دور ہو گئے تھے۔ مجھے یوں لگا کرتا تھا کہ اس کی ایک آنکھ خوش ہے اور دوسری اداس۔ آدھے چہرے پر دھوپ ہے اور آدھے پر چھاؤں۔ اس دھوپ چھاؤں میں وہ کتنی پیاری لگتی تھی''۔

لالی ہولے سے ہنہنایا۔ جیسے صادق علی کی بات کا جواب اثبات میں دے رہا ہو۔ صادق

علی مسکرا دیا۔ ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔ بے در کی کھڑکی اور دروازے سے گاہے گاہے ہوا کے تیز جھونکے اندر گھس آتے اور شرارتی بھتنوں کی طرح اودھم مچا دیتے۔ ایسے میں تین اینٹوں کے درمیان بھڑکنے والی آگ پھڑ پھڑانے لگتی اور کمرے کی خوش گوار حرارت دم دبا کر بھاگ جاتی۔ یہ 22 دسمبر کی رات تھی۔ بے حد طویل اور بے حد سرد۔ خشک لکڑیاں جو صادق علی نے دن بھر گھوم پھر کے جمع کی تھیں کم ہوتی جا رہی تھیں اور رات ابھی اپنے نصف سے بھی دور تھی۔ وہ کراہتا ہوا بمشکل اٹھا۔ کونے میں ایک گٹھڑی، بوسیدہ سا اک لحاف مٹی کے دو پیالے اور ایک کمبل پڑا تھا، اس کے علاوہ گھوڑے کا ساز بھی تھا۔

صادق علی نے کمبل اٹھایا اور اسے لالی کی پشت پر ڈال دیا۔ یہ اونی کمبل یقیناً لالی ہی کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس نے لالی کو گردن سے لے کر دم تک اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ صادق علی نے کھوئے کھوئے انداز میں کمبل پر ہاتھ پھیرا اور دوبارہ آگ کے قریب آ بیٹھا۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا ''یہ کمبل تیرے لئے سکینہ نے ہی تو بنایا تھا۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ بازار سے پرانے سوئٹر لے کر آئے گی اور انہیں ادھیڑ کر تیرا کمبل بنا دے گی۔ مگر بعد میں اس کا دل نہیں مانا تھا۔ وہ تیرے لئے نئی اون لائی تھی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے یہ کمبل بنا تھا۔۔۔۔ ہاں لالی، وہ کتنے سہانے دن تھے۔ اکبر اور ارشد کے کویت جانے کے بعد وہ تیرا اور زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ چار پانچ ماہ اسی طرح گزر گئے تھے۔ پھر ہمیں کچھ پریشانی ہو گئی تھی۔ پتا چلا تھا کہ کویت میں اکبر اور ارشد کا اپنے کفیل سے کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ وہ انہیں تنخواہ نہیں دے رہا۔ سکینہ کا ماما، کفیل سے دونوں لڑکوں کا تصفیہ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان دونوں کو بس اتنے ہی پیسے مل رہے تھے۔ جس سے کویت میں دونوں کا خرچا چل رہا تھا۔ ہم اس پر بھی خوش تھے۔

تجھے یاد ہے لالی! انہی دنوں تو بیمار پڑ گیا تھا۔ ہم دونوں رات رات بھر تیرے لئے جاگے تھے۔ میں تجھے حکیموں اور ڈاکٹروں کے پاس لئے لئے پھرا تھا۔ سکینہ تیرے لئے دعائیں مانگتی رہی تھی۔ پھر تو ٹھیک ہو گیا تھا۔ ہم نے تیری صحت یابی کی خوشی منائی تھی۔ ہم پیر و مرشد کے مزار پر گئے تھے۔ چادر چڑھائی تھی اور کھانا تقسیم کیا تھا۔ اس روز سکینہ بہت خوش تھی۔ میری اور مٹھو کی باتوں پر وہ بہت ہنسی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی وہ کھلکھلا رہی تھی۔ شاید اپنے حصے کی ساری ہنسی اس نے ایک ہی دن ہنس لی تھی۔ اس کے کانوں کے جھمکے اور ہاتھوں میں پیتل کے کنگن

ناچ رہے تھے۔ مزار سے واپسی پر تانگے میں ہی اسے سینے میں تکلیف ہوئی تھی جس میں خون ملا ہوا تھا۔ ہم اسے بھاگم بھاگ ڈاکٹروں کے پاس لے کر گئے تھے۔ ڈاکٹر نے دوا دی تھی اور ٹیسٹ وغیرہ لکھے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ سکینہ کے معدے اور نالی میں زخم ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ کافی پرانی تکلیف ہے اور اب بڑھ چکی ہے۔

''ڈاکٹر نے ٹھیک ہی کہا تھا لالی! یہ دو ڈھائی برس پرانی تکلیف تھی۔ مزار سے واپس آتے ہوئے سکینہ کے سینے میں جو ٹیس اٹھی تھی، وہ پہلی نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی نہ جانے کتنی ٹیسیں اٹھ چکی تھیں، اس سے پہلے بھی نہ جانے وہ کتنی بار خون تھوک چکی تھی۔ اس نے کچھ بتایا نہیں تھا، وہ اپنا دکھ کسی کو بتاتی ہی کب تھی، اسے تو بس دوسروں کے دکھ درد کی فکر رہتی تھی۔ لالی! اس کی بیماری کی اصل وجہ تو بھی جانتا ہے۔ اکبر اور ارشد کو باہر بھیجنے کے چکر میں ہم نے دو سال پہلے بہت سا ادھار اٹھا لیا تھا۔ اس ادھار کو اتارنے کے لئے جہاں میں نے اور تو نے مشقت کی وہاں سکینہ نے بھی دن رات جان ماری۔ وہ اپنے گھر کا کام کاج کرتی رہی اور لوگوں کے برتن بھی مانجھتی رہی۔ اس کے بعد وہ رات گئے تک کروشیے اور سلائی کڑھائی کا کام کیا کرتی تھی۔ کمزور سی تو جان تھی وہ۔۔۔۔۔۔ خوراک بھی کم ملتی تھی۔ اوپر سے ایسی جان توڑ محنت۔ بیمار نہ پڑتی تو کیا ہوتا۔ مگر اس نے ظلم یہ کیا کہ ہم سے اپنی تکلیف چھپاتی رہی۔ وہ پائی پائی جوڑ کر جمع کر رہی تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی دوا دارو پر رقم خرچ ہو۔ وہ خود ہی ایک دو نیم حکیموں سے الٹی سیدھی پھکیاں لے کر کھاتی رہی اور اپنی بیماری کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ہمیں تو لالی۔۔۔۔ ہمیں تو لالی اس وقت پتا چلا تھا جب بہت تھوڑا ساتھ باقی رہ گیا تھا۔ بس تھوڑے دن کی روٹیاں اس نے پکانی تھیں۔ تھوڑے دن تجھے کھریرا کرنا تھا۔۔۔۔ اور تھوڑے دن میرے اور مٹھو کے کپڑے دھونے تھے۔ وہ بہت بیمار تھی لیکن ہم پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ جب ہم دونوں گھر میں داخل ہوتے تو وہ ہمیشہ کی طرح چہرے پر مسکراہٹ سجا لیتی۔ اپنے بول چال سے اپنی ہنسی سے ہمیں اس خوش فہمی میں ڈال دیتی کہ وہ اب ٹھیک ہو رہی ہے۔ اسے بس ایک ہی فکر تھی کہ وہ جلد سے جلد ہمارے سروں پر سے ادھار اتار دے۔ لالی! میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ گھر کا سارا کام کاج کرتی تھی اور چوری چھپے لوگوں کے برتن بھی دھو آتی تھی۔ ان دنوں بس اس کی دو ہی خواہشیں تھیں۔ مٹھو بارہویں کے امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہو جائے

اور کویت سے اکبر اور ارشد کے بارے میں کوئی اچھی سی خبر مل جائے ۔۔۔۔ یہ دونوں خبریں آئیں لالی! لیکن تجھے پتا ہے ناں ، بہت دیر سے آئیں ۔۔۔۔۔۔ ہاں ، بہت دیر سے آئیں۔'' صادق علی کا گلا رندھ گیا اور جھریوں بھرے رخساروں پر آنسو بہہ نکلے۔ وہ کتنی ہی دیر خاموش رہا پھر گلوگیر آواز میں بولا'' وہ گرمیوں کی کتنی اداس اور گھٹن والی شام تھی۔ سکینہ کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ میں اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ٹھنڈے نہار ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ ایک دم اس کے دماغ میں پتا نہیں کیا آیا۔ کہنے لگی '' لالی کا خیال رکھا کرو۔ وہ اب بوڑھا ہو رہا ہے۔ اس سے زیادہ کام نہ لیا کرو۔'' وہ کتنی ہی دیر تیری باتیں کرتی رہی۔ پھر اپنے بیٹوں جیسے دیوروں کی باتیں کرنے لگی۔ خاص طور سے اسے مٹھو کی فکر تھی۔ کہنے لگی'' مٹھو کو کبھی نہ جھڑکنا۔ وہ اب جوان ہے، جوان اولاد کے ساتھ ٹھنڈے دماغ سے بات کرتے ہیں۔ بولو، میری بات یاد رکھو گے ناں'' میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا'' یہ کیسی باتیں کرتی ہو سکینو! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔''

'' اچھا، میں چپ ہو جاتی ہوں۔ کچھ نہیں کہتی'' اس نے میری جھڑکی سن کر ہونٹ مضبوطی سے بند کر لئے تھے۔

پھر یہ ہونٹ کبھی نہیں کھلے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے چپ ہو گئی تھی۔ تجھے یاد ہے ناں لالی! گرمیوں کی وہ شام کتنی اداس اور گھٹن والی تھی۔''

آنسو ٹپ ٹپ صادق علی کی آنکھوں سے گرنے لگے'' پھر اچانک اس پر کھانسی کا نہایت شدید دورہ پڑ گیا۔ وہ کھانس کھانس کر دہرا ہو گیا۔ اس کے حلق سے کھیں کھیں کی عجیب آواز نکل رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ یقیناً دکھ کے آنسوؤں میں کھانسی کے آنسو بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس نے آگ میں دھواں دیتی ہوئی دو لکڑیاں اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ دھواں کچھ کم ہو گیا تو اس کی سانس بحال ہونے لگی۔ وہ دو چار منٹ بالکل گم صم بیٹھا رہا۔ سردی سے اس کا بوڑھا جسم اکڑنے لگا تھا۔ اپنی جگہ سے جنبش بھی کرتا تھا تو کمر میں ٹیسیں اٹھنے لگتی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ آج واقعی سردی زیادہ ہے یا پھر بھوک اور کمزوری کی وجہ سے زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ آج شام اس نے اپنے اور لالی کے کھانے پر پانچ روپے خرچ کیے تھے۔ دو ڈھائی روپے کا چارہ چادر میں باندھ کر لایا تھا اور ڈھائی روپے کے نان پکوڑے تھے۔ ایک

چھوٹا سا نان اور غالباً ایک چھٹانک پکوڑے۔ نان بھی ایسا تھا کہ صادق علی کے ناتواں دانت اس سے الجھ الجھ کر رہ گئے تھے۔ پچھلی داڑھیں تو تھیں ہی نہیں، وہ اگلے دانتوں سے ہی داڑھوں کا کام لینے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی یہ کوشش کامیاب ہو جاتی تھی اور کبھی ناکام ۔۔۔۔۔ وہ چھوٹا سا نان کھائے اب اسے تقریباً سات گھنٹے ہو چلے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جسم کی اندرونی حرارت کم ہو گئی تھی اور سردی اس پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے آگ کے قریب بیٹھے بیٹھے اپنے تصور کو آواز دی اور نحیف آواز میں بولا'' لالی، تجھے یاد ہے، سکینہ کے بعد ہم کتنے اداس رہے تھے، کئی ماہ تک ہم دونوں کو اپنا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ کسی کام کو دل نہیں چاہتا تھا۔ ہم دونوں اکثر گھر میں ہی پڑے رہتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ دنیا میں اب کچھ بھی کرنے کو باقی نہیں رہا مگر پھر انہی دنوں مٹھو کو بڑے کالج میں داخلے کے لئے اور کتابوں کے لئے پیسوں کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ سات آٹھ ہزار کا خرچا تھا اور ہم دونوں کے پاس ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ میں نے اکبر اور ارشد کو کویت میں خط لکھا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ابھی مسئلہ حل نہیں ہوا، مگر امید ہے کہ ہو جائے گا اور رکی ہوئی تنخواہ کی پہلی قسط جلدی مل جائے گی۔

ہم دونوں نے ایک بار پھر ہمت جمع کی تھی اور اپنا پسینہ بیچنے کے لئے جہلم کی سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ وہ گرمیوں کے چلچلاتے ہوئے دن تھے۔ ہم سارا سارا دن جہلم کی تپتی سڑکوں پر سواریاں ڈھونڈتے تھے۔ میری طرح تجھ میں بھی وہ پہلے سا دم خم باقی نہیں رہا تھا۔ ہم دونوں کی عمر ڈھل چکی تھی لیکن جذبہ تو جوان تھا۔ اور جذبہ یہ تھا کہ ہمیں سکینہ کی آنکھوں کا سب سے پیارا سپنا پورا کرنا ہے۔ مٹھو کو پڑھا لکھا کر اس کے پاؤں پر کھڑا کرنا ہے ۔۔۔۔ ہم نے اپنے دل کا دکھ درد چھپا کر دن رات محنت کی۔ لالی! اور آخر اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ مٹھو کو بڑے کالج میں داخلہ مل گیا، ہم دونوں کے بوڑھے جسموں میں جیسے پھر سے جوانی کی طاقت آ گئی تھی ۔۔۔۔ ہمیں یوں لگ رہا تھا کہ ہم سکینہ کے سامنے سرخرو ہو گئے ہیں۔ انہی دنوں اکبر اور ارشد بھی چھٹی پر کویت سے آ گئے تھے اور ہماری خوشی دوبالا ہو گئی تھی۔ سکینہ کے جانے کے بعد پہلی بار ہمارے گھر میں ہنسی کی آواز گونجی تھی۔ اکبر اور ارشد کچھ پیسے بھی ساتھ لائے تھے۔ کوئی تیس پینتیس ہزار روپیا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ اگلی قسط چند ماہ بعد ملے گی۔ اس رقم سے ہم نے ادھار اتارا تھا۔ تھوڑی بہت رقم بچ بھی گئی تھی۔ کوئی دس ہزار روپیا تھا۔ یہ رقم جاتے ہوئے

اکبر مجھے دے گیا تھا۔۔۔۔ چند ماہ بعد ہم نے اس رقم سے اکبر کی شادی کی تیاری شروع کردی تھی۔ تمہیں یاد ہے ناں کہ جوں جوں شادی کے دن قریب آرہے تھے، ہم دونوں کتنے پریشان ہورہے تھے۔ کل دس ہزار روپیا تھا۔ اس میں بھلا شادی کے تمام خرچے کیسے پورے ہو سکتے تھے۔ ہم دونوں اکثر مشورہ کرتے رہتے تھے، کبھی دل میں آتا تھا کہ اکبر اور ارشد کو خط لکھ کر اور پیسے منگوائیں، مگر پھر یہ سوچ کر چپ ہوجاتے تھے کہ پتا نہیں وہاں کے حالات کیا ہیں، وہ کس طرح گزارہ کررہے ہیں۔ جیسے تیسے کرکے ہم نے سات آٹھ ہزار روپیا مزید اکٹھا کرلیا پھر کچھ چیزیں بھی بیچ دیں۔ یوں اکبر کی شادی ہوگئی تھی۔ اکبر کی شادی کے چار چھ مہینے بعد ہی ہمیں ارشد کی شادی بھی کرنا پڑگئی تھی۔ ایک تو دو شادیوں نے ہی کافی خرچا کرادیا تھا، اس پر مٹھو کی پڑھائی کے خرچے بھی بڑھ گئے تھے۔ ہمیں بڑی محنت کرنا پڑرہی تھی۔ انہی دنوں مجھے دمے کی شکایت بھی لاحق ہوگئی تھی۔ اکبر اور ارشد نے ایک دوبارہ آدھے دل سے کہا تھا کہ میں اب تانگا وغیرہ چلانا چھوڑ دوں لیکن میں جانتا تھا کہ میں تانگا نہیں چھوڑ سکتا اور نہ ہی گھر کے حالات اس کی اجازت دیتے تھے۔ لہٰذا تانگا چلتا رہا تھا اور تانگے کے ساتھ ہی ہم دونوں بھی شہر کی سڑکوں پر چلتے رہے تھے۔ انہی دنوں عراق کویت کی جنگ شروع ہوگئی تھی اور بے شمار دوسرے لوگوں کی طرح اکبر اور ارشد بھی کویت سے واپس آگئے تھے۔ آمدنی کم ہوئی تو گھر میں چھوٹے موٹے جھگڑے شروع ہوگئے تھے۔ اکبر اور ارشد کی بیویوں کا رویہ بھی کچھ بدلا بدلا نظر آنے لگا تھا۔ میں تجھے تو دانا پٹھا ڈال دیتا تھا لیکن مجھے وقت پر کھانا نہیں ملتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری بھوک کی وجہ سے تجھ سے بھی کچھ نہیں کھایا جاتا۔ ہم اکثر باہر ہی کھانا کھانے لگے تھے۔۔۔۔ اور پھر وہ حادثہ ہوا تھا لالی، جس نے میری دنیا اندھیر کردی تھی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس حادثے میں میرا ہی قصور زیادہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ تو بھی میری طرح بوڑھا ہوچکا ہے۔ تجھ میں اب پہلی سی ہمت باقی نہیں رہی، پھر بھی کسی وقت میں تجھ پر زیادہ بوجھ لاد دیتا تھا۔ جمعے کی وہ رات بھی ایسی ہی تھی۔ دو دن شہر میں ہڑتال رہی تھی۔ تیسرا دن جمعے کا تھا۔ یہ بھی چھٹی کا دن تھا، ہم دونوں کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ رات گئے ہمیں جی ٹی روڈ سے کچہری تک کا ایک پھیرا ملا تھا، سواریاں زیادہ تھیں لیکن میں نے بٹھالیں۔ ریلوے لائن کے پاس سڑک پر کھڈے تھے۔ تو گرا تھا اور اٹھ نہیں سکا تھا۔ لالی۔۔۔۔ اس روز تیری ٹانگ نہیں

ٹوٹی تھی، میری کمر ٹوٹ گئی تھی۔ میرا سب کچھ مجھ سے چھن گیا تھا۔ میں روتا ہوا گھر لے آیا تھا۔۔۔۔ اس رات میں جتنا رویا تھا لالی! شاید زندگی میں کبھی نہیں رویا۔

بوڑھے صادق علی کی آنکھوں سے ایک بار پھر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ کھنڈر سے باہر ہوا سرکش ہوگئی تھی۔ جسم کے جس حصے پر لگتی تھی محسوس ہوتا تھا کہ برچھی چھبو دی گئی ہے۔ کمزور لالی بھی اب سردی سے نڈھال سا ہوکر لیٹ گیا تھا۔ آگ میں جھونکنے کے لئے اب دو چار لکڑیاں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ صادق علی نے ٹوٹی ہوئی چھت کے خلا سے باہر جھانکا۔ خلائے بسیط میں چمکنے والے تارے معدوم تھے۔ مطلع ابر آلود ہوچکا تھا اور لگتا تھا کہ ابھی بوندا باندی شروع ہوجائے گی۔ یہ رات تھی یا برف کا ایک تاریک پہاڑ تھا جو اپنی جگہ سے سرک ہی نہیں رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس رات کی صبح قیامت تک نہیں ہوگی۔ 22 دسمبر کی رات ایسی ہی بے کراں ہوا کرتی ہے۔

زمین پر لیٹتے وقت لالی نے اپنی ٹانگ موڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش کے سبب اس کی ٹانگ کے زخم سے پھر خون رسنے لگا۔ یہ پانچ چھ ماہ پرانا زخم تھا اور کافی خراب ہوچکا تھا۔ صادق علی اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے اپنے سامان کی گٹھڑی میں سے ایک سفید پٹی اور مرہم کی گول ڈبیا نکالی۔ خود کو گھسیٹتا ہوا وہ لالی کے پاس آبیٹھا۔ اس نے گھٹنے سے ذرا نیچے بندھی ہوئی خون آلود پٹی کھولی۔ اس پٹی کو تہ کرنے کے بعد ٹانگ کا زخم صاف کیا۔ ٹانگ کی حالت سے ظاہر تھا کہ گھٹنے سے نیچے کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔ شاید وہ کسی حد تک جڑ بھی گئی ہو لیکن یہ سیدھی نہیں جڑی تھی۔ اس کے علاوہ زخم بھی خراب ہوچکا تھا۔ زخم صاف کرنے کے بعد صادق علی نے بڑی احتیاط سے زخم پر مرہم کا لیپ کیا اور صاف پٹی باندھ دی۔

اس معمولی سے کام سے ہی وہ ہانپ کر رہ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی بھی وقت اس کا سانس اٹک کر رہ جائے گا۔ وہ اتنا بھی بوڑھا نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ یقیناً غموں اور بیماری نے اس کی زندگی کے کئی برس کھالئے تھے۔ صادق علی، لالی کی گردن تھپتھپاتا رہا۔ پھر اس کے منہ کو ہولے ہولے سہلاتا ہوا بولا ”لالی! مجھ سے جو کچھ ہوسکا ہے تیرے لئے کیا ہے، دیسی علاج کرایا ہے۔ ولایتی علاج کرایا ہے، تعویز گنڈے والوں کے پاس گیا ہوں۔۔۔۔ یار! اپنی طرف سے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے ناں میں نے۔۔۔۔ اب کیا کروں؟ جو تیری قسمت

اور جو میری قسمت ۔۔۔ میں نے پہلے تجھے کچھ نہیں بتایا لیکن آج بتاتا ہوں ۔۔۔۔ پچھلے چھ مہینے میں، میں بہت پریشان رہا ہوں ۔ سب مجھ سے تیرے بارے میں یہی کہتے رہے ہیں کہ تو کبھی ٹھیک نہیں ہو سکے گا ۔ تو ہمیشہ کے لئے بے کار ہو گیا ہے ۔ میں خوامخواہ پیسا اور وقت برباد کر رہا ہوں ۔ لیکن میں یہ بات نہیں مانتا ، میں یہ بات مان ہی نہیں سکتا ۔ اگر میں بالکل بے کار نہیں ہوا تو تو کیسے ہو سکتا ہے ۔ اگر یہ بات سچ ہے تو بھی میں نہیں مان سکتا'' صادق علی نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا ''میرا دل چاہتا ہے کہ آج تجھ سے کچھ بھی نہ چھپاؤں ۔ سب کچھ تجھے بتا دوں ۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور شاید تیرے دل کا بھی ۔۔۔۔''

لالی کے کان عجیب سے انداز میں ہلے ۔ جیسے وہ پوری توجہ سے سن رہا ہو اور اس کی آنکھیں واقعی بولتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں اور اس کے نتھنے جیسے دکھ کی شدت سے لرز رہے تھے اور اس رات کے بطن میں وہ صادق علی ہی کی طرح آفت زدہ نظر آتا تھا ۔ صادق علی نے لرزاں ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھے اور گہری سانس لے کر بولا ''لالی ! میں آج تجھے بتاتا ہوں کہ ۔۔۔۔ اکبر اور ارشد کا کویت میں اپنے کفیل سے کوئی تنازع نہیں تھا ۔ انہیں ہر مہینے ۔۔۔۔ ہاں لالی ۔۔۔ ہر مہینے پوری تنخواہ ملتی تھی ، بس ان کے ایک دوست نے ان کے کان بھر رکھے تھے ۔ اس نے انہیں سمجھایا تھا کہ وہ یہ رقم پاکستان نہ بھیجیں ورنہ صادق علی اسے ادھر ادھر اڑا دے گا ۔ وہ یہ رقم اپنے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا رہے تھے ۔ بعد میں اس رقم سے دونوں نے ایک پلاٹ خریدا تھا ۔ اس بات کا پتا مجھے صرف دو تین مہینے پہلے ہی چلا ہے ۔۔۔۔ بول لالی ! یہ دکھ کی بات ہے ناں ۔۔۔ کہ ہماری سکینہ ، دو دو آنے جوڑتی رہی ، روکھی سوکھی کھاتی رہی اور اپنے اندر بیماری پالتی رہی ، صرف اس لئے کہ اکبر اور ارشد کے تنگی کے دن گزر جائیں ۔۔۔۔ اور وہ قرض جو انہوں نے لیا ہے ہمارے سروں پر بوجھ نہ بنا رہے ۔۔۔۔ بول لالی ! یہ دکھ کی بات ہے ناں ۔ وہ دوا کو ترستی ہوئی مر گئی اور وہ دونوں اپنے اپنے اکاؤنٹ میں رقمیں جمع کراتے رہے ۔ وہ تو انہیں اپنے بچوں کی طرح سمجھتی تھی ، انہیں دیکھ دیکھ کر جیتی تھی ۔ وہ تو یار لالی ، اس کی اولاد تھے''

صادق علی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ روتے روتے ہی بولا ''لالی ! میں آج تجھ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا ۔ لے ، آج تجھے یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میرے بھائی ۔۔۔ میرے بیٹوں جیسے دونوں بھائی ۔۔۔ تجھے جان سے مارنا چاہتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ تیری ٹانگ ٹوٹ گئی

ہے ، اب تیرا علاج صرف گولی ہے ۔ وہ پستول لے کر آ گئے تھے ۔ میں نے اور مٹھو نے بڑی مشکل سے انہیں روکا تھا ۔ وہ رک تو گئے تھے لیکن ان کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی ۔ وہ رات دن میرے اور تیرے پیچھے پڑے رہتے تھے ۔ ان کی بیویاں ان سے بڑھ کر ہماری مخالف تھیں ۔ ان سب کا خیال تھا کہ میرا دماغ چل گیا ہے ۔ میں ایک بیکار گھوڑے سے چمٹا ہوا ہوں ، اسے باندھ کر کھلا رہا ہوں ۔ اس کے دوا دارو پر خرچ کر رہا ہوں ۔ وہ بس ایک ہی بات چاہتے تھے کہ میں تجھ سے چھٹکارا حاصل کر لوں ۔ ان جیون جوگوں کو تیرے اور میرے رشتے کا پتا نہیں تھا ۔ وہ مجھے مالک اور تجھے گھوڑا سمجھتے تھے ۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ہم دونوں مدت کے ساتھی ہیں ، دوستی کے اٹوٹ رشتے میں بندھے ہوئے ہیں ۔ ہم نے پچیس سال جہلم کی سڑکوں پر خون پسینہ گرایا ہے اور ان سب کے لئے روٹی کمائی ہے ۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا ۔۔۔۔ اور نہ اب ہے ۔ وہ مجھے پہچانتے ہیں لیکن تجھے نہیں پہچانتے ۔ حالانکہ میری پہچان تو تو ہے ۔ صادق علی کو کوئی نہیں جانتا ، صادق کوچوان کو ہر کوئی جانتا ہے ۔''

لالی نے ہنہنا کر ہنکارا ابھرا ۔ صادق علی اس کا ایال سہلاتے ہوئے بولا ''آج تجھ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا لالی ۔۔۔۔۔۔ لے تجھے یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ ایک مہینہ پہلے شب برات کی رات میں نے تجھ سے جھوٹ بولا تھا ۔ میں نے تجھ سے کہا تھا ناں کہ اکبر گھر کے پچھلے ویہڑے میں تیرا چھپر گرانا چاہتا ہے ۔ وہاں وہ تیرے لئے لکڑیوں کی پکی چھت ڈلوائے گا ۔۔۔۔ تو بہت خوش ہوا تھا اور تیری آنکھیں چمکنے لگی تھیں ۔ میں نے کہا تھا جب تک نئی چھت نہیں ڈل جاتی تجھے گھر سے باہر رہنا ہوگا ۔۔۔۔ وہ سب جھوٹ تھا لالی ، میں نے صرف تجھے گھر سے لانے کے لئے بہانہ بنایا تھا ۔ اس روز اکبر ارشد اور ان کی بیویوں نے میرے ساتھ سخت جھگڑا کیا تھا ، مجھے پاگل کہا تھا اور دھمکی دی تھی کہ تجھے مار دیں گے اور مجھے پاگل خانے جمع کرا دیں گے ۔ میں اپنے لئے تو ہر دکھ سہہ سکتا تھا لیکن تیرے لئے نہیں ۔۔۔۔ تیرے لئے نہیں ۔۔۔۔۔ تیرے لئے نہیں لالی ، میں نے خاموشی سے تجھے کھولا تھا اور اپنے ساتھ لے کر یہاں آ گیا تھا ۔ اس وقت میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی ۔ میں نے تجھے یہاں باندھا تھا اور خود اگلے دن مزدوری ڈھونڈنے نکل گیا تھا ۔ بڈھے بیمار کو مزدوری کون دیتا ہے ۔ مگر میں نے کسی نہ کسی طرح کام ڈھونڈ ہی لیا تھا ۔ تیرے اور اپنے لئے میں نے

پورے بیس دن مزدوری کی ہے لالی! میں نے راجوں کے پیچھے اینٹیں ڈھوئی ہیں اور ٹوکری اٹھائی ہے اور یہ کوئی احسان نہیں ہے میرا تجھ پر۔۔۔۔ اتنے برس تو محنت کر کے مجھے اور میرے ''بچوں'' کو کھلاتا رہا ہے، دو ہفتے میں نے کھلا دیا تو کون سا پہاڑ توڑا۔ میں نے تو فیصلہ کر رکھا تھا یار! کہ آخری سانس تک اپنے لئے اور تیرے لئے مزدوری کرتا رہوں گا۔ مگر تُو تو جانتا ہے ناں کہ بڑھاپے سے بڑی بیماری اور کوئی نہیں۔۔۔۔ میں نے تجھے بتایا نہیں کہ پچھلے سے پچھلے ہفتے میں ٹوکری اٹھاتے ہوئے گر گیا تھا۔ اصل میں وہاں پتھر کی رگڑائی ہو رہی تھی، دھول کی وجہ سے میرا سانس رک گیا۔ ایک گھنٹا بے ہوش پڑا رہا تھا۔ لوگ اسپتال لے گئے تھے۔ ایک رات اسپتال میں ہی رہا تھا۔ ڈاکٹر نے بڑی جھڑکیاں دیں، کہنے لگا، بابا تجھے دمہ ہے۔ تجھے صاف ہوا اور آرام کی لوڑ ہے۔ میں اسے کیا بتاتا کہ جس طرح مجھے صاف ہوا اور آرام کی لوڑ ہے، اسی طرح کسی کو میری بھی لوڑ ہے۔ کمر کی تکلیف تو مجھے پہلے بھی تھی لالی! جس دن سے گرا ہوں اس دن کے بعد سے تو سیدھا ہی نہیں ہوا گیا۔ اوپر سے سردی نے بھی حد کر دی ہے، لگتا ہے کہ کمر کمان بن کر رہ گئی ہے۔''

صادق علی باتیں کر کے ہانپ سا گیا تھا۔ وہ بہت آہستہ بولتا رہا تھا اور درمیان میں سانس بھی لیتا رہا تھا پھر بھی اس کے گلے کی رگیں پھول پھول جاتی تھیں۔ وہ خاموشی سے مدھم پڑتی آگ کو گھورتا رہا۔ لالی بھی آگ ہی کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خیالوں میں گم تھے۔ ایک طویل وقفے کے بعد صادق علی نے کہا ''لالی! جو کچھ جیب میں تھا، پچھلے پندرہ دن میں خرچ ہو گیا ہے۔ اب کیا ہوگا۔۔۔۔ یہ پیٹ کی آگ کیسے بجھائیں گے۔ کیا ہمیں۔۔۔۔ کیا ہمیں بھی مانگنا پڑے گا۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔۔۔۔ یہ بات کہہ کر صادق علی کو جھرجھری سی آ گئی ''نہیں لالی! ہم ہاتھ نہیں پھیلائیں گے۔ سکینہ ہمیشہ یہی دعا مانگا کرتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی، خدا کرے ہمیں زندگی میں کسی کے سامنے سوال نہ کرنا پڑے۔ کتنی اچھی دعا تھی، کتنی عزت والی دعا تھی یہ۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ مگر لالی! سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہم کیا کریں گے۔ کہاں جائیں گے۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔'' صادق علی کی آنکھیں کہیں کھو سی گئیں۔ چہرے پر منڈلاتے ہوئے دکھ کے بادل اور بھی تاریک ہو گئے۔ وہ بولا ''میں جانتا ہوں لالی! جس طرح میں تانگا چلانے کو ترس گیا ہوں، تو بھی تانگا کھینچنے کو ترس گیا ہے۔ تجھے تانگے سے جدا ہوئے چھ مہینے ہوئے ہیں لیکن مجھے پتا ہے یہ چھ مہینے تیرے لئے چھ صدیوں کی طرح ہیں۔۔۔ تو جب

بھی اپنی ٹانگ کو دیکھتا ہے تیرے دل سے ہوک اٹھتی ہے، تو سوچتا ہے، کیا اب کبھی تیرا میرا اور تانگے کا ملاپ نہیں ہوگا۔ کیا وہ خوشی ہماری حیاتی سے ہمیشہ کے لئے نکل گئی ہے۔ جو ہمیں ایک ساتھ سڑک پر چلنے سے ملا کرتی تھی۔ جس طرح تو میرے دل کا حال جانتا ہے، میں بھی تیرے دل کی بات جانتا ہوں لالی! تیری آنکھیں مجھے سب کچھ بتاتی ہیں۔ تیری طرح میں بھی یہی سب کچھ سوچتا رہتا ہوں۔ حالات ہمارے خلاف ہو گئے ہیں لالی! کچھ بھی تو ہمارے حق میں نہیں رہا۔ دکھوں کے اس گھیرے سے کیسے نکلیں لالی! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا، کیا تیری سمجھ میں کچھ آتا ہے؟''

لالی خاموش رہا، صادق علی بھی خاموش رہا۔ بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ تیز ہوائیں کھنڈر کی دیواروں سے سر پٹخ رہی تھیں۔ آثار بتا رہے تھے کہ شمال میں پہاڑوں پر اندھا دھند برفباری ہوئی ہے۔ اس برف کو چھو کر آنے والی ہوائیں ہر ذی روح کو منجمد کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ یہ سال کی طویل ترین رات تھی اور ایسی راتیں کبھی کبھی سرد ترین بھی ہوا کرتی ہیں۔ دونوں بوڑھے دوستوں کی ہڈیوں میں گودا جمنے سا لگا تھا۔ شہر کے نیم گرم در و دیوار سے دور، لحافوں اور آتش دانوں سے دور وہ دونوں دم بہ دم سکڑتے اور ٹھٹھرتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں سن ہو رہے تھے اور کان ناک جیسے جسم کے ساتھ ہی نہیں تھے۔ پھر ٹوٹی ہوئی چھت کے خلا سے بارش کی ایک بوچھاڑ آئی اور دونوں کو بھگو گئی۔ ہوا کے زور سے گھاس پھونس کا وہ چوکھٹا اکھڑ کر دور جا گرا تھا جو صادق علی نے کل دروازے میں پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اب دروازے کی طرف سے بھی ہوا آزادانہ اندر آنے لگی تھی۔ صادق علی سمٹ کر ایک گوشے میں ہو گیا۔ مگر چھینٹے یہاں بھی پڑ رہے تھے۔ صادق علی کچھ دیر خود کو اور لالی کو بارش اور ہوا سے بچانے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے یہ کوشش ترک کر دی اور پہلے کی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ آگ بجھ چکی تھی بس لالٹین کی مدھم روشنی باقی رہ گئی تھی۔ سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ عجیب سی غنودگی صادق علی پر طاری ہو رہی تھی۔ وہ لالی کو مخاطب کر کے خوابناک لہجے میں بولا ''لالی! کل رات میں نے جاگتی آنکھوں سے ایک عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ہم تینوں اکٹھے ہیں۔ تو میں اور سکینہ۔۔۔۔ ایک مکان کا صحن ہے۔ سکینہ نے ہلکے گلابی کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اس کے کانوں میں وہی جھمکے چھم چھم کر رہے ہیں جو اس نے ایک بار ارشد کے سخت بیمار پڑنے پر بیچ دیے تھے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی ہے۔ تو ے سے گرم گرم روٹیاں

اتار رہی ہے اور اس کے پاس رکھی ہانڈی میں سے گندل کے ساگ کی خوشبو اٹھ رہی ہے۔تو بھی ہمارے پاس ہی بندھا ہوا ہے۔اپنی جوانی کے دنوں کی طرح خوب صحت مند اور نکھرا ہوا ہے تو۔۔۔تیرے سامنے ڈھیروں ڈھیر دانہ پڑا ہے اور ہرے ہرے چارے کا انبار لگا ہے۔پاس ہی تانگا کھڑا ہے جسے ابھی تھوڑی دیر پہلے ارشد اور مٹھو نے دھو دھو کر چمکا دیا ہے۔پچیس سال پہلے کے وہی سہانے دن ہیں جن کی یادیں اب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے رہتی ہیں۔لالی! اس خواب کا سرور ابھی تک میرے دماغ میں ہے۔دل چاہتا ہے کہ۔۔۔۔" ایک دم صادق علی کی آواز بیٹھ گئی۔اس کی چھاتی پھر ہونک گئی تھی۔سانس واپس اس کے سینے میں جا ہی نہیں رہا تھا۔لالی کے پیٹ پر سر رکھے وہ بس کھانستا ہی چلا جا رہا تھا۔پھر اس کے حلق سے "کھیں کھیں" کی خوفناک آواز نکلنے لگی۔یخ بستہ ہوا کے تازیانے کچھ اور شدت سے ان دونوں پر برسنے لگے تھے۔

بہت دیر بعد صادق علی کی حالت کچھ سنبھلی۔لالی لیٹا ہوا تھا اور صادق علی اس کے اوپر نیم دراز سا تھا۔لالی کی ایک آنکھ سے پانی کی لکیر سی نیچے کی طرف جا رہی تھی۔معلوم نہیں آنکھ خراب تھی یا واقعی اس کا دکھ پانی بن کر آنکھ سے نکل آیا تھا۔صادق علی نیم غنودگی کی کیفیت میں بڑبڑانے لگا "لالی! آج میں تجھ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔سب کچھ بتا دوں گا تجھے۔۔۔۔۔ اکبر اور ارشد جیسے بھی ہیں لالی! لیکن مٹھو تو ہمارا اپنا ہے ناں۔وہ دل میں ہماری ہمدردی رکھتا ہے۔اس کا رویہ ویسا نہیں جیسا اکبر ارشد اور ان کے بیوی بچوں کا ہے۔اس بات کو تو بھی جانتا ہے اور میں بھی جانتا ہوں۔پرسوں تو مجھ سے یہی کہہ رہا تھا ناں کہ اگر مٹھو یہاں ہوتا تو ہماری خبر لینے ضرور آتا۔یہی کہا تھا ناں تو نے۔۔۔" کچھ دیر تک صادق علی خاموشی سے لالی کی آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر اچانک اس کے چہرے پر بے پناہ کرب امڈ آیا۔روتے ہوئے بولا۔

"لالی! ہمارا مٹھو لاہور میں بڑے کالج کا امتحان دے کر واپس آ چکا ہے۔وہ پرسوں سے جہلم میں ہی ہے۔تجھے بتائے بغیر چپکے چپکے میں نے تین دن اس کا بڑا انتظار کیا ہے۔بڑا انتظار کیا ہے یار۔۔۔۔ایک ایک پل گن گن کر گزارتا رہا ہوں مگر وہ نہیں آیا لالی! وہ ابھی تک نہیں آیا۔پتا نہیں اس کی کیا مجبوری ہے۔پتا نہیں بھائیوں اور بھابیوں نے اسے کیا بتایا ہے۔اگر اس نے آنا ہوتا۔۔۔تو اب تک آ جاتا لالی۔۔۔۔اتنے لمبے پینڈے تو نہیں تھے ہمارے اور اس کے درمیان۔۔۔۔۔۔شاید وہ بھی۔۔۔۔۔شاید وہ بھی۔۔۔۔"

ایک بار پھر شدید کھانسی نے صادق علی کے نیم جان جسم کو دہلا دیا۔تادیر اس کرب میں مبتلا رہنے کے بعد وہ بالکل نڈھال ہو گیا۔ایک عجیب سی غنودگی اس کے سراپے کو گھیر رہی تھی۔برفانی ہوا کے کوڑے اب بھی اس کے جسم پر برس رہے تھے۔لیکن ان کی اذیت اب کچھ کم محسوس ہوئی تھی۔ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیاں سن ہونے کے بعد بے حس سی ہو گئی تھیں۔یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے گرد و پیش کی سختیوں سے لاتعلق ہوتا جا رہا ہے۔چند منٹ کھنڈر میں گہری خاموشی طاری رہی پھر صادق علی نے نہایت نحیف آواز میں کہا "لالی! بس ایک روپیا رہ گیا ہے۔اس آخری روپے کے بعد کچھ بھی نہیں ہے، کچھ بھی تو نہیں ہے۔۔۔نہ اکبر، نہ ارشد۔۔۔۔نہ ان کی بیویاں۔۔۔اور نہ شاید مٹھو۔اس آخری روپے کے بعد۔۔۔بس ایک ہی راستہ ہے۔۔۔ہاتھ پھیلانے کا راستہ۔اور میں اس راستے پر نہیں چل سکتا۔اور مجھے یقین ہے کہ تو بھی نہیں چل سکتا۔۔۔۔۔کیونکہ اس راستے پر سکینہ کی دعا کھڑی ہے۔یہ دعا ہمیں اس راستے پر پاؤں نہیں رکھنے دے گی۔جب یہ راستہ بھی نہیں ہے تو پھر۔۔۔۔تو پھر کیوں نہ لالی! ہم سکینہ کے پاس چلے جائیں۔اسی چار دیواری میں جہاں وہ پرسوں مجھے ملی تھی۔اس کے کانوں میں جھمکے چم چم کر رہے تھے اور ہانڈی سے گندل کے ساگ کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔۔۔۔ہاں لالی، تیرے سامنے بھی تو ہرے ہرے چارے کا ڈھیر لگا تھا۔۔۔۔ہم تینوں وہاں کتنے سکھی تھے لالی، وہاں کوئی تجھے گولی مارنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔وہاں کوئی مجھے پاگل کہنے والا نہیں تھا۔وہاں اکبر، ارشد اور ان کی بیویوں کی جلی کٹی باتیں نہیں تھیں۔وہاں کسی مٹھو کی جھوٹی آس بھی نہیں تھی" صادق علی نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا "تیری کیا مرضی ہے لالی۔۔۔کیا تو بھی وہی سوچ رہا ہے جو میں سوچ رہا ہوں؟"

لالی کے کانوں نے عجیب سے انداز میں جنبش کی۔اس کے نتھنے غیر محسوس طور پر پھڑک اٹھے۔لالی بولتا نہیں تھا مگر صادق علی اس کی ہر بات سمجھتا تھا۔نفسیات داں کہتے ہیں کہ ٹیلی پیتھی درحقیقت نہایت خفیف اشاروں کی زبان ہے۔اور لالی کے خفیف اشارے صادق علی نہ سمجھتا تو اور کون سمجھتا۔صادق علی کی سوئی سوئی آنکھوں میں چمک سی نمودار ہو گئی۔اس نے اپنے سن ہونٹوں سے لالی کی یخ بستہ گردن کو چوما اور بولا "ٹھیک ہے لالی! اگر تیرے دل میں بھی یہی بات آتی ہے تو پھر یہ ٹھیک ہی ہو گی۔۔۔۔ہم سکینہ کے پاس چلیں گے، ضرور چلیں گے۔"

کھنڈر سے باہر ہوا پاگل ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ کمرے کی ادھوری چھت کسی بھی وقت ہوا کے دوش پر سوار ہو جائے گی۔ بارش کی بوندیں کبھی گرنے لگتی تھیں کبھی تھم جاتی تھیں۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی تو قرب وجوار کی ہر شے چند سیکنڈ کے لئے روشنی میں نہا جاتی تھی۔

صادق علی نے عجیب ڈرامائی سے انداز میں سرگوشی کی ''لالی! تجھے یاد ہے ناں کہ شادی کے بعد ایک دو سال تک سکینہ اکثر اپنے میکے جایا کرتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد تم اور میں کتنے اداس رہا کرتے تھے۔ ایک ایک دن گن گن کر کاٹتے تھے۔ پھر ہم اس سے ملنے چلے جایا کرتے تھے۔ خوب سج سنور کر، بن ٹھن کر اور خوشبو لگا کر۔۔۔ ایسے دن کتنے اچھے اور پیارے ہوتے تھے۔ لگتا تھا رستوں نے ہمارے لئے اپنے بازو کھول رکھے ہیں۔ تیرے قدموں سے ڈھولک بجتی تھی اور ارد گرد کی ہر شے ناچنے لگتی تھی، تجھے یاد ہے ناں لالی!''

لالی کے کانوں نے پھر عجیب سے انداز میں جنبش کی۔

صادق علی بولا ''ٹھیک ہے لالی۔۔۔ ہم۔۔۔ آج پھر۔۔۔ اس یاد کو تازہ کریں گے۔۔۔ آج پھر اسی طرح۔۔۔ سکینہ سے ملنے جائیں گے۔''

صادق علی کی سانس اب سینے میں الجھنے لگی تھی۔۔۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح خود کو سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ دیواروں کا سہارا لیتا ہوا وہ کمرے کے گوشے تک پہنچا۔ یہاں گھوڑے کا مکمل ساز پڑا تھا۔ اس نے ساز اٹھایا اور لڑکھڑاتا ہوا واپس لالی کے پاس پہنچ گیا۔ پتا نہیں اتنی ہمت اس میں کہاں سے آ گئی تھی۔ اس نے لالی کی رسی تھامی تو اس نے اپنی گردن لمبی کی۔ اپنے پچھلے پاؤں پر زور دے کر جسم کو ایک دو ہچکولے دیے اور اٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ صادق علی نے ساز لالی کی پشت پر رکھا۔ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لالی کی رسی تھام لی۔ دونوں بوڑھے اور نیم جان دوست لڑکھڑاتے، گرتے پڑتے، خستہ حال کمرے سے باہر نکل آئے۔

تند و تیز ہوا چیخیں مارتی ان پر حملہ آور ہوئی۔ زور سے بجلی چمکی اور قرب وجوار روشن ہو گئے۔ اس روشنی میں دکھائی دیا کہ کھنڈر سے چند گز کے فاصلے پر بوہڑ کے گھنے درخت تلے ایک تانگا کھڑا ہے۔ تانگے کے دونوں بانس دو بڑی انگلیوں کی طرح آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے، جیسے آسمان پر بپا زلزلے کی طرف اشارہ کر رہے ہوں۔ صادق علی اپنی سانس سے الجھتا ہوا اور خود کو گھسیٹتا ہوا تانگے تک پہنچا۔ لالی خود ہی دونوں بانسوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ یوں لگتا تھا کہ

اسے تانگا کھینچنے کی جلدی صادق علی سے بھی زیادہ ہے۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک غیر متوقع توانائی آ گئی تھی۔ بالکل جیسے چراغ بجھنے سے پہلے زور سے بھڑکتا ہے۔ صادق علی نے لالٹین درخت کے مضبوط تنے کی جڑ میں اس طرح رکھ دی کہ وہ ہوا کی براہ راست مار سے محفوظ رہے۔ پھر وہ لالی کو تانگے کے آگے جوتنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک ٹھٹھرے ہوئے نیم جاں بوڑھے کے لئے یہ ایک ناقابل برداشت مشقت تھی مگر وہ یہ مشقت کر رہا تھا۔ لالی اور تانگے کو باہم ملانے کے بعد صادق علی دوبارہ لڑکھڑاتا ہوا کھنڈر میں پہنچا۔ لالٹین اس کے ساتھ تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے گٹھڑی ٹٹولی۔ اس میں سے اپنا دھلا ہوا جوڑا نکالا۔ یہ کپڑے نہ جانے کب سے استری سے محروم تھے۔ قمیض کے ایک دو بٹن بھی غائب تھے۔ صادق علی نے کپڑے پہنے۔ ایک چھوٹی سی شیشی میں سے عطر نکال کر لگایا۔ پھر پلاسٹک کا ایک خوبصورت سرخ پھول لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ یہ اس کے لالی کا پھول تھا۔ لالی تک پہنچتے پہنچتے صادق علی نے دو بار رک کر سانس لیا۔ سانس جمے ہوئے آبی بخارات کی صورت اس کے ہونٹوں سے نکل رہا تھا۔ اس کا سراپا جیسے جان سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔ لالی کے پاس پہنچ کر اس نے سرخ پھول لالی کے سر پر سجایا۔ بے پناہ سردی کے سبب لالی کا سارا جسم ہولے ہولے لرزنا شروع ہو گیا تھا۔

صادق علی کے لئے سب سے مشکل مرحلہ تانگے پر بیٹھنا تھا۔ اس کا اپنا جسم ہی اس پر ناقابل برداشت بوجھ بن گیا تھا۔ کمر تھی کہ سیدھی ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ سانس تھا کہ سینے میں آرے کی طرح چل رہا تھا۔ یہ سانس واقعی اس کے اندر کچھ کاٹتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا ایک پاؤں پائیدان پر لرز رہا تھا اور دوسرا تانگے کے فرش پر۔ اگلا قدم طے کرنے کے لئے صدیاں درکار تھیں۔ پتا نہیں وہ کس طرح یہ صدیاں عبور کرنے میں کامیاب ہوا۔ وہ اپنی نشست پر پہنچا تو جیسے لالی کی کنوتیاں خود بخود متحرک ہو گئیں۔ معلوم نہیں یہ کیا رشتہ لالی اور صادق علی میں۔۔۔ اس رشتے میں لکڑی کا تانگا ایک پل کا کام دیتا تھا اور یہ کوئی آج کی بات نہیں، پچیس برس کا قصہ تھا۔ نشست پر بیٹھ کر صادق علی نے کمر سیدھی کی اور باگ پر ہاتھ رکھا تو گردش ایام پیچھے کی طرف دوڑ گئی۔ ایک ہی لمحے میں بیت جانے والے پچیس سال وقت کی سلیٹ پر سے صاف ہو گئے۔

''ہم آ رہے ہیں سکینو!'' صادق علی نے خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

بجلی زور سے چمکی۔ صادق علی نے باگ کو جنبش دی۔ اس جنبش میں جھٹکا نہیں تھا۔ نہ ہی

تحکم تھا، ایک لاڈ تھا، ایک محبت تھی۔ جیسے کسی دوست کی انگلی تھام کر اسے اپنا ہم قدم
جائے۔ لالی کی گردن تن گئی، اس کے سر کا پھول لہلہا اٹھا۔ اس نے اپنا پاؤں اٹھایا۔ ہاں،
پچیس برس پیچھے لوٹ گئی تھی۔ آج وہ دونوں دوست پھر سے جوان تھے۔ ایک ہرے بھ
رستے پر سفر کر کے وہ آج پھر سکینہ سے ملنے جا رہے تھے۔ لالی نے لنگڑاتے ہوئے چار
قدم طے کیے۔ آگے ڈھلوان تھی۔ اور دور تک ڈھلوان تھی۔ نشیب میں پوٹھوہار کے
درخت تھے۔ آسمان پر برق تڑپی، کوہ ودمن چند لمحوں کے لئے روشن ہوئے اور تب۔۔۔۔
ایک بار پھر سب کچھ تاریک ہو گیا۔ یہ 22 دسمبر کی رات تھی، طویل ترین اور سرد ترین۔

☆

اگلی صبح جواں سال مٹھو اپنے باپ جیسے بھائی صادق علی کو ڈھونڈتا ہوا کھنڈر تک پہنچا۔
رات ہونے والی بارش نے ہر شے کو نکھار دیا تھا۔ یہاں تک کہ کھنڈر بھی دھلا دھلا نظر آتا
توفیق عرف مٹھو کھنڈر میں داخل ہوا۔ اسے بجھی ہوئی آگ ملی۔ صادق علی کا بچا کھچا سامان
اور ایک چمکدار سکہ ملا۔ بظاہر تو یہ ایک سکہ تھا لیکن کسی کی زندگی کے لئے یہ بہت زیادہ ا
رکھتا تھا کیونکہ یہ اس کی جیب کا آخری سکہ تھا۔ مٹھو نے سکہ اٹھایا پھر وہ صادق علی کو آوا
دینے لگا ''وڈے لالہ۔۔۔۔۔۔ وڈے لالہ!''
لیکن وڈا لالہ وہاں نہیں تھا۔ وہ باہر نکلا، اسے تانگے کے پہیوں کے نشان نظر آئے اور ایک لنگڑ
گھوڑے کے چند مدھم نقش قدم دکھائی دیے۔ وہ ان نشانات پر چلتا ہوا ذرا آگے گیا تو اسے صادق عل
آ گیا۔ اس کے ساتھ اس کا گھوڑا بھی تھا اور تانگا بھی۔ تینوں نشیب میں الٹے سیدھے پڑے تھے۔ تانگے
دونوں بانس ٹوٹ چکے تھے۔ ایک پہیہ الگ ہو کر مزید نشیب میں چلا گیا تھا۔ بیمار مریل گھوڑا مردہ پڑا
صادق علی بھی اس کے قریب موجود تھا۔ بے پناہ سردی کے سبب اس کی لاش بھی اکڑ چکی تھی۔ اس کا سر گھو
کے شانے پر تھا اور نچلا دھڑ کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ گرتے ہوئے غالباً صادق علی کا سر درخت سے ٹکرایا تھا۔
کے نتھنوں سے خون کی دو باریک دھاریں نکل کر اس کی سفید داڑھی میں کہیں گم ہو گئیں تھیں۔ صادق
آنکھیں نیم وا تھیں۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں توفیق عرف مٹھو کو محسوس ہوا کہ صادق علی کوئی
سہانا کوئی بہت حسین منظر دیکھ رہا ہے۔ ایسا منظر جس کا سحر موت کی تختی بھی نہیں توڑ سکی۔

☆